افسانہ نمبر

نقوش

Aurang Zeb Qasmi,
Mardan, Katlang, Qasmi.
Senior Subject Specialist
GHSS Zaimdara Dir.

قیمت فی کاپی ع؍

افسانہ نمبر

جنوری، فروری سنہ ۴۹ء

ملاحظات

افسانہ نمبر آپ کے سامنے ہے اور اگر آپ نے شروع سے آخیر تک اسکے پڑھنے کی تکلیف گوارا کرلی ہے، تو آپ کو غالباً اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ فسانہ نگاری کا کوئی اسکول اور کوئی رنگ ایسا نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو —— فرائڈی اسکول کی نیابت بیشک آپ کو نظر آئے گی اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ نگار جس وقت وجود میں آیا، یہ اسکول موجود نہ تھا اور جب یہ اسکول وجود میں آیا، تو نگار میں فسانوں کی اشاعت بہت کم کردی گئی۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ اس وقت بھی جب فسانہ نگاری میں کوئی اپچ پیدا نہ ہوئی تھی، نگار میں ایسے ایسے افسانے شایع ہوتے رہے جو اپنی ٹکنک، پلاٹ اور طرزِ بیان کے لحاظ سے بالکل نئے تھے اور جن پر عہدِ حاضر کے ترقی یافتہ رنگ کی بنیاد قایم ہے۔

شاید ہی کوئی رسالہ ایسا ہوگا جس نے اس وقت تک متعدد فسانہ نمبر شایع نہ کئے ہوں، لیکن ٹھیک اُس وقت جبکہ ملک کے رسایل و جرائد ادبِ لطیف کے اس خاص صنف کی طرف متوجہ تھے، نگار اپنی مخصوص اشاعتوں سے ٹھوس ادبی خدمات انجام دے رہا تھا، لیکن اب کہ افسانہ نمبروں میں کچھ کمی پیدا ہو چلی ہے، نگار نے یہ محسوس کرکے کہ اُس کی اس مخصوص خدمت کو لوگ فراموش نہ کردیں، ایک افسانہ نمبر شایع کرنا بھی ضروری سمجھا تاکہ ہمارے نقاد جس وقت اُردو افسانہ نگاری پر اظہار خیال کریں تو پچھلے ۳۰ سال میں نگار نے فنِ افسانہ نگاری کی جو خدمت انجام دی ہے وہ اُن سے پوشیدہ نہ رہے۔

نیاز

بیوی کی امانت

سعید اپنے کمرے میں بیہوش پڑا تھا، اس طرح، جس طرح کوئی برسوں کا بیمار، زندگی کی آخری ساعتوں میں بےحس و حرکت ہو جاتا ہے۔ تین دن سے اس کی یہی حالت تھی، یہ تین دن، تین سال بلکہ تین صدیاں ہو گئی تھیں جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں اور اب اس کی زندگی صرف ایک آخری جھٹکے کا انتظار کر رہی تھی، جو اس تمام کشمکش کو ختم کر دے۔

اُس سعید میں جو آج سے صرف تین روز پہلے اس مکان میں داخل ہوا اور اُس سعید میں جو اس وقت یوں چارپائی پر پڑے پڑے موت کا انتظار کر رہا ہے، کتنا فرق تھا۔ تین روز کی بیماری نے (حالانکہ کوئی ایسی بیماری نہ تھی، ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا دل و دماغ کسی ناگہانی صدمہ کے فوری اثر سے متاثر ہو گیا تھا) سعید کو خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا۔ آہ، ان علم الابدان کے ماہروں کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ انسان صرف اُن اعضا سے مرکب نہیں ہے جن کے ایک ایک رگ و ریشے سے وہ واقف ہیں، ہاں وہ نہ جان سکتے تھے کہ اس تمام عمارت کی بنیاد حقیقت میں اس نازک اور ناقابلِ فہم ہستی پر قائم ہے، جو روح کے مبہم نام سے موسوم ہے۔

بے شک اس کا جسم بالکل صحیح تھا، اس کے اعضا بالکل تندرست تھے مگر وہ سرچشمہ جس سے انسانی زندگی کو آبِ حیات ملتا ہے سوکھ چکا تھا، وہ حرارت جس سے یہ درخت پھلتا پھولتا ہے، ایک سرد خاموشی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پہلے سعید کی صحت، موت کو دعوتِ مقابلہ دینے کی اہل تھی، آج وہ زندگی سے ڈر رہا تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں کے آئینوں میں امید کی جھلک تھی، آج وہ آئینے یاس کے تاریک بادلوں کی کثافت سے دھندلا گئے تھے۔ پہلے اس کا دل ایک وصالِ منتظر کی آرزو سے متحرک تھا۔ آج اس دل کو ایک ابدی فراق کی سوزش نے ایک خاکستر، بلکہ ایک داغِ ناتمام بنا دیا تھا۔ پہلے وہ ایک پیکرِ حرکت تھا، آج ایک مجسمۂ بےحسی۔ پہلے وہ ایک تموّجِ مضطرب تھا، آج ایک سکونِ منجمد۔ پہلے وہ ایک تمنائے بےقرار تھا، آج ایک حسرتِ دم بخود۔ پہلے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر تھا جب وہ آج سے ساڑھے چار سال پہلے اپنی شادی کے صرف ایک مہینہ بعد انگلستان جانے کے لئے اپنی بیوی سے رخصت ہو رہا تھا۔ آج اس کی آنکھیں صرف اس منظر کو دیکھ سکتی تھیں، جب اس نے اپنی منتظر اور پُر امید بیوی کے

فرحت و مسرت کی جگہ، اس کی تازہ موت کا ماتم سُنا تھا۔ پہلے وہ ان امیدوں، ان انتظاروں کو اُن کے سامنے چاہو لے کے گُدگدا کر جگا رہا تھا، جن کو اس نے ہزاروں تسلیوں سے تھپکا تھپکا کر سُلا دیا تھا، آج وہ اس مایوسی اور ناکامی سے جس نے اس امیدوں سے بھرے ہوئے انتظار، اس انتظاروں سے بھری ہوئی امید کو خودکشی کرنے پر آمادہ کیا تھا، ڈر ڈر کر غافل ہونا چاہتا تھا۔

ساڑھے چار سال گزرے، سعید بہت سی تمناؤں، بہت سے ارمانوں کو امیدِ مستقبل سے وابستہ کر کے، ایک پیاری چاہنے والی عورت کو ایک قابل برسرِکار شوہر کی بیوی ہونے کے فخر و ناز سے سرشار کرتے، اعلیٰ تعلیم کو جسے اس نے ہندوستانی مدارس کے انتہائی مدارج تک حاصل کر لیا تھا، پایۂ تکمیل تک پہونچانے اور انگلستان کی اُس کاغذی سند کو قابو میں لانے کی غرض سے جس کے بغیر ہر قابلیت ہر لیاقت، جہالت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی، ولایت جانے کو طیار ہو گیا تھا۔ چار مکمل سال اس نے انگلستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں کس طرح گزارے۔ یہ اس کی نیند سے بیزار راتوں، دیوانگی شوق سے بیقرار دنوں پر خوب روشن تھا، وہ واپس آیا، انتظار اور ذوق کے ساڑھے چار سال بسر کر کے، اپنی تعلیم کو پورا کر کے، اپنی حسرتوں کو مکمل کر کے ———— مگر آہ کب جب وہ جس کے لئے یہ سب مصیبت جھیلی تھی، انتظار سے تنگ آ کر اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھی، امید کے دھوکوں سے نجات پا کر ایک ابدی مایوسی کی آغوش میں بیہوش ہو چکی تھی، کاش کہ اس کا جہاز صرف ایک دن پہلے پہونچ سکتا اور وہ اس مرنے والی کو اپنی آمد کے تار کی درستی کا یقین دلا سکتا۔ آہ اس زبان سے جو اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی صرف ایک لفظ سن سکتا جس کو منہ سے نکالنے کے لئے شاید اس کو موت سے وہ جنگ کرنا پڑی تھی جو نزع کی جانکنی سے زیادہ مہیب، روح فرسا، زیادہ صبر آزما تھی۔ جب یہ خیال اس کے دماغ کی آنکھوں کے سامنے آتا تو دنیا اس کے لئے تاریک ہو جاتی۔ وہ چار سال کی محنتِ شاقہ جو ایک تجربۂ مجسم تھی ایک ذلیل بے حجاب بن جاتی، وہ کمالِ علم اس کو ایک زندہ ناکامی بن کر نظر آتا اور وہ اس وقت کو بددعائیں دیتا، جب اس نے ایک مجبورِ آرزو، پُر ارمان، پُر حسرت دلہن کو ایک آنے والی زندگی کی مسرتوں سے دھوکا دیا تھا، اس نے خوفِ فراق سے سہمے ہوئے دل کو امیدِ وصال سے تسلی دی تھی، ایک سامنے آئی ہوئی حقیقت کو اپنی نظر و ضمیر ان سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں چلا اٹھتا "میں جاہل رہتا، نامکمل رہتا، مگر کاش کم از کم اپنی عمر کے یہ ساڑھے چار سال ان امیدوں، ارمانوں کے نذر کر دیتا، جن کو ایک آرزوؤں کے آبِ حیات سے پلی ہوئی جوانی میرے آغوش میں بسر کرنا چاہتی تھی" اور جب اس خیال کی پیچیدگی کو اس کا ناتواں و زار جسم برداشت نہ کر سکتا تو وہ کانپتا اس طرح جس طرح بید کے درخت کی شاخیں کسی تند و تیز ہوا کے تھپیڑوں سے لرز اٹھتی ہیں، اس وقت اس کی آنکھوں کی پتلیاں اپنے حلقوں میں ایک پارۂ سیماب کی طرح ادھر اُدھر جھلکتیں اور اس کو جسے وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہیں نہ پا کر قطرۂ آب کی طرح ساکن، منجمد اور خاموش ہو جاتیں۔ اسکی

کو سطح سے بند کئے ہوئے لبوں سے ایک آہ نکلی ہو گویا اس کی روح کا ایک ٹکڑا تھا کہ جسمانی زنجیروں کو توڑ کر نکل گیا اب طبیبوں کے دماغ تھک گئے، دوائیں بے اثر ثابت ہو گئیں، عزیز و اقارب، مایوس ہو گئے، ایک بوڑھے ڈاکٹر نے پہلے نبض پر ہاتھ رکھا، پھر ایک آلہ سے دل کی حرکت کو ٹٹولنا چاہا اور پھر اپنی نظروں کو عینک کے اوپر حلقوں سے بلند کر کے سر کو ایک مایوس جنبش دی۔ کمرے میں سناٹا تھا، سب کے سر جھکے ہوئے تھے، سب کی بیقراری ایک آخری تسکین کو تلاش کر رہی تھی، بوڑھی انا جو سعید کی بچی کو ایک عورت کی زندہ وراثت کو ایک بیوی کی سب سے قیمتی امانت کو اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی، اٹھی سعید کے پلنگ کے پاس آئی اور اس معصوم بچی کو جو اس عجیب منظر سے اس قدر ہراساں ہو چکی تھی کہ کھل کے رو بھی نہ سکتی تھی، زانو پر بٹھا کر پکار پکار کے کہنے لگی۔ "یہ ہیں تمہارے ابا جانی، بلاؤ نا، اپنے ابا کو پیار تو کر دو" وہ اتنا ہی کہہ سکی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے، لڑکی نے اس طرح جس طرح ایک رکا ہوا طوفان دفعتاً امڈ آتا ہے، اپنی معمولی آواز سے بہت زیادہ زور سے پکارا۔ "ابا، ابا جانی" یہ وہ الفاظ تھے جو اس نے اپنی ماں کی زبان سے سیکھے تھے یہ وہ الفاظ تھے جن سے پیار کرنے کی عادت اس نے اپنی ماں کے دودھ کے ایک ایک قطرے میں پی تھی، یہ وہ الفاظ تھے، جن کو ان کے مدعا کو سمجھے ان کے مخاطب کو دیکھے بغیر وہ اس وقت سے جب سے اس نے باتیں کرنا سیکھی تھیں، ہزاروں بار دہرا چکی تھی۔

یہ ایک معصوم دل کے اعماق سے نکلی ہوئی آواز کیا تھی کہ وہ روح جو رخصت ہو چکی تھی تڑپ کر واپس لوٹی۔ سعید کا جسم ایک مہیب زلزلہ سے مرتعش نظر آیا، جس کو دیکھنے والوں نے روح اور جسم کی آخری جنگ موت پر غالب آنے کے لئے زندگی کی آخری جدوجہد بیماری کو زائل کرنے کے لئے قوتوں کی آخری کشمکش تصور کیا، یہ ایک حرکت تھی جو دل، دماغ اور آنکھوں میں یکساں محسوس ہوئی، سعید کی آنکھیں اس طرح کھلیں جس طرح کوئی دردناک اور جانکاہ خواب کو دیکھ کر بیدار ہو رہا ہو، سعید کی پیشانی اس طرح پر چیں در پرشکن ہوئی جس طرح کوئی کسی بھولے ہوئے واقعے کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے، سعید کے ہاتھوں میں تشنج پیدا ہوا جو کسی خوفناک اور زبردست دشمن کو مغلوب کر لینے کے بعد ایک کمزور فاتح کے جوش انتقام سے ہوتا ہے، پھر یہ طوفان تھم گیا، یہ زلزلہ آہستہ آہستہ ایک پُر امن سکون میں تبدیل ہو گیا اور باپ نے بہت آہستہ مگر اس آہستگی میں بلا کی ساعت نمایاں تھی، اپنی گردن بچی کی طرف پھیری، جو جواب کے انتظار میں حیران کھڑی تھی۔ اور پھر اپنی بجھی ہوئی نظروں سے جس میں اسکی رہی سہی زندگی کی تمام روح مرکوز ہو گئی تھی اس کو دیکھا، جس کو وہ اس سے پہلے اس مادی پیکر میں نہ دیکھ سکا تھا انا نے اس امید افزا تبدیلی سے حوصلہ پا کر اور اپنے علاج کو طبیبوں کے علاج سے زیادہ موثر دیکھ کر بچی کو باپ کے پہلو میں لٹا دیا، وہ بے حس اور ناتواں بازو جو کسی قسم کی حرکت کے ناقابل معلوم ہوتے تھے، اپنی ہی گوشت و پوست کے ایک ٹکڑے کو اپنے مس کے لئے بیقرار محسوس کر کے اٹھے اور گرد لپٹ گئے، وہ روح بالکل مایوسیوں سے گھبرا کر جسم سے [illegible] اپنے ہی ایک زندہ اور متحرک حصہ کو دوبارہ قرب سے بیتاب دیکھ کر [illegible] اور اس حیات و ممات کی کشمکش [illegible] آنکھوں سے ایک سیل اشک جاری تھا جب اس کا جسم [illegible] سعید کی آواز [illegible] انتہائی ناتوانی کے باوجود ایک آخری عزم [illegible] میں تیرے لئے زندہ رہوں گا [illegible]

حکیم محمد مجیب [illegible]

پھولوں کی پیام رسانی

صبح کی مرتعش گلابی روشنی میں خندہ جبیں لڑکیوں کا ایک جھرمٹ تیر کی طرح قصر شاہی میں باغ کی مرمریں روشوں پر ہلکے پھلکے نازک قدموں کے ساتھ نمودار ہوا، ان کے چہرے صبح کی رنگ انفعال رکھنے والی دیویوں کے مانند حسین و معصوم تھے یہ شاہزادی رقی کی خواصیں تھیں اور جشن بہار منانے کے لئے جو قریب ہی کے ایک جنگل میں منعقد ہونے والا تھا، جا رہی تھیں۔ یہ جشن تقریب بہار کے دیوتا کی پذیرائی کے لئے برپا ہونے والی تھی، جس نے اپنی مسرت آمد کا اعلان ابھی ابھی کیا تھا۔

شاہزادی رقی مسکراتی ہوئی خواصوں کی معیت میں طلائی قفس کے اندر شاہی باغ سے گزر گئی اور سارے چمن کو خاموش چھوڑ گئی۔ جنگل کا راستہ خواصوں کے مسرت انگیز قہقہوں سے گونج رہا تھا اور چڑیاں اس طرح گونگی ہو گئی تھیں گویا وہ اپنے نغموں کو بھی فراموش کر گئی ہیں۔ کہاروں نے جنگل میں پہونچ کر قفس رکھی اور وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے، کیونکہ دوشیزہ لڑکیوں کو بہار کے دیوتا کے سامنے اپنے پھول پیش کرنا تھے اور اس حال میں ان پر کسی مرد کی نگاہ پڑنا سخت ممنوع تھا۔ قرب و جوار کے لوگوں کو اس سے قبل آگاہ کر دیا گیا تھا، اس لئے دور دور تک وہاں کوئی مرد نظر نہ آتا تھا، اور اس وقت جبکہ یہ نوجوان لڑکیاں پھولوں سے لدے ہوئے جنگل میں چاروں طرف آزاد پھر رہی تھیں، سوائے وحشی ہرنوں اور صحرائی پریوں کے کوئی انسانی آنکھ ان کی دیکھنے والی نہ تھی۔

اس مسرور گروہ میں ہر نازنین یہی چاہتی تھی کہ اس کا ہدیہ سب سے بہتر ہو اور بہار کا دیوتا اس کے پیشکش کو زیادہ لطف کے ساتھ قبول کرے۔ اس لئے وہ جنگل میں نہایت حرص کے ساتھ شگفتہ اور تر و تازہ پھولوں کی غارتگری میں مصروف ہو گئیں اور رفتہ رفتہ بہ سلسلہ جستجو وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئیں۔

دفعتاً جب شاہزادی رقی نے اپنے کو تنہا پایا تو وہ چونک پڑی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک پنہاں اضطراب کے ساتھ دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ کچھ فاصلہ پر اس نے لہراتی ہوئی ایک سبز چادر دیکھی، مگر اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ اس کی سہیلی [illegible] کی تھی، یا کسی مائل بہ پرواز صحرائی پری کی۔

شہزادی ابھی اب اپنے حمایت کے سارے پھول چن کر بیٹھی تھی، کیونکہ اس کی سنہری ساڑی کے دامن میں ہنوز

صرف ایک ہی گلدستہ نظر آتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سادہ آنکھیں متجسسانہ انداز سے اِدھر اُدھر کسی کو دیکھ رہی تھیں کہ یکایک گرم دست خوشبو نے جو اس وادی میں کسی مہجور محبت پری کی آہ معلوم ہوتی تھی، اس کے شامہ کو خفیف سی حرکت دی، اس نے چاروں طرف حیرت سے دیکھا، کیونکہ اس خوشبو سے واقف ہونے کے باوجود، وہ اس میں کچھ نئی بات پاتی تھی۔

شہد کی مکھیاں ایک طرف دیوانہ وار ہوا میں خوشی سے گنگناتی جا رہی تھیں، رتن نے اُن کا تعاقب کیا تو معلوم ہوا کہ سوائے آم کے بور کے وہاں اور کچھ نہ تھا، لیکن ایسی خوشبو تو اس نے اس سے قبل کسی بور میں نہیں دیکھی تھی ایسی نکہت تو کسی پھول میں بھی اس نے نہیں سونگھی تھی، اس نے محسوس کیا کہ خود نکہت نے ان پھولوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور شاید بہار کے دیوتا کا یہی حربہ سخت قاتل ہے۔ اب وہ متفکر تھی کہ ان پھولوں کو کیونکر حاصل کرے، کیونکہ ان تک پہونچنا اس کے امکان سے باہر تھا۔

شاہزادی کی ہرن جیسی آنکھیں اپنی ہم جلسہ لڑکیوں کی جستجو میں بیتاب تھیں مگر اسے کوئی نظر نہ آتی تھی، تاہم وہ مدد حاصل کرنے کے لئے بدھر سے آئی تھی اسی طرف واپس چلی گئی لیکن عجیب بات تھی کہ وہی راستہ جسے وہ بار بار طے کر چکی ہے۔ اُسے وہیں پھر بار بار پہونچا دیا کرتا ہے۔ جہاں سے چلی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ درخت ہی بہار کے دیوتا کی طرح جلوۂ شباب سے منور نظر آنے والی رتن کا گرفتار ہو گیا ہے اور اپنے غیر مرئی ہاتھوں سے بار بار اسے اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔

آخرکار شاہزادی نے مایوس ہو کر درخت کے نیچے اپنے کو گرا دیا، کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کسی کی آواز قدم سن کر چونک پڑی اور متحیر ہو کر اُٹھ بیٹھی، اس نے خیال کیا کہ بہار کا دیوتا اس کے تحائف لینے کے لئے خود آ گیا ہے۔ یا پھر وہ "محبت کا دیوتا" ہے جو بہار کے دیوتا سے کبھی جدا نہیں ہوتا، کیونکہ کسی فانی انسان میں اس قدر حیرت انگیز حسن کبھی نہیں دیکھا گیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ یہ اجنبی کسی دور مقام سے آیا ہے کیونکہ راستہ کی خاک سے اس کا ملبوس اٹا ہوا تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ جنگل کے گل ریز راستہ سے ہو کر آیا ہے، کیونکہ اس کے سیاہ بالوں پر پنکھڑیاں ابھی بکھری ہوئی تھیں وہ قریب آیا اور بولا "اے خاتون، کیا آپ ازراہ کرم دارالسلطنت تیرپور کا راستہ مجھے بتا سکتی ہیں؟"

رتن نے حیرت سے اس کے چہرہ کو دیکھا اور بولی "میں تو خود گم شدہ اور تھکی ہوئی ہوں، میں یہاں آئی تھی کہ بہار کے دیوتا کے لئے پھول چنوں گی۔ لیکن اب نہ مجھے راستہ ملتا ہے اور نہ میری سہیلیاں۔"

اجنبی ہنسا اور بولا "اے خاتون یہ جگہ آپ کے لئے تو بیشک زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ صحرائی پریاں ایک بار آپ کی معیت کی مسرت حاصل کرنے کے بعد آپ کی جدائی کبھی گوارا نہیں کر سکتیں۔ لیکن مجھ سے وہ کیا چاہ سکتی ہیں، مجھے حیرت ہے؟"

انھوں نے اپنے پیچھے ایک صدائے قہقہہ سنی اور کسی آواز نے کہا کہ "صحرائی پریاں غالباً انسان کی دوسری جنس میں سے بھی اپنا کوئی ساتھی بنانا پسند کر سکتی ہیں۔"

رتن نے شرما کر اُدھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی شریر سہیلی منجلو کا قریب کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے دریافت کیا "آپ کے تحائف کہاں ہیں، ہم اپنے چڑھاوے آپ سے قبل پیش نہیں کر سکتے، پھول مرجھائے جا رہے ہیں۔ لیکن جو دلچسپی آپ کو اس انسان سے ہے وہ بھلا کیوں اس کی اجازت دینے لگی کہ آپ دیوتا کی طرف توجہ فرمائیں۔"

ان چبھتے ہوئے فقروں سے شاہزادی کے چہرہ کا رنگ اور زیادہ گہرا ہو گیا اور اس نے اپنی سہیلی سے مخاطب ہو کر کہا "میں نے وہ پھول تو دیکھ لیا ہے جس کی مجھے ضرورت ہے، لیکن اس کا چننا میرے اختیار سے باہر ہے۔"

اجنبی آگے بڑھا اور بولا "اے خاتون اب مجھ کو معلوم ہو گیا کہ صحرائی پریوں کو میری کیا ضرورت تھی، میں ان پھول فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔"

آم کے درخت نے اپنی دولت اس اجنبی کے قوی بازوؤں کے سامنے پیش کر دی اور ان بیوفا پھولوں نے رتن کے حسین ہاتھوں میں آ جانے کے شوق میں درخت کو خیرباد کہہ دیا۔

اجنبی نوجوان نے کہا کہ "اب میں رخصت ہوتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں جو خدمت مجھ سے یہاں متعلق تھی ختم ہو گئی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل اور قائم نگاہ شہزادی پر ڈالی اور رخصت ہو گیا۔

رتن دیر تک اس راستہ کو دیکھتی رہی جس پر وہ نوجوان جا رہا تھا، جب اس کی سہیلی ہنسی تو شاہزادی ہوش میں آئی۔ چونکہ سہیلی اس کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھی اور زیادہ گستاخ تھی، اس لئے اس نے کہا "اے شاہزادی معلوم ہوتا ہے وہ خوبصورت اجنبی تنہا نہیں گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ اور کوئی چیز بھی چلی گئی ہے۔ اور اس طرح تم نے بہار کے دیوتا کے ساتھ محبت کے دیوتا کو بھی خوش کر دیا ہے۔" ہرچند رتن نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس سے انکار کیا لیکن اس کی آنکھیں اعتراف جرم کر رہی تھیں۔

جب شاہزادی کی پالکی قصر کے اندر پہونچی تو آفتاب اونچا ہو گیا تھا اور نفیریوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کلنگا کا شاہزادہ ارجمام، تیرپور آیا ہے اور یہ باجے اس کے خیر مقدم میں بج رہے ہیں۔ رتن اور منجلو کا میں، تیار و دلشاد ہوا اور شاہزادی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ صبح کو وہ اٹھی تو مسرور تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی کہ کسی نامعلوم طریقے سے کوئی پیام مسرت اُسے پہونچا ہے۔

(۲)

چونکہ بہار کا دیوتا دو ماہ سے زائد زمین پر قیام نہیں کر سکتا اور نوجوان آنکھوں کی تمام التجاؤں اور تمناؤں کے باوجود وہ رخصت ہو جاتا ہے اس لئے تمام نفوس انسانی اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ حتی الوسع اس کی معیت کا ایک لمحہ بھی ضائع

ڈگری۔ اور یہ واقعہ ہے کہ شاہزادی رتی نے اس سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اس سرد موسم کے ہر دن کے ساتھ اس کے چہرہ کا رنگ اور آنکھوں کا نور بڑھتا جاتا تھا گویا وہ ایک خاموش ڈرامہ ایکٹ کر رہی تھی جس میں سرت اس کی ذات ایک نوجوان مرد اور ایک غیر مرئی دیوتا شامل تھا۔

دربار تیرپور کے شاہی مہمان کا قیام طویل ہوتا جا رہا ہے اور اس کے لئے مختلف اسباب پیدا کئے جاتے ہیں شہنشاہ العہد بادشاہ خیال کرتا تھا کہ شائد اس کی پُر خلوص پذیرائی اس قیام کا باعث ہے اور دوسرے لوگ سمجھتے تھے کہ یہاں کے اسباب شکار نے شاہزادہ کو زیادہ قیام کی طرف مائل کر دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک دوسرے ہی قسم کی ... جا رہی تھی، جس کا علم محل کی خواتین اور قصر کے نوجوان محافظ رنجیر کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔

... زمانہ تیزی کے ساتھ چلا آ رہا تھا، نوجوان ہستیاں عبیر و گلال فراہم کرنے میں منہمک تھیں لیکن رنجیر کا دل رفتہ رفتہ رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا جو سرخ تھا نہ سبز بلکہ وہ طوفان کی طرح سیاہ و تاریک تھا یا وحشی ... کی طرح گہرا سرخ۔ شاہزادہ اور شاہزادی دونوں اگر شتے تھے اور جو پُر مسرت روشنی ان کی آنکھوں میں نمودار ہوتی تھی وہ رنجیر کے دل میں آگ لگا دیتی تھی۔ اور اس کی موت زدہ آنکھیں چاروں طرف موت ہی موت دیکھتی تھیں۔

ہولی کا دن آ پہونچا، قصر شاہی کا باغ سبز سے سرخ ہو گیا اور ہوا عبیر و گلال کی وجہ سے رنگین۔ ہر شخص فرط مسرت سے بیتاب نظر آتا تھا، عیش و نشاط باغ کے ایک ایک ذرہ سے ہویدا تھا لیکن اس کے ساتھ وہاں دو نوجوان دل ایسے بھی تھے جو مغموم ہو رہے تھے، دو آنکھیں ایسی بھی تھیں جو خیال مفارقت سے رو رہی تھیں۔ کیونکہ اب تیرپور کے مہمان کے رخصت ہونے کا زمانہ آ رہا تھا۔ جدا ہوتے وقت ارندم کے رتی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور اس کی اشکبار آنکھوں کو دیکھا۔ "اے پیاری! میں اپنے ساتھ جو نشانی لئے جاتا ہوں وہ ان آنسوؤں کی یاد ہے اور یہی جلد واپس لائے گی"

اس نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "کب؟" ارندم نے جواب دیا "جب پورنماشی کا چاند پانچ دفعہ آ کر گزر جائیگا تم مجھے پھر دیکھو گی اور اس درمیان میں ہر چودھویں رات کو ایک پھول میرا پیام لیکر تمہارے پاس آیا کرے گا اور تم اس کو دیکھ کر جان لیا کرو گی کہ میں مفارقت کی گھڑیاں گن رہا ہوں، چونکہ پھولوں کے دیوتا ہی کے ذریعہ سے ہماری تمہاری ملاقات ہوئی ہے اس لئے میں اس کی مخلوق ہی میں سے اپنا پیامبر بنانا پسند کرتا ہوں۔ ہاں اگر مقررہ دن پر میرا پیامبر نہ آئے تو تم سمجھ لینا کہ میں وہاں پہونچ گیا ہوں، جہاں سے کوئی پیامبر نہیں آ سکتا"

رنجیر جدائی کے اس منظر کو دیکھ کر سیاہ سانپ کی طرح پھنکار مار رہا تھا اور چاندنی رات بھی اُسے بالکل تاریک نظر آ رہی تھی مگر وہ سوائے صبر و انتظار کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ اپنا حملہ کرنے کے لئے سیاہ راتوں کا منتظر تھا۔

پورا چاند رخصت ہو گیا اور اس کے ساتھ اکلاپہ خاندان کا شاہزادہ بھی۔ اب شاہزادی رتی اس پرندہ کی طرح جو ایام گرما کی آمد پر بے چین ہو جاتی ہے، مضطرب تھی اور رنجیر چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنی محبت اس کے دل میں پیدا کر سکے لیکن

اُسے کامیابی حاصل نہ ہوتی تھی۔

دوسرے مہینہ کا پورا چاند طلوع ہوا اور رتی اپنی حریص نگاہوں سے بالاخانہ پر کھڑی ہو کر اس سیلاب نور کا تماشہ دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے محبوب کا پیامبر ابتک کیوں نہیں آیا، اس کی سہیلیاں ہنستی ہوئی اس کے پاس آتی تھیں لیکن کوئی جواب نہ پاکر واپس چلی جاتی تھیں، اس وقت سارا تیرپور اس کی نگاہوں کے سامنے ایک تصور نظر آ رہا تھا، وہ اپنے سامنے دروازۂ باغ پر ایک سنتری کو ادھر سے اُدھر ٹہلتا ہوا دیکھ رہی تھی جو چاندنی میں ایک دھبہ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ رات بڑھ رہی تھی اور تمام عالم، سکوت میں غرق ہوتا جا رہا تھا، لیکن پیامبر کا پتہ ابتک کہیں نہ تھا۔

سنتری خاموشی کے ساتھ سڑک پر گشت لگا کر اس بالاخانہ کے نیچے آیا، جہاں شاہزادی کھڑی تھی اور اسی وقت ایک نرم لمس اس نے اپنے پاؤں میں محسوس کیا۔ ایک خفیف سی کپکپی کے ساتھ شہزادی جھکی اور اس نے اشوکا کے پھولوں کا ایک گچھا جو خون کی طرح سرخ تھا، زمین سے اُٹھا لیا۔ اس نے سنتری کو دیکھا اور سنتری نے اس کو لیکن شاہزادی کو یہ معلوم کر کے کس قدر حیرت ہوئی کہ سنتری بالکل کوئی اجنبی شخص ہے۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ارندم کا یہ جری ملازم کیونکر اس قدر دلیری سے باغ کے اندر آ گیا کہ وہ غائب ہو گیا اور رتی اپنے کمرہ کے اندر چلی گئی۔

رنجیر کے قاصد شاہزادی کے پاس آتے اور ناکام واپس جاتے کیونکہ جب تک ارندم کے قاصد آزادی سے رتی کے پاس آتے تھے، اس وقت تک رنجیر کے لئے کوئی امید نہ تھی۔ اس لئے وہ نہایت حاسدانہ طریقہ سے خود باغ اور محل قصر کی حفاظت کرتا تھا کہ ارندم کا کوئی قاصد اس کے پاس تک نہ پہونچ سکے۔

گرمی کے پہلے مہینے کا پورا چاند طلوع ہوا اور رتی مندر میں پھول چڑھانے گئی اور وہاں سے فوراً ہی واپس آ گئی کہ کہیں پیامبر آ کر چلا نہ جائے۔ اس وقت بالاخانہ کے نیچے چار سنتری پہرہ دے رہے تھے جن کے چہرے سیاہ و خونخوار تھے۔ وہ تنہا کھڑی ہوئی اپنے حُسن سے چاندنی کی رونق کو بڑھا رہی تھی، لیکن اس کے دل میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان موانع کے سامنے قاصد کیونکر آ سکے گا۔ چاند مغرب کی طرف جھکا اور رتی مایوس ہو کر لوٹی مگر اسی وقت اس نے سفید چادر کے اندر ایک صورت لپٹی ہوئی دیکھی، جو شاہزادی کو دیکھتے ہی آگے بڑھی اور ایک گلدستہ سامنے رکھ دیا یہ گلدستہ اس کی چادر کی طرح سفید تھا۔ اس نے اپنا نقاب اُٹھا دیا اور شاہزادی کو معلوم ہو گیا کہ یہ وہی سنتری ہے جو اس سے قبل نظر آیا تھا۔ اس کے بعد وہ سنتری غائب ہو گیا۔ رنجیر ایک گرسنہ شیر کی طرح بیتاب تھا لیکن ایک دیوتا کا مقابلہ اس کے لئے آسان نہ تھا۔ پیامبر اسی طرح آتے رہے اور رنجیر اسی طرح آتشِ حسد سے جلتا رہا۔

گرمی کا دوسرا مہینہ آیا اور چودھویں رات کو گھونگھٹ کے اندر چمپا کا ایک سنہرا ہار اُسے تیرتا ہوا ملا اس کے بعد بارش کا موسم آیا اور اپنے کنکی کے پھول اُسے ملے۔ آخر کار صرف ایک مہینہ رتی اور اس کے محبوب کے درمیان میں حائل

کا باقی رہ گیا۔ مقررہ رات آئی، لیکن چاند بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی بجلی کی چمک اس سیاہی کو دور کر دیتی تھی۔

رتبیر اپنی برہنہ تلوار لئے ہوئے اپنے آدمیوں کے درمیان بیتابانہ دوڑنے لگا اور کہنے لگا:

"یاد رکھو وہ وقت جب ادتم کا رتھ باغ کے اندر آجائے گا تمہارا آخری وقت ہوگا۔ کیا تم نے یہ دیکھا تھا آخرکار تم نے شاہزادہ کے پوشیدہ قاصدوں کو پکڑ لیا ہے پھر کیونکر شاہزادی تک آدھی رات کے وقت وہ قاصد پہونچ گیا؟"

یہ کہکر رتبیر نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو سب نے دیکھا کہ سپاہیوں کے درمیان ادتم کا بہادر ملازم بیٹھا ہوا ہے اس کا بدن زخموں سے چور چور ہے اور خشک پھولوں کا گلدستہ اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس دفعہ پھولوں کو شاہزادی تک نہ پہونچا سکا تھا اور گرفتار ہوگیا تھا۔ لیکن جب رتبیر شاہی باغ کی طرف دوڑا ہوا گیا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ شاہزادی کی خوابگاہ کے قریب پھولوں سے لدی ہوئی بکائن کی شاخ طوفانی ہوا کی وجہ سے جدا ہوکر کھڑکی کے دروازہ سے ٹکرائی اور اپنے سارے پھول کمرہ کے اندر منتشر کر دئے، پھولوں نے اپنا پیام اس مرتبہ بھی پہونچا دیا اور عین اس وقت جبکہ شاہزادی اُن چھوٹے چھوٹے پھولوں کو فرش سے چن رہی تھی، قرنا نے کسی شاہی مہمان کی آمد کی خبر دی اور باغ کے دروازے اس کے لئے کھل گئے

(ماخوذ) مظفر علی خاں

فریب حسن

(ایک میخوار کی حیات معاشقہ)

سیہ کار، سرمست، دائم الخمر، ان تمام توقعات سے عاری، جو ہیئت اجتماعی ایک فرد سے وابستہ رکھتی ہے، تمام مراعات سے بے پروا، تمام پابندیوں سے بے نیاز، میری زندگی ایک خود فراموشی کی زندگی ہے، دیوانہ! مجھے لوگ اسی نام سے پکارتے ہیں ———— مگر انھیں پکارنے دو، بیوقوفوں کو سمجھ نہیں، سادہ لوح ہیں، اپنے خیالات کو راستی پر مبنی سمجھتے ہیں، اپنے منافق سینوں پر مجھ سے زیادہ عظیم گناہوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے، نیکی کی تلقین بہت شد و مد سے کرتے پھرتے ہیں، سطحی نظریں رکھنے والے، اجتماع کی بندشوں کے قائل، انھیں کیا حق ہے، کہ مجھے کچھ کہہ سکیں، ایک قیدی، آزاد شخص کے جذبات کو کیا سمجھ سکتا ہے؟

آزاد، تمام قیود سے آزاد! یہ زندگی ہے، ایک سرگشتہ کشتی کی طرح جو طوفانی امواج کے تھپیڑوں میں آکر ریزہ ریزہ ہوگئی ہو اور جوش و خروش کے بعد، سمندر کے ساکن پانی پر ہلکورے لے رہی ہو، اسی طرح، نہ رہزنی کا خوف نہ چوری کا ڈر، دامن ہی نہ ہو، تو خار اُلجھے گا کہاں؟ تمام جھگڑوں سے آزاد ہوکر کائنات کی لغزشوں پر قہقہے لگانے والا، ذرا ان فلاسفروں کو دیکھنا! مادہ اور روح کی ناقابل فہم الجھنوں میں گرفتار، ہر شے کی تخلیق کی نسبت نئے نئے وضع کرنے والے، باطنی کشف اور اسرار و دقایق کی گتھیوں کو سلجھانے کے مدعی، ممکن کو ممکن اور ناممکن کو ممکن ثابت کر دینے والے، بیچارے سیدھے بھولے انسانوں کو اپنے مرعوب کن استدلالات سے واقفیت سے کوسوں دور، باتوں کو منوانے والے، کائنات کی نسبت کسی نتیجے پر پہونچے ہی نہیں، دین و اعتقاد کا خوشگوار زمانہ گزر گیا، جب جہالت اور سادہ لوحی کو فریب دیا جاتا تھا، جب معمولی عقل کا آدمی بھی مافوق الفطرت، کارناموں پر یقین رکھتا تھا، اب واقعیت اور ظاہری دنیا کا دور دورہ ہے، دماغ تھک گئے، عقلیں دنگ رہ گئیں، نظام عالم اس قدر وسیع ہے کہ تمام فلاسفروں کی عمر کا مجموعہ بھی کسی اطمینان بخش، واقعہ کا شناسا نہیں۔

دنیا، جو اپنی روحانیت کے لئے مشہور آفاق ہے، اور جس کا شاعرانہ تصوف، تمام دنیا کو انگشت بدنداں کر دیتا ہے، ایسے لوگوں کی بھی جائے پیدائش ہے، جو اس نکتے کو سمجھ تو چکے تھے جو صرف معدودے چندہی خوش نصیب ہستیوں کے

حصے میں آآپ ہے، مگر خوف کے مارے کچھ نہ سکتے تھے، اس کے دو مشہور دوامِ الخمر شاعروں کو بھی لے لو، ایک نے تو عشرت پرستی کی تعلیم دی، اور اس میں اس قدر افراط سے کام لیا کہ معاملہ یہاں تک آخر ختم ہو گیا، کہ شراب وہ آتشِ سیال، جس کا ایک جرعہ دل و دماغ میں برقی رو دوڑا دیتا ہے، تمام دنیاوی خوشیوں کا مخرج و منبع ہے، اور اسی پر زیست کو ہنسی میں کاٹنے کا انحصار ہے، اگرچہ نکتہ چین اصحاب کی خاطر اپنے فلسفے میں آخر کار بادلِ ناخواستہ ذرا سی ترمیم کرنا پڑی تھی یعنی "گر گر بھور دو کم خور و پنہاں مے خور" پھر بھی وہ بات جو اس کے فلسفۂ تعیش کی روح رواں تھی لا اعتدال کے پردوں میں بھی نہیں چھپ سکتی دوسرے صاحب جن کی ہستی کی نسبت بہت معرکۃ الآرا مباحث کے باوجود بھی فیصلہ نہ ہو سکا، کہ وہ خمیرۂ شیراز سے ماخوذ ہے یا جامِ معرفت سے، دنیا کے بکھیڑوں اور دھندوں سے گھبرا گئے، انھوں نے تعلیم دی کہ سیل حوادث ہمیں پر کاہ کی طرح گردش میں رکھتا ہے تقدیر اور تدبیر کی مخاصمت باہمی سراسر پریشانی کا باعث ہے، ہمارا انجام و آغاز غیر یقینی ہے، خبر نہیں کہ ہم کہاں سے آئیں گے اور کہاں جائیں گے خارستانِ دہر کو گلستان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان اسرار کو چھیڑا ہی نہ جائے، مسند فقر ہو اور ایک جام سفالین جو اپنی عشرت پروری میں جامِ جم کو بھی مات کرتا ہو، گوشۂ چمن ہو، فراغت نصیب ہو اور کسی حور پیکر سے قرب، اگر اس کے بعد بھی انسان کو کسی اور شے کی خواہش رہے تو سمجھ لے کہ انھیں دنیائے فانی میں اس کی آرزو بر آنی محال ہے، یہی شخص بیتاب ہو کر کہہ گیا ہے اور کیا خوب کہہ گیا ہے کہ :

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ان تمام باتوں کے کہنے کے بعد کیا اسباب کے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ مجرم کا کوئی گناہ نہیں ہوتا، اور اسکو جبر و قدر کے مسئلہ سے بے نیاز ہو کر محض عدل و انصاف کے قوانین کی بنا پر سزا دینا، ایک اخلاقی عیب ہے، وہ تو جرم کے اقدام پر مجبور تھا، جرم اس کی جبلت اور سرشت میں داخل تھا اگر کوئی ہستی فطرت انسانی کی تخلیق کا باعث ہے، تو اسی کو قصور وار ٹھیراؤ، ایک آلہ و ساطت کا کیا قصور ہے کہ تلوار کاٹنے کے لئے اور آگ جلانے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔

(۲)

کل ایک کباڑی کی دوکان پر ایک شخص کھڑا چند کتابیں خرید رہا تھا، میں بھی کھڑا ہو گیا، اتفاقاً میری نظر ایک کتاب پر جا پڑی جس کا دیدہ زیب حسن طباعت، جاذب نظر ہونے کے علاوہ بہت کچھ معنوی خوبی کا بھی مدعی معلوم ہوتا تھا، دیکھا تو معلوم ہوا کسی نو خیز مصنف کا ناول ہے، عبارت بہت شگفتہ، فقرے چبھتے، خیالات پاکیزہ، طرز ادا میں جدت، لکھنے میں ایک نیا اسلوب، وہی حسن و عشق کا پرانا دکھڑا، جو اب اپنی قدامت کی وجہ سے اجیرن ہو گیا ہے، سست، احمقانہ، اور واقعیت سے کوسوں دور، واہیات قصے، وہی پہلے پہل کی شناسائی ایک طرف سے کچھ اجتناب، تو دوسری طرف سے اصرار رفتہ رفتہ جذب صادق کا اثر ہونا، دونوں طرف محبت کی آگ کا بھڑکنا، آخر کار ملاقات کی سبیل، رقیب کی شاطرانہ چالیں

احساس کی مدد انداز کا صورت کی متلون طبیعت کی کارفرمائیاں آخر انجام، حرماں و ناکامی، ہیروئین کا بر ضا و رغبت، کسی اور سے بیاہ کر لینا، بیچارے عاشق کے جذبات کو خوب نمایاں کیا گیا تھا، اور آخر میں آکر تو الفاظ سے اس قدر حسرت و اندوہ ٹپکتا تھا کہ آپ بیتی کا شبہ ہونے لگتا تھا، جا بجا محاورات ضرب الامثال، غرضکہ سب کچھ تھا، دریا کو کوزے میں بند کر دکھایا گیا تھا، ہاں آخری صفحہ پر یہ شعر بھی مندرج تھا :

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

یہ شعر پڑھ کر مجھے بہت ہنسی آئی، کہتا ہے "کسی قابل نہیں رہا" کمبخت کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھا، ایک موقعہ ملا تھا اسے ہاتھ سے کھو دیا، وفا کا یہ عالم کہ معشوق کی صریح بے وفائی کے باوجود بھی اسی کا دم بھرتے رہے اپنی دھن میں مگن رہے، اتنی صلاحیت بھی کہاں تھی کہ اس واقعہ سے نتائج اخذ کرتے، ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اپنے جذبات کا تجزیہ کرتے، تاکہ انھیں معلوم ہوتا کہ وہ بہیمیت کا نام عشق اور حماقت کا نام وفا رکھے بیٹھے ہیں۔

مجھے اس قسم کی کتابیں پڑھکر حیرت سی ہوتی ہے "لفظ وفا" کو اگر کوئی "شرمندۂ معنی" کرنا چاہتا ہے تو مجھے اسکی حرکت پر مسرت تعجب ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک افسوس کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، عشق کا تو ایسے افراد میں وجود ہی نہیں مل سکتا، باتیں ہی باتیں ہیں، اظہار پاکبازی اور ذوق نظر سے یوس و کنار کا آغاز مقصود ہے اور بس، بیچاری سادہ اور دوشیزہ لڑکیوں کو پھسلانے کے لئے یہ تمام جال بچھائے جاتے ہیں، یہ تمام ترکیبیں کی جاتی ہیں، بری، ان کتابوں میں روح رواں کی طرح جاری و ساری ہے، یہ تمام بد قماش اشخاص کی ان کوششوں کی فہرست ہیں، جو انھوں نے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے میں برتیں، یا ان نسوانی شخصیتوں کا ایک مفصل و مشرح تذکرہ ہے، جو اپنے حسن عالم آشوب و عشق کی آمیزش کے ساتھ وفا سے متصف ظاہر کرتی تھیں، اور جن کا کام صرف یہی تھا کہ نوجوان، بوشیلے، اشخاص کی زندگیاں تباہ کیجائیں۔

(۳)

گھر آیا تو گویا سر پر ایک دھن سی سوار ہو گئی، اپنی حیات معاشقہ لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا، میری حیات معاشقہ!! پہلے میں اس معاملہ پر بہت کچھ سوچتا رہا ——— آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا، تو عجیب بے ڈول سی صورت نظر آئی، منحوس شکل بکھرے ہوئے بال، پچکی بیٹھی آنکھیں، چیتھڑوں میں ملبوس، ایک بوسیدہ سے کمرے میں اقامت گزیں، میں نہ رہ سکا، بے اختیار ہنس دیا، زمانے کی دو رنگی بھی عجیب شے ہے، اب کون بھلا آدمی یقین کرے گا کہ میں بھی کسی دوشیزہ کا منظور نظر رہا ہوں۔ میں اپنی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو دیسی ہی ہزاروں دوشیزہ نظر آنے والی لڑکیاں اپنے زرق برق کپڑوں میں ملبوس، میرے سامنے سے گزرتی ہیں، شاندار فٹنوں میں، خوبصورت تانگوں میں، اور ان کے چہرے سے کتنی معصومیت اور سادگی ٹپکتی ہے، گویا بھولے بھالے مجسم تصویر ہیں، مگر اب میں دھوکا نہیں کھاتا، یہ تمام دہی اشیاء میری آنکھوں کے سامنے بے حقیقت ہو جاتی ہیں، گویا کوئی پوشیدہ قدرت مجھے غیر معمولی قوت بینائی بخش دیتی ہے میں انھیں اپنی اصلی رنگ میں دیکھتا ہوں

بدکار، ذلیل، رو سیاہ، بعض کے کچھ بھی لت پت، سراپا لتھڑی ہوئی، تمام دن ڈر ڈر کر، کانپ کانپ کے گناہوں کا
ارتکاب کرتی ہیں اور رات کو اپنی بیہودگی سے گناہوں کا اعتراف کر کے، اپنے دل کے بوجھ کو اور بھی بھاری کر لیتی ہیں۔

دراصل دنیا کی فضا ایسی تنگ ہے، کہ اگر اتنی وسیع آبادی میں اس کا ایک فرد بھی اپنے تمام مقصدوں کی تکمیل
بدرجہ اتم کرے، اپنی چھوٹی سی چھوٹی خواہش کو پورا کرے، تو عالم ایک نشۂ مسرت سے لبریز ہو جائے گا۔ مگر ہر ایک دلاور سے
فرد بھی اپنی تمام آرزوؤں کا خون کر دیتا ہے، اس لئے کہ وہ ان سے ڈرتا ہے، اس کے خیال کے مطابق اخلاقیات کو آدمی کی
زندگی سے ایک گہرا تعلق ہے، حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ مگر ان آرزوؤں کے خون کر دینے سے، روح گناہ کا سرچشمہ قرار
پا جاتی ہے، آزمائش و ابتلا کا پیہم مقابلہ، روح کو سم آلود بنا دیتا ہے اور ہر وقت اس کی خواہش، اقدام جرم کی نسبت محض
اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ اسی خاص شے سے احتراز ایک امر لازمی ہے۔

اس درجہ تک پہونچنے کے بعد ایک معمولی فرد گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، مگر وہ خدا کی درگاہ میں دعا کے وقت اس کا
اعتراف کر کے اپنے فعل کی تمام خوشی، تمام لذت، اور تمام وقعت کو ضائع کر دیتا ہے، اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ
وہ جرم کرے اور پھر خاموشی سے اس کا خمیازہ بھگتے، کہ جرم کا اصلی اور حقیقی لطف تو اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جب اس کی
نسبت یہ یقین پیدا ہونے لگے کہ وہ کبیرہ و عظیم تھا، ایک معمولی فرد اس وقت احساس ذلت و غم سے کانپتا ہے، مگر مجھ جیسے پرانے
گنہگار پر اس وقت ایک فراموش انگیز مسرت طاری ہو جاتی ہے، روح کی تشنہ کامی کو مسرت حواس ظاہری کی لذات سے سیراب
کیا جا سکتا ہے، انھیں خیالات کی وجہ سے دنیا مجھ سے نفرت کرتی ہے، مگر مجھے اس بات کی سر مو پروا نہیں، دنیا کو مجھ سے اتنی
ہی نفرت ہے جتنی مجھ کو دنیا سے۔

(۴)

میری زندگی میں سوا ایک نیم شعوری دیوانہ پن کے اور کچھ باقی نہیں رہا، ان تمام اشیا کو جنھیں ممنوع قرار دیا گیا ہے میرا
پتھر کا دل اور آگ کا دماغ بہ رغبت قبول کرتے ہیں، سحر و طلسم، مجذوبیت، ہمزاد، تمام خوفناک اور خطرناک علوم، میرے حلقۂ
دسترس میں ہیں، ان میں، میں نے اپنی فکر آفریں طبیعت سے، عجیب عجیب اجتہادات سے کام لیا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر
میں ایک میخوار نہ ہوتا تو یقیناً ان تمام علوم میں سے کسی ایک کا مجید فاضل تسلیم کیا جاتا، شاید یہ میری دیوانگی ہو، اور اخلاق کے تمام
خیالات سے متناقض، مگر اخلاق بجائے خود کیا ہے، ترہات کا ایک "ناقابل فہم مجموعہ" جس کے ابتدائی اور ناگزیر اصول بھی اس قدر
متباین اور متناقض ہیں کہ اخلاق کی پناہ "شعریت" اور "افادیت" کے جھگڑے کو دور نہیں جانتا؟ اس کے طریق اس قدر مشکوک اور
عجیب ہیں کہ عقل باور نہیں کرتی۔ بعض نے اپنی طرف سے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا، تو اس کی یہ تعریف کر دی کہ "اپنی ذمہ داری
کا کامل احساس اور یقین" بجا ارشاد ہوا! یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذمہ داری کیا شے ہے اور انسان کے لئے یہ کہاں تک
ضروری ہے، انسان اپنے افعال کا ذمہ دار بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ ایسے ٹیڑھے سوالات ہیں کہ آج تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں

وضع نہیں کیا گیا۔ اپنی عمر کے ایک خاص حصے میں، میرے دماغ میں بھی یہی خیال چکر لگایا کرتے تھے، میں بھی عام لوگوں کی طرح
اخلاق کی بند عقلوں میں اسیر تھا، مگر اب مجھے حقیقت معلوم ہوئی، وہ تمام خیالات اسی طرح اڑ گئے، جیسے سورج کی حرارت
شبنم کو اڑا لیتی ہے، اس کی جگہ مجھے مسرت حقیقی نصیب ہو گئی، اور اس نیرنگ خیال کا باعث کیا ہے؟ وہ آتشیں سیال، جس کا
ایک شرارہ، خرمن ہوش و حواس کو مشتعل کر دینے کی قوت رکھتا ہے، جس کا ایک گھونٹ، ہزاروں بوسہ ہائے اولیں سے
زیادہ خوشگوار ہے، جس کا حقیقی رنگ، لب لعل کی سرخی کو مات کرتا ہے، جس کی تعریف میں شاعروں نے دفتر سیاہ کئے ہیں، اس بات
سے بحث نہیں کہ بعض مستثنیٰ حالتوں میں شیرازی ہے یا معرفت کی غرض صرف مستی سے ہے، وہ دیکھو موجود ہے "یا خیاباں"، میں اسے
غٹ غٹ پیتا ہوں، اور اس عالم میں پہونچ جاتا ہوں، جو مذہب کے تحت ترجیح الاصول کے پابند انسان کو جنت النعیم کی بہترین
خوبیوں میں بھی نصیب نہیں ہو سکتا، مجھے عجیب و غریب نظارے دکھائی دیتے ہیں، میں اور نوجوانوں کی طرح ایسے موقعوں پر ان
حور تمثال، برق پاش نازنینوں کا خیال نہیں کرتا، جن کا جلوہ ماہ و مہر کو شرماتا ہو، جن کا حسن گرد و پیش کا چاند ہو، جن کے
انداز و ادا میں وہ لطافت ہو کہ رقاصۂ فلک بھی رشک کھائے، جن کا خرام ناز، ایک ایک ٹھوکر پر سو سو فتنے جگاتا ہو، جن کے
لبہائے جاں بخش کی مسیحائی کا ادنیٰ سا کرشمہ یہ ہو کہ ان کا شاعر عاشق، مجبوراً سو بار مرے اور ہزار بار جیے، مجھے شاندار عمارت
کے ساز و سامان کے خواب بھی نہیں دکھائی دیتے، اونچی اونچی عمارت، خوبصورت پائیں باغ، خوش نما سنگ مرمر کی بارہ دریاں
نفیس اور دلفریب فوارے، خوش رنگ پھول، بلند بالا درخت، مجھے یہ تمام اشیا ناپسند ہیں، میرا عالم انوکھا عالم ہے، میں
جہنمی چیزیں دیکھتا ہوں، ناری اجسام کا مطالعہ کرتا ہوں، جہنم کے بلند شعلوں کی لپک ہے، عذاب کے فرشتے اپنی مہیب و ہولناک
صورت دکھا رہے ہیں، ہاتھوں میں سانپ اور بچھوؤں کے کوڑے لئے ہوئے، گنہگار "الحذر" پکار رہے ہیں، سڑاک، سڑاک،
ان کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برستے ہیں۔

شیطان کا لشکر ہے، اور ارواح خبیثہ کا اجتماع، دنیا پر دھاوا بولا جا رہا ہے، بڑے زور و شور سے جنگ ہو رہی ہے،
گھوڑوں کے سموں سے میدان کانپ رہا ہے، جھنڈیاں لہرا رہی ہیں، ہزاروں بے سر لاشے، دھڑا دھڑ زمین پر گر رہے ہیں، بگل بج
رہے ہیں، گولیاں اور توپیں اپنا کام بہت تیزی اور تندی سے بجا لا رہی ہیں، ہولناک شور و غل ہو رہا ہے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
یا میں ایک اڑن کھٹولے میں بیٹھا تحت الثریٰ کی جانب غرق ہوا جا رہا ہوں، جس کے راستے میں پردے بالکل سیاہ ہیں، زمین کے قعر
تک پہونچ کر حیرت انگیز مشاہدات دیکھنے میں آتے ہیں، کالی سیاہ صورتیں، آبنوس کے کندے کی طرح سرخ سرخ دیدے نکالے
میری طرف گھورتی ہیں، سرخ، سبز، نیلی، پیلی، سوسنی، کاہی، رنگ کی روشنیاں فضا میں پرواز کرتی پھرتی ہیں، آگ کے شعلے،
حلقوں کی شکل میں ہر ایک شے کے گرد لپٹے ہوئے ہیں، تاریک خاموش مکان، ہیبت خود فراموشی کا دور دورہ ہے، ذرا سی آواز
بھی ایک ہیبت ناک گونج پیدا کرتی ہے، اس عالم ظلال و اشباح عجائب، نمود و غرائب شہود، میں میرا حافظہ غیر معمولی طور پر تیز
ہو جاتا ہے اور میں ان واقعات کو یاد کرنے لگتا ہوں، جن کو عالم ہوش میں ذہن تک لاتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے، خدا کی

کہ موت کے بعد اگر کوئی دوسری زندگی ہے، تو اس میں حافظہ کی قوت نہ ہو، ورنہ ہم تو پیچھے بھی مر جائیں گے۔ اس دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ میرے احساسات فنا ہو گئے، اس آتشیں مادے نے جو میری روح رواں ہے، تمام جسم کے قویٰ کو بیکار کر دیا۔ دل و دماغ تو بالکل مختل ہو گئے، پہلے اُلفت، نفرت، حقارت، رنج وغیرہ، محبت پر ایک جذبہ میرے عضلات پر طاری ہوتا تھا۔ اس شے کے عادی ہونے کے بعد حالت ہی بدل گئی، انعکاسی تموجات معدوم ہو گئے، نظم و ترتیب بگڑ گئی، مالیخولیا سا ہو گیا، میرا جو میری فطرت میں داخل ہو گئی اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں، جب مجھے دنیا کی تباہی تک متاثر نہیں کر سکتی، تو کسی فرد واحد کی بدقسمتی یا شکایت سے مجھے کیا افسوس ہو سکتا ہے۔

(۵)

پھر بھی اس حالت میں صرف ایک خیال باقی ہے، انتقام! ان تمام صدمات کا انتقام جو مجھے ایک عورت کی ذات سے پہونچے، تمام نسوانی نسل سے انتقام، اس کی میں نے صرف ایک صورت سوچی ہے، کہ جہاں تک ہو، عورت کی نسبت تمام حالات پوست کندہ زمانے کے آگے پیش کر دوں، میری اپنی حیات معاشقہ سے ان تمام باتوں کی ابتدا ہوگی، عورت، وہ کمزور اور ناتواں ہستی جسے فطرت نے بدترین ہتھیار بخشے ہیں کہ وہ انھیں جس طرح چاہے اور جس پر چاہے، اپنی پوری قوت کے ساتھ استعمال کرے، ان کے مقابلے میں مرد کی تمام مدافعانہ کوششیں بے سود ہیں، عورت کے جذبات کا سیلاب جب امنڈتا ہے تو ہر ایک شے کو اپنے ساتھ بہا لیجاتا ہے، اگر اس کی کارگزاریاں فطرت نے خوشنما چہرے کو ... نہ کرتی رہتیں، تو خدا جانے اس عالم اسباب کو کس قدر ترقی ہوتی۔ شہد کی طرح شیریں اور حلاوت بخش باتوں سے بہلا لینے والی، اپنی آنکھوں کی افسوں سازیوں سے ہمارے کمزور دلوں پر بجلیاں گرانے والی، ہماری سرشت کو سمجھ کر اس سے تا بحد امکان فائدہ اٹھاتی ہے، دنیا میں جتنے جنگ ہوئے انھیں کی ذات سے ہوئے اور نہیں ان باتوں سے کچھ شکایت بھی نہیں کہ ان کے تسخیر کرنے کے لئے کھلم کھلا جنگ باعث عار نہیں، غضب تو یہ ہے کہ ہر ایک جگہ یہ اپنی وجہ سے آگ سلگائی رہتی ہے اور بیچارہ مرد پوشیدہ جلتا رہتا ہے اور آخر کار اس طرح واقعہ ہوتا ہے کہ اس ترکیب بدی کی دنیا کو خبر بھی نہیں ہوتی، وہ سمجھتا ہے کہ اب میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا، اسی لئے وہ اندر ہی اندر جلتا رہتا ہے، یہ اس کی فاش غلطی ہے اگر وہ ایسے حادثے کے بعد دنیا کو بیانگ دہل اپنے تجربے سے مستفید کر دیا کرے تو عبرت آموزی کے ساتھ ہی وہ ایک ناگزیر فرض کو بھی ادا کرے، یہی میرا ارادہ ہے۔

ٹھیرو! مجھے اپنے حواس درست کرنے دو، دماغ پر ایک مستی کی کیفیت طاری ہے، تمام دُنیا گھومتی دکھائی دے رہی ہے، ہر طرف سبزہ لگا ہوا ہے، طراوت ہے، رونق ہے اور میں ہوں، درخت جھوم رہے ہیں، رنگا رنگ کے پھول اُگے ہوئے ہیں، بادِ صبا ہر طرف اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے، یکایک بادِ سموم چلتی ہے، شگوفے مرجھا جاتے ہیں۔ ٹہنیاں سوکھ جاتی ہیں، درخت خشک ہو کر ٹنڈ منڈ رہ جاتے ہیں، کالی کالی آندھیاں اپنا زور و شور دکھاتی ہیں۔ ہر جانب ہوا کا جھکڑ بڑی تندی اور تیزی سے طوفان برپا کرتا ہے گویا خزاں آ گئی۔

اب ہر شے ایک رقص میں مصروف ہے۔ میرا دماغ بھی چکر پر چکر کھا رہا ہے، بہت تیزی سے، بہت خاموشی سے، اب ذرا سکون نصیب ہوا۔ تمام مختلف اشکال غائب ہونا شروع ہوئیں، صرف ایک واماندگی اور کسل سی باقی رہ گئی۔

(۶)

ہاں! یاد آیا، مجھے اپنے شباب کا زمانہ یاد آیا، وہ سرمستی اور خوشی کا زمانہ، وہ طرب و نشاط کا عالم، وہ رندانہ ہوس پرستی وہ بانکپن کا انداز، جب زندگی میں کوئی خدشہ یا دغدغہ نہ تھا، جب روز و شب کے حوادث، سعی عیش کی ایک ناکام فہرست قرار دئے جاتے تھے، جس میں وہ تمام کارہائے نمایاں مندرج تھے، جو اس دورہ کا طرۂ امتیاز ہیں، حصول مقصد کی پیہم کوشش میں وہ لذت نصیب ہوتی تھی، جس کا اب سان و گمان بھی نہیں، بے فکری اور فارغ البالی میں ایک خلش کی آمیزش تھی جو بعض دفعہ باعث کرب ہو کر اضطراب میں تبدیل ہو جاتی تھی، جو کبھی ناکامی کا لقب پاتی تھی، کبھی قسمت سے خطاب کی جاتی تھی، مگر جبکہ پوشیدہ ہاتھ ہر ایک شے کی تہ میں کام ضرور کر رہا تھا، وہ کامیابیاں اور کامرانیاں جو اب حماقت آمیز ہوس پرستی معلوم ہوتی ہیں، کتنی پرلطف تھیں، وہ تمناؤں اور آرزوؤں کا جمگھٹ جس کا غلبہ اور ہجوم جبین سے پسینے بہا دیتا تھا، جب زمانہ یاد آتا ہے، تو دل پر گویا نشتر کے چرکے لگتے ہیں، اس اعصائے انقا کے باوجود، وہ راہ و رسم آشنائی کی یاد بہت بے کل کرنے والی ہے جب صرف ایک ہستی کا وابستہ دامن ہو جانا عین زندگی تھا، اب تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہم عشق کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ کسی ایک کو اپنے لئے مخصوص کر لینا، اور تمام عمر اپنی زندگی کو صرف اُس پر صرف کرنا، نہ صرف ابتذال کا مترادف ہے، بلکہ اپنے مذاقِ سلیم کا بھی خون کرنا ہے، سطحی محبت، تمام عمر باقی رہتی ہے، مگر حقیقی عشق، خود اپنی قوت میں، یا تو عشق کرنے والے کو فنا کر دیتا ہے، یا خود فنا ہو جاتا ہے، اگر محبت میں یہ بات نہیں تو در اصل وہ محبت نہیں، اس وقت یہ بھی کتنا لایعنی خیال تھا کہ محبت صرف ایک ہستی سے کی جا سکتی ہے، یہ درست ہے کہ محبت انسان کو ایک دفعہ ہوتی ہے، مگر ضروری نہیں کہ وہ صرف ایک ہی وجود سے بھی ہو۔ خیالات کے اظہار کے گوناگوں طریقے ہیں، مگر ان سے جذبے کی انفرادی حیثیت پر کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ جذبہ ایک ہی رہتا ہے، اس کے لوازمات کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو زندگی وبال جان ہو جائے، روش کا یکساں ہونا، عمر کی تمام خوبیوں کو ضائع کر دیتا ہے، مذاق کا بدلنا، مذاق کی صلاحیت کے فنا ہو جانے کی دلیل ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ اتصال و قرب، محبوب پر متصرف ہونے کے بہترین وسائل ہیں، انھوں نے شاید غور نہیں کیا، کہ تمام خواہشات کی تکمیل کے بعد افسردگی لازمی ہے، حصول مقصد کی کوشش میں جو کچھ خاص لطف ہے وہ حصول مقصد میں یقیناً نہیں۔

آہ! سادگی اور ناواقفیت، اس جہان کے بہترین تحائف میں سے ہیں۔ اس وقت، عین جوانی کے آغاز میں انسان، ان دونوں خصوصیات سے متصف ہوتا ہے، وہ ایام جب حسن و عشق کی پاکبازانہ نگاوٹوں پر یقین ہوتا ہے، جب ہر شے میں ایک پر درد لذت ہوتی ہے، رنگا رنگ کی بوقلموں امیدیں، اپنے متلون جلووں سے، گلستانِ خیال کی آبیاری

کیا کرتی ہیں، نہال عمر کی پرورش رحیق عشق سے کی جاتی ہے، گلبن امید کا ہر ایک بوٹا خون دل سے سینچا جاتا ہے، تا کہ جھانک کے لئے آنکھیں ہر وقت طیار رہتی ہیں "دیر و حرم" سے کچھ مطلب نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے، تو وہی "خر عیب نیست" مجھے یاد ہے کہ انھیں ایام میں ایک دفعہ جب میں حدت گزر گیا تھا، تو ایک ناصح مشفق نے اپنی تمام تمکنت و غرور کے ساتھ مجھ ایسے مرعوب کن الفاظ میں کفر و الحاد، دوزخ، جنت، اور ان کے تعلقات ، ایمن کی نسبت تقریر کی تھی، کہ باوجود ان کی مسخر انگیز حیثیت کذائی کے، میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا، اس کے بعد میں نے ہر ممکن صورت سے نیک رہنے کا ارادہ کر لیا تھا، اور خدا جانے میری یہ حالت کب تک قائم رہتی، اگر میں اس کے دوسرے دن ہی اتفاقاً کسی کتاب میں یہ شعر نہ پڑھ لیتا :-

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار   نیست گر صبح بہاری، شب ماہے دریاب

اس شعر کو پڑھتے ہی خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا، زندگی میں وہ تمام اشخاص جو ایک مشین کی طرح اضطراری حرکات کر رہے ہیں اور جن کے لئے اب مسرت کا انعکاس پر تو تک باقی نہیں رہا، ذرا ان سے پوچھا تو جائے کہ اسے نامراد، جب تم نے ہوش سنبھالا تھا، تو امیدیں کس طرح زرق برق لباس میں مختلف زیوروں سے آراستہ، پرے باندھ کر تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے حاضر ہوئی تھیں، ہاں! اس کے بعد جب واقعات کی ترشی اور کھلے پن نے وہ تمام نشہ دور کر دیا، تو الٰہی گویا ایک انحطاط آفریں بے حسی سی چھا گئی، وہ دنیا سے بے نیاز ہو گئے، کتنا جو نثار طرز عمل ہے، اسی کو جہنم کا ساتواں طبقہ کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ اپنے آپ پر حسرت، نا امیدی، حرماں، کی تمام کیفیات مجتمع طور پر طاری کر لی جائیں، اس بات کو نہ سمجھا جائے کہ فطرت کی طرف سے ایک ہلکی سی سرزنش ہے، کہ تمام مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے، ہر ممکن الحصول مسرت کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جانا چاہئے، یہی وہ فلسفہ ہے، جسے شاعر نے صرف دو مصرعوں میں ادا کر دیا ہے۔

"کہاں رہتی ہو"

اس نے دور افق کے قریب درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں چند دہقانی مکانات سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور اس کے بعد میری طرف اس انداز سے دیکھ کر گویا خود اپنی روا داری پر منفعل ہے، تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ دوسرے دن میں گیا تو اسے عین اسی جگہ پایا، میرے قریب ہو پہنچنے پر اس نے جہالت کی سی ندامت اور معصومیت کی سی بے تکلفی سے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔

میں نے اپنا سلسلۂ کلام وہیں سے شروع کیا جہاں سے کل چھوڑا تھا۔ لیکن آج وہ کل سے زیادہ بے تکلف ہو گئی کیونکہ میری نگاہوں کے بے ریا خلوص نے اس کے معصوم دل پر نقش کرنا شروع کیا۔ کونسی ناتجربہ کار دوشیزہ ہے، جو محبت کے آثار کو ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ پڑھ سکے۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ کچھ عرصہ ہم خاموش رہے، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ "میرے جذبات کی نمائش اس سادہ لڑکی کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتی، وہ شاید نسوانیت کے وقار سے خاموش تھی، بہر صورت یہ ناگوار خاموشی ناقابل برداشت ہو گئی لیکن اس کی فطرت نسوانی آخرکار خیالی بندشوں پر غالب آئی۔

اس نے میرے لباس کی طرف تعجب آمیز اشتیاق سے دیکھ کر پوچھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو"

میں نے جواب دیدیا "دور سے۔ بہت دور سے"

وہ ہمہ تن سوال ہو کر میری طرف دیکھتی رہی۔

"اتنی دور سے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ میں اس جگہ سے آیا ہوں جہاں دولت کی فراوانی ہے، عیش کی کثرت ہے، مگر جہاں اس نام نہاد خوشی کے باوجود کلفت روتی رہتی ہے وہاں بدی اپنے زہریلے تبسم سے فضا کو مکدر کر دیتی ہے اور عیش کے پاؤں کی جھنکار رقص کی لرزش ہوتی ہے وہاں اونچے اونچے عظیم الشان مکان ہیں جن میں سنگ سیاہ اور سنگ مرمر کے فرش ہیں۔ ریشمی اور زرتار پردے کمرے کی آرائش کے کفیل ہیں۔ لیکن ان مکانوں میں بسنے والی روحیں مکانوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں وہ موسیقی سے زیادہ مترنم، آب رواں سے زیادہ لوچ رکھنے والی، قوس قزح سے زیادہ رنگین۔ اور عشق سے زیادہ دل افروز ہیں۔ لیکن ان کا باطن جو اقدام گناہ سے مکدر ہو چکا ہے، دنیا کی سب سے زیادہ بدصورت شے ہے، ان کا دل و دماغ ہمیشہ ہوس رانی کی نئی طرح ایجاد کرنے میں مصروف پیکار رہتا ہے ہر ممکن طریقہ سے عشرت کی بے پروا اور آزاد دیوی کو مقید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر وہ ان کی مضبوط گرفت میں سے ایک لطیف لوچ کی طرح نکل جاتی ہے اور ان کی روحیں افسردہ ہو جاتی ہیں۔"

(۷)

اس زمانہ میں، مجھے اچھی خاصی قبول صورتی نصیب ہوئی تھی، جوانی، دیوانی سے متاثر، متناسب الاعضا، گورا یا سپید بدن کشیدہ قامتی میں انگشت نما، چہرے پر تازگی اور شگفتگی، جنس کھر، آنکھ کی پتلی سیاہ، کالی گھنی بھویں، فراست اور ذہانت بشرے سے ٹپکتی تھی، بھورے رنگ کے سنہرے بال، ہمیشہ زرق برق کپڑوں میں ملبوس، دولت کی طرف سے اطمینان تھا روپیہ بہت فراوانی میں نصیب تھا، سوائے کھانے اور پہننے کے اور کچھ کام ہی نہ تھا، طرح طرح کے نو ایجاد ملبوس طیار کرواتا، اور بہت ٹھاٹھ سے نکلا کرتا تھا، ترچھی ٹوپی رکھی ہوئی، پھندنے دار، علیگڑھ کی شلوار، سیاہ فر کا کوٹ مجھے بہت پھبتا تھا، بالاخانوں میں سے عورتیں مجھے جھک جھک کے دیکھا کرتیں، مجھے اس قسم کے حسن سے نفرت تھی۔

ان دنوں میں شاعر تھا، مناظر قدرت کا پروردہ، غیر متمدن حسن کا دلدادہ، ہر خوبصورت، وحشی، شے کو بہ نظر پسندیدگی دیکھنے والا، میرا کلام ایک عجیب سوز و گداز سے معمور ہوتا تھا، ترکیبوں کی چستی، بندش کی نفاست، تخیل کی بلندی، الفاظ کا دروبست، اور سونے پر سہاگہ تھا، میرے شعروں میں ایک خصوصیت بھی تھی، ان میں ایک تجسس، ایک تلاش، ایک سعی ناکام کی روح سرایت کئے ہوئے تھی، یوں معلوم ہوتا تھا گویا کوئی بہت ہی حساس ہستی، کسی خاص شے کی تلاش میں نکلتی ہے، ہر طرح کی

تکالیف جمیل کر ہر طرح کے صدمات اٹھا کر منزل مقصود کا نشان پالیتی ہے، مگر راستے کی درماندگی اور پائے شکستہ کی تھکن کی وجہ سے مجبور ہو کر بیٹھ جاتی ہے، اور بے اختیار اپنے تمام حسیات کو ایک دلدوز اضطراری چیخ کی صورت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

ان میں ایک درد تھا، ایک ٹیس تھی، جو ہر سننے والے کو بے چین کر دیتی تھی، درحاصل وہ شعر میرے، اپنے جذبات کی تصویر تھے میرے دل و دماغ اس وقت، ایسے ہی خیالات کی آماجگاہ بنے رہتے تھے، میرے شعروں کا واحد حسن ان کی واقعیت تھی۔

مجھے ایک مبہم سی جستجو دیوانہ رکھتی تھی، شہری زندگی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی پھرتی تھی، مگر ان تمام قیود کی وجہ سے لاچار ہو کر جو ہماری خلاف فطرت معاشرت نے ہر خاندانی امیر زادے کے لئے تراش کر رکھی ہیں، مجھے علم و فضل کی طرف متوجہ ہونا پڑا اتفاق، یا خوش قسمتی کہئے کہ مجھے ایک خلاف معمول قابل اتالیق میسر ہو گیا، جس نے نہایت غور و پرداخت سے میری ذہنی اور جسمانی قوتوں کی نشوونما کی اور میں نہایت ہی جلدی فارغ التحصیل ہو گیا۔ علوم متداولہ کی نسبت کافی مہارت پیدا ہو گئی اگرچہ اس زمانہ میں وہی شخص صاحب علم خیال کیا جاتا ہے، جو تمام ضروری اور غیر ضروری اشیاء کی نسبت یہ علم رکھے کہ وہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ میں مندرج ہیں —— لیکن جب میرا عہد شباب تھا، تو معیار علم اس سے کہیں بلند تھا، ایک عالم کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک خاص فن میں غیر معمولی تحقیق کے ساتھ، اپنے خیالات کا اظہار کر سکے پچھتیں یہ بات بھی لازمی تھی کہ اسے ایک نہ ایک ہنر میں بھی پورا پورا ملکہ حاصل ہو، علوم میں سے فلسفہ کی طرف میرا میلان طبیعت جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا، اور میں نے قدیم و جدید فلسفہ کی تمام تصنیف کا اس وقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، کہ بلا غور و فکر ان کی تمام غلطیوں پر گرفت کر سکتا تھا، ہنروں میں سے مشہور جرمن فلسفی کی طرح موسیقی سے نہایت الفت تھی، میں کائنات کی بہترین تخلیق، اسی کو تصور کرتا تھا، ہر وقت فرصت میں، رباب بجانا، میرا مرغوب ترین مشغلہ تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں ہر طرح کی تال اور سر پر مجھے قدرت حاصل ہو گئی، میرا گانا اور بجانا، مست کن تھا، ایک تو سوز آشنا دل، دوسرے جوانی کی مدبھری آواز گویا سونے پر سہاگہ تھی، بعض دفعہ رباب بجاتے وقت مجھ پر ایک وحشت سوار ہو جاتی، میں شہری زندگی کے تکلفات اور تصنع سے گھبرا جاتا، ان کا ملمع آمیز بناؤ، ان کا سجا سجایا حسن، جس کے نیچے بدکاری موجیں مار رہی تھی، ان کی وہ ادائیں جن کو عمداً دلربا و دلفریب بنایا جاتا تھا، تمام مجھے ایک نفرت انگیز کراہت سے لبریز نظر آتی تھیں، ایسے اوقات میں میرا قاعدہ تھا کہ کسی سنسان اور غیر آباد جنگل میں نکل جاتا، جسے ابھی نوع انسان کے ناپاک قدموں نے آلودہ نہ کیا ہو، اور رباب بجا کر اپنا غم غلط کرتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں ایک خاموش اور تاریک وادی میں جا پہونچا، دریا، ایک عجیب ترنم سے بہہ رہا تھا، کنارے پر سرو قد بلند درختوں کی قطار کی قطار ایستادہ کھڑی تھی، ہزاروں خوشرنگ پھول، ہزاروں خودرو نونہال گنجان ایک دوسرے کے ساتھ کچھ جھکی شاخیں، زمردیں دامن کوہ اور زمردیں ٹیلوں پر میلوں تک گویا جنت کے دروازے کھلے ہوئے تھے، بادل، افق کے قریب، ایک بھیانک تاریکی میں مبدل ہو رہے تھے، مگر عین وسط آسمان میں، سرخ قرمزی

شعاعیں، ابر کے باریک، شفاف، جالیدار، لباس میں سے چھن چھن کر پڑ رہی تھیں ہوا میں ایک گرانی اور بوجھ سا پایا جاتا تھا گویا مینہ برسنے والا ہے، زمین بارش کی تند اور تیز بوچھار کا انتظار کر رہی تھی، دور دریا کے افق کے قریب، ایک گم کردہ کشتی کے مستول، اونچے بلند مستول نظر آ رہے تھے، لہروں میں تموج اور حرکت پیدا ہو گئی تھی، گویا ایک دوسرے کو آغوش میں لینے کے بیقرار تھیں، بلند بالا سرو کے درختوں کا سایہ، پانی کے ارتعاش کے ساتھ متہیج ہوتا تھا، گویا دیو قامت انسان تھے، جو پانی کی سطح پر کھیل رہے تھے، میرا دل اسوقت غمگین تھا، سینے میں کوئی جگہ خالی سی محسوس ہوتی تھی۔ خاموش کنارے پر بیٹھا گھاس کی پتیوں کو مسل مسل کر ان سے کھیل رہا تھا، میرے دل کے عمیق ترین گوشے میں سے گویا افسردگی کی رو پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، یکایک تمام سطح دریا پر اندھیرا چھا گیا، ان علاقوں میں شام بہت تیزی سے ہوتی ہے، دور، مشرق کی طرف سے ایک ننھا سا سرخ ستارہ طلوع ہوا، اور ساتھ ہی اصلیت اور واقعیت کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے دل میں روشن ہو گیا مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل کو ایک ایسی ہستی کی تلاش اور ضرورت ہے جو روز ابر و شب ماہ کو زینت بخش سکے جو میرے اضطراب آمیز لمحات کو سکون میں تبدیل کیا کرے، جس سے میں صرف محبت ہی نہ کروں، بلکہ اس کی پرستش بھی کروں، وہ دیوی ہو، وہ نازک ہو، وہ حسین ہو، وہ مترنم ہو، وہ موسیقی نواز ہو، اور یہ کہ ایک الفت کرنے والی عورت ہو!!

اس کے بعد میرا شہر میں رہنا ناممکن تھا، کچھ تو آگے ہی طبیعت پھری ہوئی تھی دوسرے اس طرح کا واقعہ پیش آیا، تو گھٹنے کو ٹھیلے کا بہانہ ہوا، میں نے فوراً اپنے وطن کو چھوڑا، اور ملک بہ ملک پھرنا شروع کیا، سیاحت بذات خود ایک دلچسپ و دلفریب مشغلہ ہے، مگر جب اس میں جستجو کا عنصر شامل ہو جائے، تو باعث کرب و اذیت بھی ہے، شہری زندگی کا میں شائق ہی نہ تھا اس لئے زیادہ تر افغانستان کے گاؤں میری وارفتگی کے جولانگاہ بنے رہے، مگر کبھی اس معصوم، غیر متمدن حسن سے سامنا ہوا جو ہمیشہ سے مطمح نظر تھا۔

ایک دن شام کا وقت تھا، میں —— کی معتدل آب و ہوا، فطرت پرور مناظر اور دیہاتی زندگی کے مطالعہ میں اسقدر منہمک ہوا تھا کہ پاؤں کا چکر جاتا رہا تھا، گاؤں سے باہر نکل کر میں نے ٹہلنا شروع کیا، مشرق کی طرف سرخ، ہیبتناک، بلند پہاڑ دور تک پھیلے ہوئے تھے، جن پر ہری مخمل کا فرش، نظر کو طراوت پہونچا رہا تھا، شمال و مغرب کی طرف گھنا، گنجان جنگل تھا جہاں تاریکی، مہیب تاریکی، پوری طرح مسلط تھی، ڈوبتے ہوئے سورج کی ہلکی سے ہلکی کرن بھی شاخوں میں سے گزر نہ سکتی تھی، ہوا سائیں، سائیں کرتی چل رہی تھی، میں اس نظارے کی آرام پروری سے متاثر ہو کر ایک رواں چشمے کے قریب بیٹھ گیا، جس کی سیال موسیقی اپنا زیر و بم ہزاروں وحشی طیور کی آواز کے ساتھ ملا رہی تھی۔

بیٹھتے ہی مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہو چلی تھی کہ پاؤں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا، میں نے آہستہ سے مڑ کر دیکھا ایک کمسن، دہقانی دوشیزہ اپنے کولہے پر گھڑا رکھے آ رہی تھی، جس کا میدے اور شہاب سے گوندھا ہوا بدن، اس کے کرخت اور خشن لباس میں سے بھی ضو دے رہا تھا، وہ مجھے غیر متوقع طور پر پہلے تو دیکھ کر جھجکی، چہرے پر گلابی رنگ اور بھی گہرا ہو گیا تھا

پھر نسوانی وقار نے اُسے سنبھالا۔ اُس نے میری طرف سے نگاہیں موڑ لیں اور میرے قریب ہی بیٹھ کر چشمے سے پانی بھرنے لگی۔

وہ پانی بھر رہی تھی، مگر میری مشتاق نگاہیں، اس کے برتن سے زیادہ سیراب ہو رہی تھیں، اس کے انداز کی ایک باحجاب عریانی، اس کی آنکھوں کی ایک بیباک معصومیت، اور اس کے انداز نشست کی ایک خلاق آزادی، ایسی اشیاء تھیں، جن کی مستی، جدت اور خوشگواری سے، اس کا نا آشنائے حسن دل بالکل بے خبر تھا۔ اس نے پانی بھرتے بھرتے، میری طرف ایک دزدیدہ نگاہ کی گویا اسبات پر تعجب کر رہی تھی کہ میں وہاں کیسے پہونچ گیا، آخر جب بھر چکی تو گھڑے کو سنبھالا، اور اٹھ کر چلدی۔

میرے سامنے سے گزری تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں پوچھ ہی بیٹھا، "تمھارا نام کیا ہے"

اُسنے مجھے سر سے لیکر پاؤں تک دیکھا، پھر آہستہ سے کہا "سیدہ"

"سیدہ" میں نے یہ نام دل میں کئی دفعہ دہرایا، کتنا پیارا، اور اچھا نام تھا جس سے معصومیت گویا ٹپک رہی تھی، میں نے پھر جرأت کی، وہ ابھی کھڑی ہی اپنے ننگے گورے پاؤں کے انگوٹھے کو دیکھ رہی تھی۔

وہ جو میری اس تقریر کو بہت غور سے سن رہی تھی۔ میرے جوش و خروش کو دیکھکر مسکرائی، اگرچہ اس نے میرے مطلب کو سمجھ لیا مگر تغافل کے اُس ادا سے جو عورت کے لئے مخصوص ہے اس نے ظاہری بھولے پن سے پوچھا "تم نے شادی بھی کی تھی؟" میں نے دیوانہ وار اُچھل کر کہا "شادی" اور پھر میں خاموش ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ اسے اپنی نفرت کے سمجھانے کا بہترین طریق کیا ہوگا۔ میں جو شادی کو ارتباط جسمی کی سب سے اعلیٰ معراج سمجھتا تھا کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ اپنے بدن کو ان خبیث روحوں کے بدن سے اتصال باہمی کی اجازت دوں جن کے حسن کی دعوتیں عام نظاروں سے بھی سیراب ہو سکتی تھیں۔

آخر کار میں نے سوچ سوچ کر کہا۔ "کیا تمھیں یقین آتا ہے کہ میں ایسی عورتوں میں شادی کروں گا۔ جن سے مجھے قلبی نفرت ہے اور جن کا بناوٹی حسن میرے معیار سے اس قدر پست ہے کہ میں ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا"

لیکن وہ کچھ نہ سمجھی اور اس وقت تک نہ سمجھی جب تک اظہار محبت سے اس کے دل کو اپنی کیفیات سے آگاہ نہ کر دیا۔

(۸)

محبت کے اس اظہار کے ہم تقریباً روز ملتے رہے اور کچھ عرصہ تک میرا مضطرب دل بھی ایک عارضی سکون میں ڈوب گیا مگر رفتہ رفتہ میرے خیالات ایک زہریلے شبہ سے آلودہ ہونے لگے، میں نے اپنی انتہائی کوششوں سے اس شبہ کو دبانا چاہا مگر میرے دل کی گہرائیوں میں سے ایک ہلکی سی آواز ہمیشہ اس کی تصدیق کرتی رہی، اس کی بے تکلف عریانی جذبات کے بین السطور میں مجھے لگاوٹ کا ایک مہیب عنصر بناوٹ کا ایک خطرناک پہلو محسوس ہونے لگا، اس ابتذال طبیعت کی وجہ سے میں شرم کے مارے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا مگر بظاہر وہ میرے جذبات کی شورش سے بے خبر تھی۔ کیونکہ وہ مجھ سے اسی خندہ پیشانی اور باخلوص سادگی سے ملتی تھی جس طرح اس کا معمول تھا مگر میں بے چین ہوتا گیا۔ ایک نامعلوم سا خوف میرے دل پر طاری

رہنے لگا، ایک مبہم اور تاریک آنے والے خطرے کا خوف میرے دل کو پریشان رکھنے لگا۔ پھر میں سوچتا کہ اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ مجھے دھوکا دے؟ شہری زندگی سے باہر بے وفائی کے واقعات بہت کم پیش آیا کرتے ہیں، وہ محض میرا بیجا گمان ہے جس کی وجہ سے میرا اضطراب لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہا ہے، مگر ان تمام تاویلوں سے میری تسلی نہ ہوتی، غالباً وہ بھی اب میری حالت کو سمجھ گئی تھی، کیونکہ اب وہ میری دل ہی دل میں ایک ایسے سہم اور نمایاں استقلال سے معروف تھی جس نے مجھے اور بھی پریشان کر دیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اسی جگہ جہاں میری پہلی ملاقات ہوئی ہے، بیٹھا ستار بجا رہا تھا۔ میرا دل اندر سے ڈوبا جاتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ موسیقی کی انبساط آفریں کیفیت سے دل کی عشرت خیال کو متحرک کر دوں مگر میرے دل میں ایک خلا پیدا ہو چکا تھا۔ اور گرد کے مناظر کی دلفریبیاں مجھے اپنی پہلی ملاقات کا سماں یاد دلا رہی تھیں۔ نیم زرد درختوں کے نیچے موسم خزاں کی دست برد سے تباہ شدہ پتے اور مرجھائے پھول بکھرے ہوئے پڑے تھے ؎

تمھیں نہیں ہو کچھ اے خشک پتیو برباد
فریب خوردۂ رنگ بہار ہم بھی ہیں

میں نے ستار چھیڑا۔ بہت آہستہ اور نغموں کے ترنم سے اس انقباض کو جو مجھے تنگ کر رہا تھا۔ کم کرنے کی کوشش کی، شروع شروع میں تو مجھے محسوس ہوا۔ گویا نغمے آب رواں کی طرح بہہ نکلے، بنفشہ اور سوسن کی کشت زاروں میں سے گزرتے ہوئے ہوا کی آوارہ خوشبو اور فضا کی رنگینی کو جذب کر کے میرے دماغ کے پردوں میں سما گئے۔ مجھے ایک روحانی خوشی محسوس ہونے لگی، مگر رفتہ رفتہ غیر معلوم طور پر میرے ہاتھ ستار کے نیچے اور دھیمے سروں پر پھرنے لگے، مدہم اور لطیف سُروں کا ایک سماں بندھ گیا، خیال کی ان خود رو موجوں نے غم کی ایک صورت اختیار کی اور مجھے اضطراری طور پر خیال پیدا ہوا گویا میں ماتمی سُر نکال رہا ہوں۔ گویا کوئی فرقت زدہ مایوس، غمگین عاشق ٹھہر ٹھہر کے روتا ہے، سسکیاں بھرتا ہے اور پھر خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر ماتمی سُر اور بھی بلند ہو گئے، گویا کسی نامراد کا جنازہ جا رہا ہو، وہی خاموشی، وہی انجماد، وہی قدموں کی آہستگی جو غمگینی کا تاریک لبادہ ہر ایک شے کو ملفوف کئے ہوئے تھا۔

میں حیران تھا کہ آج خلاف معمول میری کوششوں کے باوجود میرے ستار سے غمگین سُر کیوں نکل رہے ہیں، لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مجھے آج اپنی تمام عمر میں پہلی دفعہ ایک عظیم صدمہ برداشت کرنا ہے، تھوڑے عرصہ کے بعد میں اُٹھا اور اس پگڈنڈی پر جو گاؤں کی طرف جاتی تھی، چل پڑا۔ میرے دونوں طرف کی ایک خوشنما قطار تھی۔ جن میں سے ہوا سرسراتی ہوئی نکلتی تھی۔ تو معلوم ہوتا گویا کوئی بیکس کراہ رہا ہے، تھوڑی دور چل کر ایک چھوٹا سا مرغزار آتا تھا جس کی رنگینیوں نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

میں ایک وارفتگی کے عالم میں چلا جا رہا تھا، کہ مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی، میرے قدم وہیں رک گئے، گویا کسی طلسمی قوت نے انھیں زمین میں منتصب کر دیا ہو، یہ آواز سعیدہ کی تھی، میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا درختوں کے گنجان جھنڈ میں سعیدہ اور ایک اجنبی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

لیکن سعیدہ! آہ وہ عجیب لباس میں تھی، سر سے پاؤں تک وہ ایک ریشمی ساری میں ملبوس تھی، جس کی شفاف تہوں میں سے اس کے بدن کا سرخی مائل سفید رنگ جھلک رہا تھا، اس کے بال کھلے تھے، اور خم کھاتے ہوئے کمر تک پہونچ رہے تھے، اس کی سادگی کی جگہ جس کا عادی تھا، اس کے انداز میں ایک عریانی تھی، اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں، اس کے چہرے سے بجائے محبت کے شقاوت کے آثار ظاہر تھے، اس نے ساری شکنوں کو درست کرتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو زمین پر گاڑے ہوئے اجنبی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "تم بے فکر رہو، شکار اب نہیں نکل سکتا، میرے حسن کے سنہرے پھندے، اس کے گرد لپٹے جا چکے ہیں اور اب وہ اس خوشنما جال سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

میرے دل میں آیا کہ میں اسے آواز دوں، مگر خدا جانے وہ کونسی قوت تھی، جس نے مجھے روکے رکھا، مجھے احساس ہو رہا تھا کہ آج میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی سعیدہ کے فقرے کا مطلب نہ سمجھا، لیکن اتنا ضرور خیال ہو گیا کہ اس نے مجھے اب تک اپنی اصلی حالت کی نسبت دھوکے میں رکھا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اس انقلاب ہیئت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، وہ میرے سامنے کیوں دہقانی لباس میں آتی ہے؟ اسے اس قدر قیمتی لباس اس معمولی سے گاؤں میں کہاں سے میسر ہو گیا میرے دماغ میں اس قسم کے مختلف سوالات پیدا ہو رہے تھے کہ یکایک حقیقت میرے دماغ میں بجلی کی طرح چمکی اور مجھ کو مجھے اپنے دماغ میں تقویت ہونے لگی، لیکن اجنبی کے جواب نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"گلزار اس قدر مغرور نہ ہو، اس کی دلدہی خوب اچھی کرتی رہو کہ وہ سب کچھ تمہارے حوالے کر دے تمہارے ہی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت کچھ عجیب قسم کی ہے۔"

گلزار! تو کیا سعیدہ کا نام گلزار تھا، اب تعجب کی جگہ میرے دل میں اشتیاق کے شعلے بھڑکنے لگے، اب تو میں سمجھ چکا تھا کہ مجھے دھوکا دیا گیا تھا اور یہ عورت ان ہستیوں میں سے ایک تھی۔ جو عصمت فروشی کے بدلے دولت کی تمام عشرتوں کو حاصل کرتی ہیں۔ اول اول تو میرا دماغ سن ہو گیا، میرے قوا میں عمل کی قابلیت ہی نہ رہی، طبیعت میں غصے کا ایک زخار سمندر موجیں مارنے لگا، میں نے چاہا کہ اسی وقت ان دونوں کو قتل کر دوں، صرف اپنے ہاتھوں سے مار ڈالوں، کیونکہ دیوانگی سے مجھ میں اس وقت دس آدمیوں کی طاقت پیدا ہو گئی تھی مگر میں نے اپنے دانت، اور مٹھیاں بھینچ لیں اور چپ چاپ کھڑا رہا۔

سعیدہ یا گلزار نے حقارت کی ایک ہنسی ہنسکر جواب دیا "وہ بے وقوف ہے، اب کہاں جا سکتا ہے، تھوڑے ہی دنوں میں دیکھ لینا وہ اپنی دولت کو میرے قدموں پر نچھاور کر دے گا۔ میں نے تو پہلے ہی دن سے اسے دیکھ کر سمجھ لیا کہ حضرت انتہا درجہ کے احمق واقع ہوئے ہیں۔ جس دن میں پہلی دفعہ دہقانی لڑکی کے لباس میں گئی ہوں، تو واللہ میں نے اپنا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا تھا۔ کہ تم دیکھتے تو عش عش کر اٹھتے۔ اور وہ ——— تو اس آسانی سے پھنس گیا، گویا طیار ہی تھا۔" میں اس سے زیادہ نہ سن سکا اور وہاں سے پاگلوں کی طرح بھاگا۔

(۹)

میں بہت جلدی اپنی زندگی کے انقلاب خیز دور کی طرف آتا ہوں، ایک تاریک بارانی رات تھی، اور مجبوراً محسوس اضمحلال کی ایک عجیب رفتار سے اپنے سست قدموں کو جو بے راہ پھرنے کے عادی ہو چکے تھے تیز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چلا جا رہا تھا، غم نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا، پیچیدہ گلیوں اور تنگ راستوں میں سے گزرتا ہوا میں خدا جانے کہاں نکلا جا رہا تھا کہ مجھے سامنے ایک ہوٹل کی جگمگاتی ہوئی عمارت نظر پڑی، مجھے یاد آیا کہ میں بھوکا تھا، صبح سے بھوکا تھا جس دن سے میں گلزار کو نہیں، نہیں، میں ابھی تک اسے سعیدہ کہوں گا، چھوڑ کر آیا تھا۔ زندگی میرے لئے ایک مسلسل بے رحل ایک طویل تکلیف ہو رہی تھی نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ میں چلا میں اپنے معدے کے فطری عمل کو پورا کرنے کے لئے داخل ہوا۔ میری اپنی خواہش کو اس میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں تھا۔

سنگ مرمر کی ایک خوشنما گول میز کے قریب بیٹھ گیا جس کی سفید اور سرد سطح میرے جلتے ہوئے ہاتھ کو بہت زیادہ ٹھنڈی محسوس ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے ارد گرد دیکھا، یکایک ادھیڑ عمر کا ایک بلند بالا شخص جس کی صورت میں مجھے اس کی جوانی کی شکل ایک بھولے ہوئے پریشان کھنڈر کو اور زیادہ عجیب کر دے اور زیادہ عجیب کر دے۔ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا، میں اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے میرے قریب آ کر میرے چہرہ کی طرف بے اعتبار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پھر ایک عجیب وثوق سے کہا "نظیر تم ہو"

میں نے کہا "نثار"

"ہاں نثار، بچپن میں تمہارے ساتھ کھیلا ہوا نثار"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ کر ہنس دئے، غالباً دونوں کے دل میں ایک ہی طرح کے جذبات موجزن تھے، میں اس کی موجودہ مکروہ صورت کو خوبصورتی کے ان نشانات سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا، جو اسے تمام لوگوں سے ممتاز اور مشخص کرتے تھے، غالباً وہ بھی اسی طرح کے خیالات میں غرق ہو گیا، آخرکار اس کی تمام حیرت تمام بے اعتنائی اور تمام اشتیاق نے ایک معنی خیز اشتیاق کی شکل اختیار کی۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے ٹال کر کہا "کچھ نہیں"

"دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے"

"نہیں دولت تو میرے پاس اتنی ہے کہ تمام عمر خرچ کروں تو ختم نہ ہو"

"تو پھر کوئی صدمہ پہونچا"

میں نے جواب دیا کیسا کچھ مگر تمہاری کیا حالت دیکھ رہا ہوں تم بھی تو دولت مند گنے جاتے تھے تمہیں کس چیز نے ایسا کر دیا؟

اس نے میرے سوال کا کچھ جواب نہیں دیا، کچھ عرصے کے بعد بولا "اپنے صدمے کو کم کرنا چاہتے ہو"

میں نے بے اختیاری کی ایک گہری سانس لی۔ "کوئی چیز میرے صدمے کو کم نہیں کر سکتی"

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک مشتعل ہوئی اور اس نے میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر پھر آنکھیں جھکا لیں۔ ہم خاموش رہے، ڈاکٹر کچھ نا سمجھ سکا۔ کہتا بھی خاموشی ہی میں کھا گیا۔ کہتا کیا بچے، تو اس نے سگار کیس نکال کر ایک سگار سلگایا اور میرے آگے پیش کیا۔ ہم دونوں بیٹھے اپنے دھوئیں کی پیچیدگی میں اپنی پریشانیوں کا عکس دیکھتے رہے۔ تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد خادم نے دو گلاس لاکر میز پر رکھ دئے۔ جن میں سے تیز سرخ رنگ کی شراب جھلک رہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے"

انھوں نے ایک گلاس کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اہتزازی تاثرات سے لبریز ہوکر اس کے خوشگوار رنگ کی طرف حریص نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے "پیو، یہ لعل گداختہ پیو، تمام رنج والم کو اس کا ایک جرعہ کافور کر دے گا۔ تمھاری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی۔ یہ افسردگی یہ کاوش، یہ پریشانی سب رفع ہو جائے گی۔"

میں نے جواب دیا "یہ تو میں نہیں پیوں گا"

انھوں نے کہا "نہیں، بندۂ خدا کیوں زندگی برباد کرتے ہو۔ میں تمھارے آگے ایک نئے شفق کے دروازے کھول رہا ہوں میں تمھیں ایک نئی جنت کی سیر کرانا چاہتا ہوں۔"

میں نے اس سرخ تیز چیز کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "کیا یہ چیز میرے دل کے بوجھ کو کم کر دے گی۔ کیا اس سے میرے حافظے کی ناخوشگوار قوت فنا ہو جائے گی۔ کیا اس سے میں بیخودی کے عالم میں پہونچ جاؤں گا؟"

اس نے میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "ہاں، ہاں یہ وہی چیز ہے"

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا پھر رکھ دیا۔ پھر ایک دفعہ آنکھیں بند کرکے منھ تک لے گیا اور آدھا ختم کرکے میز پر رکھ دیا۔ جسم میں گرمی کی ایک تیز و تند لہر دوڑ گئی۔ رگیں کھنچنے لگیں۔ طبیعت ذرا بشاش ہو گئی۔ اتنے عرصہ میں وہ اپنا گلاس ختم کر چکا تھا اور زیر لب گنگنا رہا تھا:

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

میں نے باقی آدھا گلاس بھی ختم کر دیا۔ اس طرح میں نے پہلی دفعہ شراب پی۔

اب میں کیا کہوں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں ایک دائم الخمر مدہوش ہوں، اور مجھے بھی سرمستی کی زندگی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لوگ مجھے احمق بھی کہتے ہیں۔ دیوانے، انھیں کیا معلوم میں کون ہوں۔ جدھر آنکھ اٹھاتا ہوں دلکشا جنت کے دروازے کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ اب سعیدہ ہے نہ سعیدہ کی یاد۔ صرف ذہن میں اس دور کی ہلکی سی کیفیت باقی ہے۔ جب میں اس آتش سیال کو سامنے رکھ کر بیٹھتا ہوں۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی تیزی و تندی، اور حدت اسی میں جمع ہو گئی ہے گر ٹھہرو میرا دماغ پھر پھٹنے لگا، تو میں گرج رہی ہیں میدان کارزار گرم ہے۔ مجھ پر پھر کسی خطرناک دیوانگی کا دورہ طاری ہونے لگا ہے۔

سید عابد علی عابد بی، اے

سُرخ گلاب

(افسانہ)

۔۔۔۔۔۔۱۔۔۔۔۔۔

راجکماری اپنے باغ میں ایک ہرے بھرے سایہ دار پیڑ کے نیچے بیٹھی پھولوں اور موتیوں کا ہار گوندھ رہی ہے۔

راجکمار للچائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"راجکماری یہ سندر جیمال تم کس کے لئے گوندھ رہی ہو؟"

"راجکمار یہ مالا اُسے ملے گا جو مجھے ایک سرخ گلاب لا دے گا۔"

یہ سُن کر پھول کھلکھلا اٹھے۔ درختوں نے انگڑائی لی۔ پتے سرگوشیاں کرنے لگے۔ راجکمار اس کی یہ آرزو پوری کرنے کی امنگ میں وہاں سے چل دیا۔

۔۔۔۔۔۔۲۔۔۔۔۔۔

سُرخ گلاب کا ملنا سہل نہیں تھا۔ راجکمار نے بہت ڈھونڈھا لیکن سارے باغ میں ایک بھی سُرخ گلاب نہیں تھا اداس ہوکر ایک مولسری کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر سوچنے لگا آدمی پیار کا بھوکا ہے لیکن اے دنیا میں جسے کسی نے بھی پیار نہیں کیا اس کے دیکھتے ہوئے دل میں کیسی ٹیس ہوتی ہے اسے درد والے کے سوا اور کون سمجھ سکتا ہے۔

مولسری کے پیڑ کی پتیوں میں سے بلبل نے راجکمار کی یہ حالت دیکھی اس کا دردمند دل آپ ہی آپ بھر آیا۔

راجکمار کی ناامیدی بدل گئی۔ آنسو بہنے لگے، تھوڑی ہی دیر میں اس کا رنگ اُڑ گیا۔ راجکمار نے کہا۔ اے دل آدمی کو خوشی کیسے ہو۔ ہم لوگ دکھاوٹی شان و شوکت سے بیرونی حاجتوں کو ڈھانک سکتے ہیں لیکن دل کی محتاجی ڈھانکی نہیں جا سکتی۔ بلبل سوچنے لگی یہ تو کوئی عاشق ہے۔ میں رات رات بھر انھیں کی قسمت کا گانا گاتی ہوں چاند کی کرنیں انھیں کی قسمتوں سے کھیلتی ہیں چہرہ کتنا حسین ہے۔ بالوں میں کیسی چمک ہے اور ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کے سے۔ لیکن یہ رونگیسا عشق اور ناامیدی کا ساتھ کیسے ممکن ہے۔

راجکمار نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ "کل راجکماری کی سالگرہ ہے۔ سُرخ گلاب میرے پاس کہاں جو میں وہاں جا سکوں کتنا بدنصیب ہوں، کہیں ایک بھی پھول نہیں مل سکا۔ اپنی قسمت کو رونے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔" یہ کہکر راجکمار رونے لگا۔

پیڑ کا ایک سبز پتا بولا — "بیچارہ روتا کیوں ہے؟"
اُسی طرف سے ایک تیتلی جا رہی تھی۔ اُس نے بھی کہا — "ہاں سچ مچ بیچارہ کیوں روتا ہے" پاس ہی ایک گیندے کا پھول تھا اُس نے بھی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا "یہ کیوں روتا ہے اسے کچھ تکلیف ہے؟"

بُلبل بولی "یہ ایک سرخ گلاب چاہتے ہیں۔"

سب ایک ساتھ بول اُٹھے — "تعجب ہے کہ ایک سُرخ گلاب کے لئے اتنا رونا۔" اس پر سب پھول کھلکھلا کر ہنس پڑے اور پتوں میں چپکے چپکے سرگوشیاں ہونے لگیں۔

صرف ایک بُلبل نے راجکمار کی تکلیف کو جانا۔ اس نے سوچا "اتنے دنوں تک جو میں نے نغمۂ محبت گایا ہے اسی سے راجکمار کے دل میں درد اُٹھا ہے۔" پھر ایک گلاب کے پھول کے پاس بیٹھ کر محبت کا یہ راز سوچنے لگی۔ یکایک اپنے چھوٹے چھوٹے پروں کو ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی اس کنج سے سایہ کی طرح اُڑ گئی۔

—— ۳ ——

باغ کے بیچ میں گلاب کا ایک خوبصورت پیڑ تھا۔ اُسی کی ایک ڈال پر بُلبل جا کر بیٹھی۔ وہ بولی "بھائی تم مجھے ایک لال گلاب دو گے؟ میں تمھیں اپنا سب سے اچھا گانا سناؤں گی۔"

پیڑ سر ہلا کر بولا "میرا پھول سمندر کے پھین سے بھی بڑھ کر سفید ہے اس کے لے جانے سے تمھارا کوئی کام نہیں نکل سکتا وہ جو پرانا پیڑ دیکھتی ہو اُسی کے پاس میرا بھائی ہے۔ اس سے شاید تمھیں کوئی لال گلاب مل سکے۔"

بُلبل اُڑتی ہوئی دوسرے گلاب کے پاس پہونچی اور بولی "بھائی ایک لال گلاب دو۔ میں تمھیں اپنا سب سے اچھا گانا سناؤں گی۔"

پیڑ نے سر ہلا کر کہا۔ میرا پھول کیسر سے بھی بڑھ کر پیلا ہے۔ لیکن راجکمار کا جو وہ مکان دکھائی پڑتا ہے اُس کے پورب کی طرف جو کھڑکی ہے اُس کے پاس میرا ایک بھائی رہتا ہے۔ وہاں جانے سے شاید تمھیں لال گلاب مل سکتا ہے۔" بلبل اُڑتی اُڑتی کھڑکی کے پاس والے گلاب کے پیڑ کے پاس آئی اور بولی "بھائی ایک لال گلاب دے دو میں تمھیں اپنا سب سے اچھا گانا سناؤں گی۔"

پیڑ سر ہلا کر بولا "میرا پھول خون سے بھی بڑھ کر سُرخ ہے لیکن بہت اولوں کی وجہ سے میری رگ رگ سکڑ گئی ہے۔ کہرے نے میری تمام کلیوں کا ناس کر دیا۔ آندھیوں نے میری تمام ڈالیوں کو جھکول ڈالا ہے۔ اس سال مجھ میں ایک بھی پھول نہیں آیا۔" یہ کہہ کر پیڑ رونے لگا۔

بُلبل بولی "روتے کیوں ہو؟ رونے سے کیا کھوئی ہوئی چیز مل سکتی ہے؟ دیکھو بھائی کوشش کرنے سے اگر ایک بھی پھول مل جائے تو میرا کام چل جائے گا۔"

پیڑ بہت دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا "ایک طریقہ ہے۔ لیکن وہ اتنا کٹھن ہے کہ مجھے تمھارے سامنے اُسے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔"
بلبل بولی "کہو کہو مجھے کچھ بھی ڈر نہیں۔"

پیڑ بولا "اگر لال گلاب چاہتی ہو تو چاندنی رات میں گانا گا کر اُسے پیدا کرنا ہوگا۔ اسے تمھیں اپنے دل کے خون سے لال کرنا ہوگا۔"

بلبل بولی "وہ کیسے؟"

پیڑ بولا — "سنو بتلاتا ہوں۔ پہلے تمھیں میرے کانٹوں سے اپنا دل چھلنی کرنا ہوگا۔ ساری رات اس طرح تم صبح ہونے تک گانا ہوگا کہ میرے کانٹے تمھارے بدن کو چھید ڈالیں لیکن تمھیں معلوم نہ ہو تمھارے دل کا خون میری رگوں میں جانے سے سرخ گلاب کی خلقت ہوگی۔"

بُلبل پہلے چونک اُٹھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے بولی "لال گلاب کے لئے اگر مرنا بھی ہو تو وہ بھی مجھے قبول ہے کیونکہ یہ تو سمجھوں گی کہ اپنے ایک بھائی کا میں نے دل رکھا۔" یہ کہتے کہتے بلبل کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مشکل سے اپنی آواز سنبھالتے ہوئے بولی "زندگی کتنی پیاری چیز ہے" اور پھر اپنے چھوٹے چھوٹے پروں کو ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی اوپر کو اُڑ گئی۔

—— ۴ ——

راجکمار ابھی اسی جگہ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو اب تک نہیں سوکھے تھے۔

بُلبل پاس آکر بولی "بھائی مت روؤ۔ میں تمھیں لال گلاب لا دوں گی۔ چاند کی روشنی میں اُسے پیدا کروں گی۔ دل کے خون سے اسے لال کروں گی۔"

راجکمار اُٹھ بیٹھا۔ لیکن یہ نہ سمجھا کہ بلبل کہتی کیا ہے۔ مولسری کے پیڑ نے بھی سُنا۔ اُس کے دل کو بڑی چوٹ لگی بلبل اسی کی ڈالوں پر گھونسلہ بنا کر رہتی تھی۔ رات کو اُس کا گانا سُنکر مولسری کے پیڑ نے کتنی راتیں بے نیند کے کاٹی تھیں۔

مولسری بولی "اے بُلبل تمھارا جانا میری ساری خوشیوں کا چلا جانا ہے تمھارے چلے جانے پر میں کیسے رہوں گی؟"

پیڑ کے ہرے پتے کانپ اُٹھے اور گھبرا کر کہنے لگے "بُلبل تم نے دل میں یہ کیا ٹھانی ہے؟"

تیتلی کچھ دیر کے لئے اپنے پر سمیٹ کر بیٹھی رہ گئی پھر یہ کہتی ہوئی "یہ باتیں ہماری سمجھ کے باہر ہیں" اُڑ کر دور جا بیٹھی۔

گیندا بولا "دوسرے کی بپت دور کرنے کے لئے خود مٹ جانا یہ کیا بات ہے؟" پھول پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ سب نے مل کر کہا۔ "بُلبل تم جاتی ہو اپنا آخری گانا ہمیں سُناتی جاؤ۔"

بُلبل گانے لگی۔ اس کی درد بھری آواز چاروں طرف پھیل گئی۔ سننے والوں پر سناٹا چھا گیا۔ یہ ہوش بھی نہ رہا کہ گانا کب بند ہوا۔

—— ۵ ——

چاند نکل آیا بُلبل نے گلاب کے پیڑ پر جا کر اُس کے کانٹوں سے اپنا جسم چھید کر گانا شروع کیا جس کے تیکھے درد کو دیکھ کر چاند اچنبھے میں رہ گیا۔ بلبل جتنی بڑھتی ہوئی اُمنگ سے گانا گاتی تھی اتنا ہی اُس کا بدن کانٹوں میں بندھتا جاتا تھا۔

پہلے اُس نے عشق کی پیدائش کا گیت گایا۔ پیڑ کی ڈالی پر ایک عجیب و غریب پھول کِھل اُٹھا، گیتوں کا ایک تار بندھ گیا ادھر پنکھڑی پر پنکھڑی کھلتی جاتی تھی رات بیتی جاتی تھی۔ پیڑ نے متردد ہو کر کہا۔ "بلبل میرے کانٹوں پر اپنا دل دبائے رہو نہیں تو پھول کی طرح کھِلنے کے پہلے ہی سویرا ہو جائے گا"۔

بلبل نے ایسا ہی کیا۔ اُس کی آواز اور بھی تیز ہوتی گئی۔ اُس نے اب عشق کے شباب کا گانا گایا۔ یکایک گلاب کی پنکھڑیوں سے سرخی جھلکنے لگی۔ کانٹا اب تک بلبل کے دل تک نہیں پہونچا تھا، گلاب کے اندر بھی ابھی کچھ سفیدی باقی رہ گئی تھی پیڑ چلا کر بولا:۔ "بلبل جلد اپنا دل میرے کانٹوں میں پوری طرح بند رہو نہیں تو پھول پورا کھلنے کے پہلے ہی سویرا ہو جائے گا"۔

بلبل نے ایسا ہی کیا۔ ایک نہایت درد بھری آواز اُٹھی چاروں طرف وہ دکھ بھری آواز گونج اُٹھی کانٹوں نے اُسکے دل کو چھلنی کر دیا۔ اس وقت گلاب کا پھول ایک پل میں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح لال ہو گیا۔
بلبل کی آواز دھیمی ہوتی گئی وہ درد کے مارے تلملا اُٹھی۔ آنکھیں مندھ گئیں آواز دھیمی ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔
پیڑ بولا:۔ "بلبل دیکھو سرخ گلاب پورا کھل گیا" بلبل نے کچھ بھی جواب نہیں دیا۔ کلیجے میں کانٹا چبھ گیا تھا اور وہ اس وقت پیڑ کے نیچے مری پڑی تھی۔

سویرا ہوا۔ راجکمار نے کھڑکی کھولی۔ سامنے ہی انھیں وہ پھول دکھائی دیا۔ خوشی سے متوالا ہو کر نیچے آیا اور ہاتھ بڑھا کر اُسے توڑ لیا۔ زمین کی طرف نظر ڈال کر اتنا دیکھنے کا بھی موقعہ نہیں ملا کہ کسی جان کے بدلے میں اسے یہ انمول چیز ملی تھی۔

راجکمار پھول پاتے ہی راجکماری کے پاس گیا اور کہنے لگا "یہ تمہارا سرخ گلاب میں لے آیا۔ ایسا لال پھول زمین کے پردے میں کبھی نہیں کھلا ہوگا"۔

یہ سُن کر راجکماری نے اپنا منھ پھیر لیا۔ وہ اپنی جیجال شام ہی کو توڑ چکی تھی۔

بولی:۔ "راجکمار اسے لے جاؤ۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔

راجکمار نے غصے میں پھول کو راہ میں پھینک دیا۔ ایک گاڑی ادھر سے آتی تھی اُس کا پہیا پھول کو کچلتا ہوا نکل گیا۔

راجکماری نے کہا:۔ "راجکمار تم گنوار اور احسان فراموش ہو۔ تم محسن کش ہو"
یہ کہکر راجکماری وہاں سے چلی گئی۔

(ماخوذ) **فراق (گورکھپوری)**

فریبِ حسن

سب سے پہلی چیز جو مسعود نے اپنی عمر میں چُرائی موزہ کی جوڑی تھی۔ یہ اس نے ایک بڈھے نیم مدہوش کباڑی کی دوکان سے حاصل کی تھی جو اس قسم کی چیزیں نیلام سے خرید کر نئے فیشن ایبل طالبعلموں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا۔ مسعود اُس وقت ایک دُبلا پتلا سیانہ تو اور کھلتے ہوئے سانولے رنگ کا لڑکا تھا جس کا چہرہ فرشتوں کی طرح بھولا لیکن فطرت شیطان کی طرح شریر تھی۔
جب اس نے اور زیادہ ہوش سنبھالا، تو اُس نے اپنے فن میں بھی ترقی حاصل کی۔ یعنی اب وہ بڑی انگریزی دوکانوں میں ریشمین رومالوں اور نکٹائیوں پر طبع آزمائی کرنے لگا اور دو چیزوں کی قیمت کے ٹکٹ آپس میں بدل کر زیادہ قیمت کی چیز کو سستا خرید لیتا تو اس کے ہاتھ کا کرتب تھا، اس کے بعد جوہریوں اور گھڑیاں بیچنے والوں کی دوکانیں اس کا میدان عمل قرار پائیں، جہاں کے مال غنیمت سے وہ اپنے دوستوں کو تحایف بھی دیتا اور کچھ سامان بیچکر اپنی ضروریات میں بھی صرف کرتا۔

مسعود علو درجہ جامہ زیب واقع ہوا تھا، کبھی کبھی جب وہ عمدہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر نکلتا تو کسی ریاست کا چھوٹا سا نواب معلوم ہوتا۔ لیکن جب میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے اس کے بدن پر ہوتے تو طبعی شرارت کا یہ حال ہوتا کہ کوئی قریب سے بھی گزر جاتا تو اس کی آفت سے پناہ مانگنے لگتا۔ وہ کپڑا ہمیشہ نفیس اور قیمتی پہنتا۔ جلسوں میں امراء کے لباس کو غور سے دیکھا کرتا اور پھر بعد کو خود بھی ویسا ہی ملبوس طیار کرتا ـــــ فطرتاً وہ کسی قدر صناع بھی واقع ہوا تھا، اس کے کمرہ میں تصویری کارڈوں کے انبار لگے رہتے الماریاں خوبصورت طلائی جلدوں کی کتابوں سے بھری رہتیں اور نقاشی کے بہترین نمونے چوکھٹوں میں دیوار پر آویزاں رہتے۔

وہ نہایت پسندیدہ عادات کا پتلا تھا۔ وہ پُر تکلف زندگی کا عادی تھا اور عورتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اسی طرح وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں سے بھی ملنا پسند نہ کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا لیکن کم اور وہ بھی سارسا پریلا کی بوتل میں بھر کر رکھتا۔ کھانے کے بعد علانیہ گھر والوں کے سامنے اس میں سے نکال کر پی لیتا۔ وہ سمجھتے کہ یہ کوئی دوا ہے، فن کے لحاظ سے وہ ایک بے نظیر شخص تھا، گھر اور الماریاں اس کے جادو بھرے ہاتھوں کے سامنے خود بخود اپنے دروازے کھول دیتے۔ اور لوہے کے صندوق اپنے چھپے ہوئے راز اس پر ظاہر کر دیتے۔ اس کی بینی اور اونچی ناک متعدد پردوں میں سے گھڑی، زیور، نوٹ، یا روپیہ کی بو سونگھ لینے میں کمال رکھتی تھی۔

جب وہ اپنے کام کے لئے طیار ہوتا تو اس کی تمام شخصیت میں ایک تبدیلی واقع ہو جاتی۔ اس کی زبان نہایت شستہ ہو جاتی اور اس کی ظاہر حرکت نہایت سلجھی ہوئی نظر آتی اور ایسی حالت میں وہ خواہ کیسی ہی بلند سوسائٹی میں شامل ہو جاتا کوئی یہ شبہ نہ کر سکتا تھا کہ وہ غیر ہے۔

آنریبل رائے بہادر کیشو لال جو عورتوں کے باب میں کافی سے زیادہ بدنام تھا، اپنی عالیشان کوٹھی میں لڑکے کی منگنی پر دعوت دے رہا تھا، ہر مذہب و ملت کے معزز مہمان، مرد و عورت کھانے پر مدعو تھے۔ عورتوں کے لئے کوٹھی کے زنانہ حصہ میں اور مردوں کے لئے باہر کے کمروں میں بڑے اعلےٰ پیمانہ پر بندوبست کیا گیا تھا، رات کے آٹھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے اور کھانا چنا جا رہا تھا۔

مسعود کھانے کے وقت کا لباس زیب تن کئے اور اس پر اوورکوٹ پہنے ہوئے، جس کی متعدد جیبوں میں بیسیوں چیزیں چھپ سکتی تھیں۔ فٹن پر سے اتر کر نہایت شان کے ساتھ کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا نشست کے کمرہ کی طرف چلا، لیکن رستے میں سے ایک طرف کو مڑ کر چمن میں داخل ہو گیا، اس وقت اسے دیکھنے والا اگر کوئی ہوتا بھی تو اس کے پر اطمینان انداز اور جگہ کی مکمل واقفیت سے یہی سمجھتا کہ کوئی معزز مہمان ہے جو کسی ضرورت سے چمن میں گیا ہے، جگہ اور مکان سے اس نے اس طرح واقفیت حاصل کی تھی کہ کچھ دن پہلے جب کوٹھی میں مرمت اور قلعی وغیرہ ہو رہی تھی اس نے آکر کل کمروں کا معائنہ کیا تھا اور [illegible]، معمار لوگ، مکان کے چوکیدار پہرے پر تھے اس لئے کوئی اتنی جرأت نہ کر سکا تھا کہ اس شریف صورت نوجوان سے پوچھے کہ آپ نے یہاں کیوں تکلیف کی ہے۔

اس کے چہرے سے کسی قسم کی فکر یا اضطراب کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ایسے وقت میں کسی کے مخل ہونے کا خطرہ نہیں ہے تو آہستہ آگے بڑھ کر ایک غسل خانے کے دروازے کو آہستہ سے دھکیل کر دیکھا۔ وہ کھلا تھا، اب وہ گھر کی مالکہ کے سونے کے کمرہ میں تھا، غسل خانہ میں بالکل اندھیرا تھا اور ساتھ والے کمرہ سے روشنی دروازے کے کناروں پر نظر آتی تھی۔

مسعود نے دبے پاؤں چل کر اس دروازے کو آہستہ سے کھینچا اور تھوڑا سا کھول کر کمرے میں نظر دوڑائی۔ پھر اس خیال سے کہ کمرہ خالی ہے دروازے کو اور زیادہ کھول کر بڑھا ہی تھا کہ ایک ہلکی سی دبی ہوئی آواز نے اسے واپس ہٹ جانے پر مجبور کیا یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی عورت سسکیاں لے رہی ہو۔

مسعود غسل خانہ سے باہر نکل جانے ہی کو تھا کہ سسکیوں کی آواز پھر آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عورت سخت تکلیف میں ہے اور ضبط کرنے کی بیحد کوشش کر رہی ہے۔ وہ باہر نکل چکا تھا لیکن پھر واپس آیا اور غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک عورت پستول ہاتھ میں لئے ہوئے خودکشی پر آمادہ ہے۔ یہ جھپٹ کر عورت کے پاس پہونچا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، کچھ دیر تک دونوں زور آزمائی کرتے رہے اور آخرکار مسعود کی مضبوط انگلیاں عورت کی نازک سفید کلائی میں گھس گئیں اور اس نے

درد کے مارے ایک آہ کے ساتھ پستول کو چھوڑ دیا، مسعود نے پستول کو ایک اونچی الماری کے اوپر رکھ دیا اور نہایت نرمی سے اپنے حد درجہ پسندیدہ انداز میں کہنے لگا "یہ کام آپ کے شایاں نہیں ہے۔"

عورت درد اور ملامت بھری نمناک آنکھوں سے دیکھتی رہی، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ کونے میں سکڑی جاتی تھی۔ مسعود نے دیکھا کہ علاوہ حسن غیر معمولی کے اس میں امیرانہ تمکنت بھی پائی جاتی تھی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ منھ پر رکھ لئے اور پھر رونے لگی۔ مسعود نے اسے آہستہ سے ہٹا کر ایک بڑی کرسی پر بٹھا دیا اور غسل خانہ سے جاکر پانی کا ایک گلاس بھر لایا اور زبردستی اس کو پلا کر بولا۔ "ہر مشکل کا حل ممکن ہے اور موت صرف ضعیف بدصورت لوگوں کے لئے ہے، آپ کے لئے نہیں ہے۔"

آہستہ آہستہ اس عورت کا غم و غصہ کم ہونے لگا اور مسعود کی نرم گفتگو نے اسے خاموش کر دیا۔ وہ بالکل بھولی بھالی اور مکر و فریب سے ناآشنا معلوم ہوتی تھی اور اس نے آہستگی سے کہا "آپ نے میرے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا ہے اور بہت صبر سے کام لیا ہے۔"

"میرا مقصد یہی تھا۔ کہئے اب تو آپ ایسے مجنونانہ فعل کے ارتکاب کا خیال نہ کریں گے؟"

وہ بے اختیار کانپ گئی۔ "میں نہیں جانتی کہ کیا کروں گی۔ سوائے اس کے اور کوئی راہ بھی تو نہیں ہے۔"

"کہئے تو۔ شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔"

حسرت زدہ عورت نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی صاف پیشانی پر حیرانی کی ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں رائے بہادر کے مہمانوں میں سے نہیں ہوں بلکہ ایک پرائیویٹ سراغرساں ہوں، رائے بہادر عام طور پر بڑی دعوتوں کے موقع پر مجھے بلا لیا کرتے ہیں تاکہ ہر طرف کا خیال رکھوں۔ لیکن اگر آپ میری امداد قبول فرمائیں تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ آپ مجھ پر کامل اعتماد رکھ سکتی ہیں۔"

وہ کچھ خوفزدہ سی ہو گئی اور بولی:۔ "آپ کیوں آگئے تھے، اگر نہ آجاتے تو اب تک فیصلہ ہو چکا ہوتا۔" وہ جھلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی، مسعود کو مجبوراً اسے دونوں ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دینا پڑا اور کہنے لگا:۔

"آپ اپنی تکالیف کا مجھ پر اظہار تو کیجئے۔ انسانی کوشش جہاں تک کام دے سکتی ہے میں آپ کی مدد کے لئے طیار ہوں۔"

وہ مسکرائی "اچھا میں آپ پر بھروسہ کروں گی۔ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو ہی رہیگا لیکن اگر آپ ---- اگر آپ کچھ کر سکیں۔"

وہ وفعتاً اٹھی اور میز پر سے ایک چمڑے کا چھوٹا سا بکس اٹھا لائی اور اس میں سے متعدد قسم کا جڑاؤ زیور نکالا مسعود کی مشاق آنکھوں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کئی ہزار کا مال ہے۔ عورت نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا: "آپ ان میں سے جو کچھ چاہیں لے لیں، سب لے لیں۔ لیکن خدا کے لئے مجھے بچا دیں۔"

مسعود کا رنگ سرخ ہو گیا اور اس نے کہا: "میں نے آپ سے معاوضہ کب طلب کیا تھا؟"

"لیکن مجھے تو دینا ضروری ہے۔ میں ایک اجنبی کا اتنا بڑا احسان کیونکر لے سکتی ہوں مجھے آپ کا نام بھی تو معلوم نہیں۔"

اس نے اپنا اصلی نام بتا دیا اور کہنے لگا: "اب بہتر ہو گا کہ آپ مجھے اپنی فکر سے آگاہ کریں ہم بہت سا وقت پہلے ہی ضائع کر رہے ہیں۔"

اپنے حالات کا بیان شروع کرنے سے پہلے عورت کے چہرے پر اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ گویا وہ مذبذب تھی کہ کہے یا نہ کہے۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ راز دارانہ طریق پر جس سے دونوں کے سر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے کہنا شروع کیا۔ "میرا نام پاربتی ہے اور میں سیٹھ پریم داس کی بیوی ہوں۔ آپ نے یہ نام غالباً کبھی نہیں سنا ہو گا۔"

مسعود نے سر کو نفی میں ہلایا۔ "ہم یہاں تھوڑے دنوں کے لئے آئے ہیں۔ ہمارا گھر بمبئی میں ہے گو میں بمبئی کی رہنے والی ہوں۔ کاش کہ ہم نہ آئے ہوتے۔"

اس کے چہرے پر دوبارہ تذبذب کا اظہار ہوا۔ مسعود نے کہا: "پیارے خدا وقت ضائع نہ کیجئے۔"

"تو مجھے آپ کو اپنا راز بتا دینا ہو گا۔ آپ جانتے ہیں کہ رائے بہادر کیشو لال کس قسم کا آدمی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ اس کے لئے سراغرسانی کرتے ہوں اور آپ کو یہ علم نہ ہو؟"

"ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تو غالباً میں نے آپ سے نہیں کہا کہ شادی کے بعد میں اور میرا خاوند پہلی بار یہاں آئے ہیں اور وہ بمبئی کا ایک بڑا معزز رئیس ہے اور ادھر کے لوگوں سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ میری شادی کو سال بھر کا عرصہ ہو چکا ہے۔ پہلے میرے والد کا ارادہ میری شادی رائے بہادر کیشو لال سے کر دینے کا تھا اور معاملہ یہاں تک طے ہو چکا تھا کہ اس کے طلب کرنے پر والد نے میری عکسی تصویر اسے بھیج دی تھی۔ بعد میں ادھر تو ہمیں اس کے چال چلن کی نسبت لوگوں نے ڈرایا اور ادھر ہمارے چند دنوں کے لئے بمبئی جانے پر سیٹھ پریم داس نے مجھ سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں سیٹھ پریم داس کی بیوی بن گئی اور کیشو لال دانت پیستا رہ گیا۔"

مجھے اپنے خاوند سے بے حد الفت ہے اور وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے لیکن اس میں ایک بڑا سخت نقص ہے اور وہ یہ کہ بے حد بدگمان ہے۔ میرا کسی سے بات کرنا بھی اسے برا لگتا ہے۔ یہاں آنے پر کیشو لال نے ہم دونوں کو کچھ دنوں

سے اپنے یہاں مدعو کر رکھا ہے اور مجھے کہلا بھیجا ہے کہ وہ میرے خاوند کی طبیعت سے واقف ہے اور میرے اس سے شادی نہ کرنے کا عوض وہ اس طریق سے لے گا کہ میری تصویر جو اس کے پاس ہے وہ میرے خاوند کو دکھا کر اس سے کہے گا کہ شادی سے پہلے __________" اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

مسعود کہہ اٹھا: "میں سمجھ گیا ہوں۔ تو کیا آپ کا خاوند اس قدر کمزور طبیعت کا ہے کہ اس پر اعتبار کر لے گا؟"

"میرا خاوند تو ایک بدگمان مرد ہے۔ آپ کے خیال میں کتنے مرد ہوں گے جو کیشو لال جیسے شخص کی ایسی بات کو باور نہ کر لیں۔"

مسعود سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کس لئے رائے بہادر کے مکان میں آیا تھا اور اپنی زندگی کے بڑے بڑے کارہائے نمایاں اس معاملہ کے مقابلہ میں ہیچ نظر آنے لگے، اسے ہمیشہ ذاتی مفاد مدنظر رہا کرتا تھا اور خود غرضی سے بہتر وہ کوئی چیز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن آج ان سب پر ایک نیا احساس غالب تھا۔ اس نے نہایت نرمی سے پوچھا: "کیا آپ کو علم ہے کہ کیشو لال نے اس تصویر کو کہاں رکھا ہے؟"

"لائبریری کے کمرے میں جو بڑی میز ہے اس کے داہنے طرف کے خانے میں۔ نہیں صاحب اس کا نکال لانا ناممکن ہے آپ بھی یہ کام نہیں کر سکتے۔"

مسعود نے جلدی جلدی سوچنا شروع کیا۔ کام بیشک بہت پُرخطر تھا۔ لائبریری میں پہونچنے کے لئے اسے تمام مہمانوں کے سامنے ہو کر جانا ہو گا۔ ممکن ہے کیشو لال خود دیکھ پائے یا اس سے کسی نوکر کو شبہ گزرے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا: "سامنے چمن میں جو بڑا سا شیشم کا درخت ہے وہ آپ نے دیکھا ہے؟ کھانے کے بعد آپ اس طرف نکل آئیے۔ اگر میں زندہ اور آزاد رہا تو وہاں موجود رہوں گا اور وہ تصویر میرے پاس ہو گی۔"

مسعود جب اگلی صبح کو اپنے صاف ستھرے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں جاگا تو اس کی نظر سب سے پہلے انگیٹھی پر گئی جہاں رات والی عکسی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر بڑھتی ہوئی حیرت کی لکیریں نمودار ہونے لگیں اور وہ خود بخود کہنے لگا: "اگر مشابہت اسی کو کہتے ہیں تو میری آنکھیں بہت کمزور واقع ہوئی ہیں۔"

عجیب بات تھی کہ رات وہ عورت شیشم کے درخت کے پاس نہ آئی اور تصویر لینے کا وعدہ پورا نہ کیا۔ مسعود وہاں گھنٹوں انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ سردی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اب تک اسکے بدن میں کہیں کہیں درد محسوس ہو رہا تھا۔ خدا جانے کن اسباب نے اسے روک لیا تھا۔ اس کے دل میں سینکڑوں خیال گزر رہے تھے کہ خدا معلوم اس بیچاری پر کیا گزری ہو گی۔ لیکن ایک بات یقینی تھی کہ جس راز کے افشا ہو جانے کا اسے خوف تھا وہ اب مسعود کے پاس محفوظ تھا۔ خوشی سے اس کے دل میں خون جوش کھانے لگا۔ اس کا بے نظیر حسن، اس کی مسکراہٹ

اور چلتے وقت اس کا ہاتھ ملانا اُسے اب یاد تھا۔ آخر کار اس نے اپنے خیالات کے سلسلہ کو ختم کیا اور اُٹھ کر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

شام سے کچھ پہلے وہ چورنگی روڈ پر ٹہلتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک لڑکا بہت سے اخبار بغل میں اور ایک پرچہ ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے خاص انداز میں پکارتا ہوا اس کے قریب سے بھاگتا چلا گیا۔ اخبار کا شوقین تو مسعود ہمیشہ سے تھا اس نے لڑکے کو واپس بلا کر اس سے پرچہ خریدا اور سڑک کے ایک طرف بنچ پر بیٹھ کر اس کے ورق اُلٹنے لگا۔ سب سے پہلے اس کی نظر موٹے موٹے حروف میں لکھے ہوئے ان الفاظ پر پڑی

کلکتہ کے ایک رئیس کے ہاں زبردست چوری

ایک عورت کی تلاش

مسعود جلدی جلدی پڑھتا چلا گیا۔ "قریباً ایک لاکھ روپے کے زیورات جاتے رہے۔ رائے بہادر کیشو مل کی بیوی کے سونے کے کمرے کی کمل صفائی"۔

اس کے آگے چند سطریں اور تھیں جو مسعود کو آتشیں حروف میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ "پولیس کو پتہ چل چکا ہے، وہ ایک عورت جینتا بائی عرف چاندرتی کی تلاش میں ہے۔ رائے بہادر کی عورتوں نے اس کی تصویر کو دیکھ کر پہچان لیا ہے کہ وہ مہمانوں میں موجود تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب سے اس قسم کی چوری میں وہ خاص طور پر ماہر ہے"۔

اخبار میں جینتا بائی عرف چاندرتی کی عکسی تصویر بھی پولیس سے حاصل کر کے چھاپ دی گئی تھی جو ہو بہو مسز سیٹھ پریم داس سے ملتی تھی۔ مسعود کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اور وہ اسی وقت اخبار کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن وہ اگلی چند سطریں پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔ آگے لکھا تھا کہ :-

"ایک بات کی وجہ پولیس کو نہیں معلوم ہوئی وہ یہ کہ رائے بہادر کی لائبریری میں میز کے اوپر کے دراز کو بھی توڑ دیا گیا ہے جس میں کوئی قیمتی چیز نہ تھی وہاں سے صرف ایک ایکٹریس کی عکسی تصویر غائب ہے جو بازار میں عام طور پر مل سکتی ہے"۔

مسعود جھلا کر بنچ پر سے اُٹھا اور اخبار کو پھینک کر اپنے اوپر لعنت ملامت کرتا ہوا گھر واپس آیا۔

عطاء الرحمٰن

چندراوتی

رات کو دو بجے مجھے فرصت ہوئی اور اخیر پروف شیٹ پاس کر کے میں نے اُوور کوٹ پہنا۔ ٹوپی چھڑی ہاتھ میں لی اور سگریٹ جلاتا ہوا مورننگ اسٹار کے دفتر سے گلی پر نکل آیا۔

یوں تو ۲۶ دسمبر کو کلکتہ میں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے لیکن میرے لئے یہ دن بہت انہماک کا تھا اور متحدہ مسلم کانفرنس کے جلسے میں (جو ایک تباہ ہونے والی قوم کے بداخلاقیوں کا بہترین نمونہ تھا) صبح کو تین گھنٹے کامل ضایع کرنے کے بعد واپس آیا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور چیف اڈیٹر کی آواز سُنائی دی۔

"احسن مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آج کل گھوڑ دوڑ میں وائسرائے کپ کے لئے شہریار کی کامیابی کے آثار اچھے ہیں لیکن چونکہ گھوڑا نیا ہے اور نہایت مخفی طور پر طیار کیا گیا ہے اس لئے نہ لوگوں کو حقیقت کا علم ہے اور نہ سر احسان الزماں کچھ بتاتے ہیں۔ تم تو ان کے پاس آتے جاتے ہو۔ اگر کچھ دریافت کر سکو تو کل گھوڑ دوڑ کی خبروں کے ساتھ اس کا اضافہ بہت دلچسپ ہوگا"۔ میں نے "دیکھئے کوشش کرتا ہوں" کہکر ٹیلیفون رکھدیا۔ کانفرنس کی رپورٹ ختم کر کے نیوز اڈیٹر کو دے آیا۔ اور ٹیکسی لیکر سیدھا زماں پیلیس پہونچا لیکن سر احسان بھی باہر جا چکے تھے اس لئے مجھے ناکامیاب واپس ہونا پڑا۔

میرے نوکر نے دروازہ کھولا۔ اور اُوور کوٹ۔ ٹوپی اور چھڑی لیکر آنکھیں ملتے ہوئے کہنے لگا۔ "حضور دو گھنٹے ہوئے سر احسان الزماں نے ٹیلیفون کیا تھا۔ فرمایا تھا کہ جب آپ واپس آئیں تو انھیں خبر کر دیجئے گا۔ وہ منتظر رہیں گے"۔ میں نے "اچھا" کہکر نشست کے کمرہ میں جاکر ٹیلیفون پر ۶۵ پارک، زماں پیلیس کا نمبر مانگا اور ایک لمحے میں سر احسان دوسری طرف بولتے ہوئے سنائی دئے۔

"جی ہاں، ابھی ابھی واپس،...... ہاں صبح حاضر ہوا...... شہریار کی کامیابی ...... حضور دعوت...... ضرور...... کیا فرمایا...... کل گیارہ بجے...... بہتر ضرور حاضر ہوں گا...... کیا فرمایا...... رانی چندراوتی...... نہیں ابھی تک تو...... آج صرف پیڈک کے قریب دیکھا تھا...... ضرور ضرور...... آپیرا ہاؤس...... ہاں ہاں...... ضرور حاضر ہوں گا...... شکریہ...... تسلیم"۔ ٹیلیفون رکھ کر میں دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ کل گیارہ بجے شب کو سر احسان الزماں نے مجھے شب کے کھانے پر بلایا تھا اور مہارانی چندراوتی

ان کی خاص مہمان ہونے کو تھیں۔ مہارانی صاحبہ کل اوپیرا ہاؤس میں نو بجے سے گانے والی تھیں اور اس کے بعد ڈنر میں مدعو تھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر سر احسان اور رانی چندراوتی کا کیا جوڑ۔ کہ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور مورننگ اسٹار کے چیف اڈیٹر کی آواز آئی۔ "احسن! دیر سے تمہارا نمبر مانگ رہا ہوں۔ لیکن جب جواب ملا "مشغول" اسی سوال کے آگے پنجاب میل ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی ہے چار بجے ریلیف ٹرین جائے گی۔ تم مہربانی کرکے تھوڑی دیر دم لیکر جوڑا پہنے چلے جاؤ۔ ابھی کسی اور اخبار کو خبر نہیں ہے" بہت بہتر کہکر میں نے ٹیلیفون پٹک دیا۔ کمبخت۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ ابھی تو تھکا ماندا گھر آیا تھا اور ابھی یہ حکم کہ پھر روانہ ہو جاؤ۔ اخبار کے نامہ نگاروں کی زندگی بھی اک عذاب ہوتی ہے۔

میں نے دوسرے دن دس بجے واپس آکر غسل کیا۔ خدمت گار نے "ڈنر سوٹ" پلنگ پر پھیلا دیا تھا۔ کپڑے بدل کر میں ٹھیک ہوا اوپیرا ہاؤس کو روانہ ہو گیا۔ راہ میں سوچنے لگا کہ آخر سر احسان الزماں جیسے معمر بیرسٹر نے جنگلی عورتوں سے نفرت ہر ایک کو معلوم تھی، مہارانی چندراوتی اور ان کے ساتھ اور بھی کئی عورتوں کو کیوں اپنے گھر بلایا تھا۔ جہاں تک مجھے علم تھا۔ سر احسان کی بیوی زندہ نہ تھیں اور آج تک انھوں نے عورت کی اپنے گھر دعوت نہ کی تھی۔ اور عموماً ایسے جلسوں اور ایسی دعوتوں میں کم جایا کرتے تھے جہاں عورتیں ہوتی تھیں پھر ابتدا ابھی ہوئی تو مہارانی چندراوتی سے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مہارانی صاحب وسط ہند کے ایک اوسط درجہ کی ریاست فتحپور کے راجہ کی بیوی تھیں۔ مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ مہاراجہ فتحپور کی چوتھی بیوی تھیں یا گیارھویں۔ مدت تک یہ حرم سرا میں ایک گمنام زندگی بسر کرتی رہیں۔ ان کے وجود کا مہاراجہ کے چند خاص ملازمین کے علاوہ کسی اور کو علم بھی نہ تھا۔ مہاراجہ فتحپور جب ایک وفد کے ساتھ انگلینڈ جانے لگے تو معیت کے لئے انھیں کا انتخاب ہوا اور ولایت پہونچکر مہارانی کا بے نقاب ہونا تھا کہ ان کے حسن و جمال کا شہرہ دور دور پہونچ گیا۔ اب تو جس اخبار اور جس میگزین کو اٹھاکر دیکھو ان کے حالات اور ان کی تصویروں سے بھرے نظر آتے تھے۔ کہیں مہارانی پوجا کر رہی ہیں تو کہیں ستار بجا رہی ہیں کہیں شیر کا شکار ہو رہا ہے تو کہیں نیزہ بازی کی مشق ہو رہی ہے۔

یوروپ پہونچ کر ان کا اور بھی شہرہ ہوگیا یہاں تک کہ جب وہ مونٹے کارلو پہونچی ہیں تو ان کی شہرت سے سارا یوروپ گونج رہا تھا۔

نیس اور مونٹے کارلو بحر روم کے کنارے دو ایسی جگہیں ہیں جہاں ساری دنیا کے دولتمند سیر و تفریح کے لئے جمع ہوتے ہیں جہاں دنیا کی حسین ترین عورتوں کا اجتماع ہوتا ہے اور جن میں سے ہر ایک لاکھوں کے زیور سے لدی ہوتی ہے لیکن اس حسین مجمع میں بھی مہارانی چندراوتی گل سرسبد کی طرح سب سے الگ نظر آتی تھی۔ اسی زمانہ میں روسی شاہی خاندان کے جواہرات بک رہے تھے اور یوروپ اور امریکہ کے کروڑپتی بڑھ بڑھ کے قیمت لگا رہے تھے مگر مہاراجہ فتحپور نے اتنے دام لگا دئے کہ امریکہ کے کروڑپتی تاجروں کے چھکے چھوٹ گئے اگر ان تاجروں نے مٹی کے تیل، سور کے گوشت، اور دیا سلائیاں

بناکر اور بیچکر دولت کمائی تھی تو فتحپور کے مہاراجہ نے سیکڑوں برس کے جمع کئے ہوئے خزانے ترکے میں پائے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس ایک خریداری کے بعد فتحپور میں ملازمین کو کئی مہینے تنخواہ نہ ملی۔ بہت سی کمپنیوں کے بل ادا نہ ہو سکے رعایا پر ٹیکس دو چند ہو گیا اور پھر بھی مہاراجہ کو نجی کی جائیداد کا نصف حصہ رہن کر دینا پڑا۔

جب مہارانی صاحبہ لندن پہونچیں تو ڈورچسٹر ہوٹل کے ان کمروں میں اتریں جن میں یا تو چارلی چپلین، ڈگلس فیربنک، میری پکفورڈ جیسی ہستیاں قیام کرتی ہیں یا سابق شاہ اسپین اور سابق شاہ ایران جیسے ہیکر اور آزاد بادشاہ ٹھیرا کرتے تھے۔ خاصہ کے کمروں کے علاوہ۔ احباب۔ مصاحبین اور ملازمین کے لئے مہاراجہ نے کارلٹن ہوٹل کی پوری کی ایک منزل کرایہ پر لے رکھی تھی۔ لندن کے انتہائی رونق اور چہل پہل کا زمانہ تھا شہزادی میرینہ شادی کے بعد پہلے پہل مالا بار ہاؤس میں مقیم ہو کر سوسائٹی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ دن کو قصر بکنگھم یا رانالے میں پولو کے شاندار میچ ہوا کرتے تھے ایسکٹ کی گھوڑدوڑ اور ہنلے کی کشتی رانی میں جانا ضرور تھا۔ شب کو دعوتیں تھیں اور پھر رقص کے جلسے۔ تھیٹر تھے اور ان کے بعد نائیٹ کلب میں صبح کے چار پانچ بجے تک جام شراب کے دور اور مستانہ وار ناچ۔ سارا لندن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور ہر جلسہ اور ہر تقریب میں مہارانی موجود رہتی تھیں۔

ایک شب جرمن سفارت میں کھانا تھا۔ کسی بات پر مہاراجہ فتحپور اور کونٹ موسکو وچ۔ روس کے قدیمی شاہی خاندان کے ایک رکن سے کچھ بحث ہو گئی۔ مہاراجہ نے کچھ سخت کہا اور کونٹ نے شراب کا گلاس ان کے منہ پر کھینچ مارا دوسری شب کو ریجنٹ پارک میں پوشیدگی سے کونٹ اور مہاراجہ میں (ڈوئیل) جنگ ہوئی۔ اور دونوں ایک دوسرے کی گولی کھاکر گرے اور مرگئے۔

فتحپور میں مہاراجہ کمار کی نابالغی کی وجہ سے ریجنسی قایم ہو گئی، ریاست کا انتظام مجلس انتظامیہ کے سپرد ہو گیا جس کے صدر ایک انگریز مقرر ہوئے۔ اخراجات میں کمی ہونے لگی۔ دوڑ کے گھوڑے۔ کتے اور موٹریں نیلام ہونے لگیں، زاید ملازم برخاست کر دئے گئے۔ مہارانیوں کے گزارے کے لئے مختصر سی تنخواہیں مقرر ہو گئیں۔ اور ایسی عورتیں جنھیں مہاراجہ نے شادی بغیر محل میں ڈال رکھا تھا کچھ دے دلاکر ریاست سے نکال دی گئیں، چندراوتی کا بھی یہی حشر ہوا۔ ریاست کے جواہرات فوراً وزیر ہند کے حکم سے چھین لئے گئے اور چند ہی دنوں میں یہ غریب عسرت کی زندگی بسر کرنے لگی، مگر مہاراجہ اور کونٹ کی موت نے ان کو کافی شہرت دیدی تھی۔ ہر اخبار اور ہر میگزین میں ان کے حالات اور ان کی تصویریں چھپتی تھیں۔ اخبار والوں نے ہزاروں روپے دیکر من گھڑت افسانے اور خیالی قصے ان کے ناموں سے چھاپے۔ صابن، کریم اور "ہرمہ مستی" والوں نے بھی بڑی رقمیں خرچ کرکے سندیں حاصل کیں۔ ناگن کے سے لہراتے ہوئے بالوں اور موتی کے سے صاف دانتوں کی تصویریں لی گئیں، لیکن وہ عورت جس نے ہزاروں۔ لاکھوں اپنی ادنیٰ ادنیٰ خواہش پر لٹائے ہوں۔ جس نے اپنی آرایش اور آرام پر دولت پانی کی طرح بہائی ہو وہ کب تک اس طرح کی بے مزہ زندگی بسر

کر سکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں رولینڈ لاسکی جو امریکہ اور یورپ کے کئی بڑے بڑے تھیٹروں کا مالک تھا اپنے خاص ہوائی جہاز پر لندن آیا۔ اور ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کرکے دو سال کے لئے ان سے معاہدہ کرا لیا کہ ہفتہ میں دو روز مہارانی اسٹیج پر جا کر ناچیں اور گائیں گی۔

اخباری تشہیر بھی وہ جادو ہے کہ معاذ اللہ۔ اب تو جس شہر میں مہارانی گانے والی ہوتیں وہاں ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے سے شہر کے ہر مشہور اور ممتاز مقام پر ان کی قد آدم تصویروں کے اشتہار ہوتے۔ کہیں پر ان کی ہندوستانی زندگی کا منظر ہوتا کہیں یورپ کے سفر کے مرقعے اور کہیں مہاراجہ اور گورنمنٹ سے گلے ملتی دکھائی جاتی۔ غرض اشتہار کے ذریعہ سے لوگوں میں ایک خاص ہیجان اور بیچینی پیدا کی جاتی۔ ہفتوں پہلے سے شہر کے لوگ سوائے اس کے کسی اور مضمون پر گفتگو ہی نہ کرتے تھے۔ مہارانی کے آنے سے بہت پہلے تھیٹر کے کل ٹکٹ بک چکے ہوتے۔ قبل سے کسی ایک جگہ دو ایک دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ظاہر نہ کیا جاتا۔ لیکن اگر پبلک میں مزید شوق دیکھا جاتا تو دو ایک دن اور بھی ٹھہر جاتیں۔ ایک کے بدلے دو تین تماشے ہوتے۔ ٹکٹ کے دام دوگنے تگنے کر دئے جاتے۔ الغرض لاسکی نے مہارانی کے ذریعہ سے اور مہارانی نے لاسکی کے ذریعہ سے کافی دولت حاصل کی۔

دو برس کے بعد جب لاسکی کے معاہدہ کی مدت ختم ہوئی تو امریکہ اور یوروپ کے تھیٹر والوں میں لاگ ہو گئی۔ لیکن چندراوتی نے چونکہ اتنے دنوں میں اچھی طرح دنیا دیکھ لی تھی اور وہ اپنے حسن کی جادوگری اور اپنی جوانی کی مقناطیسی قوت سے آگاہ تھیں اس لئے خود انھوں نے براہ راست اپنا کاروبار شروع کیا۔ اور خود اپنے انتظام سے رقص و جمال کے تماشے دکھانے لگیں۔ مغربی رئیسوں کو بھی آنے جانے کا موقع دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہُن برسنے لگا اور دولت کی انتہا نہ رہی، پانچ سال تک مہارانی یوروپ، امریکہ، جاپان اور چین کے دورے کرتی ہوئی ہندوستان آئیں اور بمبئی میں صرف ایک شب گانے کے بعد آج کلکتہ کے آپیرا ہاؤس میں وائسرائے اور امرائے ہند کے سامنے نغمہ زن ہونے والی تھیں۔

میں انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا آپیرا ہاؤس پہونچ گیا۔ سامنے فوج کا پہرہ تھا۔ مورننگ اسٹار کے نامہ نگار ہونے کی وجہ سے مجھے ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہال میں رستم جی منیجر ملے اور انھیں کے ساتھ میں بھی ایک کونے میں حاضر ہو گیا۔ سارا تھیٹر جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔ وائسرائے اور گورنر کے علاوہ بہت سے امراء جمع تھے اسٹیج پر مہارانی گا رہی تھیں، ہندوستان کا ہر راجہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ ان کی وردیاں زرق برق تھیں ان کے آگے بیس پچیس حسین کمسن عورتوں کا مجمع تھا اور ان کے جھرمٹ میں مہارانی ناچ ناچ کر اور بھاؤ بتا بتا کر گا رہی تھیں ان کے لباس اور ان کے زیورات کا حال بیان کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ گو ریاست فتحپور کے دئے ہوئے جواہرات چھن چکے تھے لیکن فتحپور جیسے بیسوں والیان ریاست اور مغربی لارڈ اور کروڑپتی تاجروں کے دئے ہوئے جواہرات مہارانی

کے جسم پر چمک رہے تھے۔ ان کا حسن اب بھی باقی تھا۔ جسم میں ابھی تک چھریرا پن موجود تھا اور انداز رعنائی میں ابھی تک جادو بھرا تھا۔ مالکوس گا رہی تھیں اور اس پانچ سروں کی راگنی میں وہ باتیں پیدا کر رہی تھیں کہ انگریز بھی سر دھن رہے تھے اور لیڈیاں بھی موسیقی سے متاثر ہو کر پاؤں پٹک رہی تھیں۔ مالکوس کے بعد ایک انگریزی گانا شروع ہوا جو دادرے کے طرز پر بندھا ہوا تھا اس کے ساتھ کہروا ناچ نے مجمع کے ہر فرد کو آپے سے باہر کر دیا تھا۔ سب ساز بند تھے صرف مراد علی پٹنہ والے کی سارنگی بج رہی تھی۔ ان کا جے پوری صافہ، گلابی کمخواب کی شیروانی اور گلے میں موتی طلائی زنجیر سازندوں میں انھیں ممتاز بنائے ہوئے تھی ان کے سیاہ گھنگھریالے بال اور گھنی مونچھ اور پھر تان کی ہر لپیٹ اور تاروں پر انگلیوں کی ہر حرکت کے ساتھ ان کے سر کا ہلنا اور ہر گن اور مرکی پر ان کے منہ کا بننا بگڑنا بہت پر لطف منظر تھا۔ میاں ریاضی بھی آہستہ آہستہ ٹھیکا دئے جا رہے تھے۔ اور جب بایاں دہنے لگتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑا کبوتر بول رہا ہے اور دل میں ایک خاص گدگدی سی معلوم ہوتی تھی۔ غضب کا سماں تھا۔ رقص کے اختتام پر ہنگامہ تالیوں کا شور ہوا۔ مہارانی ایک عجیب انداز دلربائی سے سر جھکائے کھڑی رہنے کے بعد اسٹیج سے اتر کر وائسرائے کے سامنے گئیں جنھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ مبارکباد دی اور پھر رخصت ہوئے۔ بھیڑ چھٹنے سے پہلے ہی میں باہر نکل آیا اور ٹیکسی لیکر زمان پیلیس پہونچا۔

زمان پیلیس دولہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ باغ کے ہر ہر درخت کی ڈالیوں اور روش کے کنارے کنارے جا بجا بجلی کے قمقمے روشن تھے سر احسان مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ میرے پہونچتے ہی مہارانی چندراوتی بھی بہت بڑی ہسپانو سوئزا۔ سو ہارس پاور کی موٹر پر تشریف لائیں۔ یہ گاڑی انھوں نے خاص اپنی فرمائش سے بنوائی تھی اور خالص چاندی کی تھی دروازوں کے دستے سونے کے تھے۔ اس گاڑی کی تصویریں میں کئی بار دیکھ چکا تھا مگر اس وقت جا کے دیکھنے کا موقع ملا تو میں حیران رہ گیا۔

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو تمام مہمان جمع تھے جن میں سر جیمس فریزر چیف جسٹس، سر چارلس فرگوسن پولیس کمشنر، جنرل سر ہنری اسٹوارٹ بنگال کی فوجوں کے افسر اعلیٰ، جسٹس کمار ناتھ بنرجی وائس چانسلر، نواب محسن علی آف برایچ پور، کرنل چاسلر پرنسپل میڈیکل کالج، راجہ سر نرد ناتھ سین صدر مجلس سوتا وانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میرے والد سر احسان الزماں کے منشی تھے اور ان کے انتقال کے بعد سر احسان ہی نے مجھے تعلیم دلوائی تھی۔ کیمبرج بھیجا تھا۔ صحافت کی تعلیم دلوائی تھی اور انھیں کی سفارش سے مورننگ اسٹار جیسے معزز انگریزی اخبار کا نامہ نگار ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے اور مجھے پیلیس کی ہر دعوت اور ہر تقریب میں بلایا کرتے تھے۔

زمان پیلیس کا ڈرائنگ روم کلکتہ کا سب سے عمدہ اور آراستہ کمرہ تھا یورپ کے متعدد رسالوں میں اس کے فوٹو نکل چکے تھے اس کمرہ کی قلمی تصویریں۔ اس کے ایرانی قالین۔ سیکڑوں برس کے قدیم چینی کے گلدان اور کھانے کی ہاتھی دا

کے مجسمے اور سامان آرائش ایسی چیزیں تھیں جو دنیا میں نایاب تھیں اور جنھیں دیکھے بغیر کوئی امریکن سیاح کلکتہ سے واپس نہیں جاتا تھا۔

مہارانی کے کرہ میں داخل ہوتے ہی دوسرے مہمانوں نے ان کے گرد جھرمٹ کر لیا۔ سر احسان نے ایک ایک تعارف کرایا اور سبھوں نے اپنی خوش قسمتی کا اظہار کیا۔ مہارانی کی اعلیٰ موسیقی اور بہترین رقص کا ہر شخص معترف تھا اور ہر شخص کی زبان سے واہ واہ اور سبحان اللہ نکل رہا تھا۔ خادم نے مودب لفظوں میں خاصہ چنے جانے کی اطلاع کی۔ سر احسان نے مہارانی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور وہ مسکراتی ہوئی ان کے بازو پر سہارا دیکر کھانے کے کرہ کی طرف بڑھیں۔ چھپی ہوئی فہرست ہم سبھوں کو پہلے ہی مل چکی تھی جس میں میز کے گرد ہر ایک کی مخصوص جگہ بنی ہوئی تھی اور ایک ساتھ جانے والے مرد و عورت کے نام لکھے تھے۔ ہر ایک اپنی لیڈی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر پیچھے ہو لیا۔ میں راجہ کمار ناتھ کے ساتھ سبھوں کے عقب میں تھا

نان ہلیس کے کھانے کے کرہ کے بلوریں میز اور بلوریں کرسیاں بوہیمیا کے شاہی محل کی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد جب اس خاندان سے تخت چھن گیا اور شاہزادے آوارہ وطن ہو گئے تو سر احسان نے ایک ایجنٹ کے ذریعہ سے اسے ایک کثیر رقم دیکر حاصل کیا تھا۔ دور سے انگریزی باجوں کی دلکش آواز آنے لگی اور کھانا شروع ہوا۔ ہر شخص ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا لیکن سبھوں کی نظر مہارانی کی طرف تھی اور سب انھیں کی باتیں سننے کے مشتاق تھے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد سر احسان کھڑے ہو گئے گفتگو بند ہو گئی اور ہر شخص ان کی طرف مخاطب ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ سر احسان نے آہستہ آہستہ رک رک کر اپنی تقریر شروع کی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کسی جذبہ کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور وہ رہ رہ کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے جا رہے تھے۔

"میرے معزز دوستو۔ یہ کوئی سیاسی مجمع تو ہے نہیں۔ صرف میرے چند خاص احباب کی صحبت ہے۔ جنھوں نے میری ناچیز دعوت قبول کر کے مجھے ممنون ہونے کا موقع دیا ہے۔ آج میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں مجھے زیبا ہے۔ کیونکہ فخر جہاں۔ بلبل ہندوستان مہارانی چندراوتی صاحبہ نے میرے گھر آکر مجھے دنیا کا سب سے خوش قسمت شخص بنا دیا ہے

حضرات۔ آپ میں سے کون ایسا ہے جو برسوں سے مہارانی کے دیکھنے کا متمنی نہ تھا اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے مہارانی کی جو تصویر ہم نے اپنے دلوں میں کھینچی تھی۔ اس سے انھیں کہیں بڑھ کر پایا۔

دوستو۔ آخر جادو ہے کیا؟ جادو نام ہے حسن کا۔ آواز کا اور دولت کا اور اگر دنیا اور آجکل کی روشن خیال اور ترقی یافتہ دنیا میں کوئی سچا جادوگر ہے۔ یہ کیوں نہ کہوں کہ مجسم جادو ہے تو وہ ہماری مہارانی صاحبہ ہیں انکا دلربا حسن و جمال۔ انکا دلکش ترنم۔ ان کی بے پایاں دولت اگر جادو نہیں تو کیا ہے۔ (تحسین کے پرزور نعروں اور تالیوں کی گونج ہوئی

تالیوں نے اس مدح سرائی کی تائید کی مہارانی شرم سے سر جھکائے اپنی انگوٹھیوں سے کھیل رہی تھیں۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا)۔

"حضرات۔ میں ڈرتا ہوں کہ آپ نے ان جملوں کو شاعرانہ تخئیل سمجھا ہو۔ مگر مجھے بتائیے کہ ہندوستان میں زہرہ بائی اور بی حیدر سے لیکر بی گوہر اور بی نور جہاں تک اور کالکا بندادین سے بی چودھرائن بیگم کون ایسا تھا اور ہے جس کے رقص و سرود میں وہ اثر ہو جو مہارانی کے ناچ گانے میں ہے۔ اور یورپ میں مادام پاولووا اور مادام لاپاکووا۔ طرازینی اور گیلی کرسی یا ڈیم کلارا بٹ ان میں سے کون ہے جو ہماری مہارانی کا مقابلہ کر سکے۔ نہیں۔ دوستو میں سچ کہتا ہوں کہ مہارانی کے کمال پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے بجا ہے اور مغربی مہذب قومیں ان کی جتنی عزت کریں کم ہے (تحسین کا شور)

سر احسان اتنا کہکر خاموش ہو گئے۔ پانی کا ایک گھونٹ پیکر چہرہ کا پسینہ پونچھا اور اب جو اپنی تقریر کا سلسلہ شروع کیا تو بہت دھیمی آواز میں اور اس طرح جیسے اپنی کسی بات پر نادم ہوں۔

"لیکن میرے دوستو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ مجھ جیسے زاہد خشک کو رقص و سرود سے کیا تعلق۔ تو سنئے آج میں اپنے اس راز کو ظاہر کرتا ہوں جو آج پندرہ سال سے میرے دل میں پنہاں ہے اور اس وقت میں اس مہر کو توڑنے کھڑا ہوا ہوں جو میرے لبوں پر ایک مدت سے لگی ہوئی ہے۔"

اتنا کہکر سر احسان بیٹھ گئے اور سارے مہمان کسی غیر معمولی اثر سے متاثر ہوکر ان کی طرف جھک گئے۔ میں نے دیکھا کہ مہارانی گھبرا گھبرا کر متاثر ہوکر ان کی طرف دیکھتی اور کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن چپ رہ جاتی تھیں انکا گلاب سا چہرہ افسردہ ہو گیا تھا۔ اور پیشانی پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ سر احسان نے پانی کا پھر ایک گھونٹ پیا اور بیٹھے ہی بیٹھے اپنا شروع کیا۔ کمرہ میں سناٹا تھا ہماری سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ خادم کمرہ سے باہر چلے گئے تھے۔

"دوستو۔ آج سے پندرہ سال قبل میں شہر گیا میں ضلع کا ایک معمولی بیرسٹر تھا۔ چھوٹی جگہ تھی۔ وکیلوں کا زور تھا میرا اپنا آبائی مکان تھا مختصر سی جائیداد بھی تھی۔ سادہ زندگی تھی۔ خوشی کے ساتھ سفید پوشی سے کٹی جاتی تھی۔ میری شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ لیکن میری بیوی کا شادی کے دو سال بعد انتقال ہو گیا تھا۔ صرف ایک لڑکا تھا" سر احسان کچھ دیر کے لئے پھر چپ ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ مہارانی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا سانس چڑھ رہی تھی اور آنکھوں سے خوف کی جھلک نمودار تھی۔ سر احسان کی آواز اور بھی دھیمی تھی اور گویا وہ ہمارے سوا کسی دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے یا اپنے دل سے بول رہے تھے۔

"میرے بچّے نے میری ماں باپ کے ساتھ پٹنہ میں پرورش پائی تھی۔ وہیں پڑھ بھی رہا تھا۔ صرف چھٹیوں میں میرے پاس چلا آیا کرتا تھا۔ اب جوانی کا آغاز تھا مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بی۔ اے کا امتحان دیکر میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اسکی دلبستگی کے لئے گراموفون منگا دیا تھا۔ ناول خرید دئے تھے۔ گھوڑا لے دیا تھا۔ غرض اس کی دلبستگی میں ہر طرح کوشاں تھا

اور اس ... اپنی جان فدا کرنے کو ہر طرح موجود تھا۔ اس وقت یہ اپنی ماں سے بہت مشابہ تھا۔ اور جب میں اسے دیکھتا تھا تو اس کی ماں کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔" (باوجود ضبط سر احسان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور ہر شخص ان کی یہ حالت دیکھ کر متاسف تھا)

"ایک روز میں ایک سنگین مقدمہ میں مشورہ کے لئے کہیں گیا ہوا تھا۔ دیر ہو گئی۔ رات کے بارہ بجے واپس آیا۔ اور سوتے دو بجے ہوں گے کہ ایک جگر خراش چیخ کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ دوسری بار پھر چیخ کی آواز آئی اور بیقراری کے ساتھ تڑپ کر میں مکان کے اس طرف دوڑا جہاں میرا بچہ سویا کرتا تھا۔ لالٹین دھیمی جل رہی تھی۔ میں نے قریب پہونچکر دیکھا کہ میرا بچہ پلنگ کے کنارے بیٹھا دونوں ہاتھوں سے کلیجہ کو سنبھالے جھکا ہوا خون تھوک رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بیقراری اور بیتابی سے ایک دل ہلا دینے والے کرب کے ساتھ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اُسے سینے سے لگالیا۔ اس کی حالت پوچھی اور اس نے رک رک کر ہچکیاں لے لے کر اپنا دکھ سنایا۔ میں نے خادم کو جگایا۔ ڈاکٹر کے گھر بھیجا۔ مگر بھلا دو بجے رات کو ڈاکٹر جلدی کیا آسکتے تھے دیر ہوئی۔ میں سر پیٹتا رہ گیا۔ اور میرے بچے نے میری گود میں تڑپ کر جان دیدی۔"

(سر احسان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے)

"دوستو۔ اب میرے لئے کیا باقی رہ گیا تھا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی اور زندگی برباد۔ ایک مدت تک میری حالت دیوانوں کی سی رہی۔ صحت [illegible] ہو گیا۔ تبدیل آب و ہوا کے لئے یورپ چلا گیا۔ ڈیڑھ سال کے بعد جب گھر واپس آیا تو پھر ہر کونے میں [illegible] بچہ نظر آنے لگے۔ رہ رہ کر جگر خراش چیخ کی آواز سنائی دینے لگی۔ گھر کاٹنے کو آتا تھا۔ میں نے اسے بیچ کر اونی قیمت [illegible] اور کلکتہ آکر پریکٹس شروع کی۔ خدا نے میری زبان میں اثر دیا۔ کام اچھا چلنے لگا۔ مقدمات نکلنے لگے اور دو تین سال ہی [illegible] نامی بیرسٹر ہو گیا۔"

[illegible] میری داستان ختم ہو گئی۔ مگر گو میں سر احسان کی تقریر کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ مگر میری نظر مہارانی کے چہرہ پر تھی۔ ایک عجیب انتشار اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ سر احسان نے پھر شروع کیا۔

"حضرات [illegible] منتظر ہوں گے کہ آخر میرے بچے کو ہو کیا گیا تھا

"میرے [illegible] میرا مکان اس سڑک پر تھا جو چوک کے پشت پر واقع ہے۔ میرے مکان کے سامنے [illegible] ایک طوائف رہتی تھی اور اس کی ایک لڑکی تھی تارہ ...." سر احسان کی زبان سے یہ نام نکلا ہی تھا کہ مہارانی کے منہ سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی" "نواب صاحب ......" شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن سر احسان نے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔

"دوستو۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا تھا۔ تارہ ان دنوں جوان ہو رہی تھی اس کے حسن کے چرچے ہونے لگے تھے۔

ذہین اور طبیعت دار تھی۔ اچھا گانے لگی تھی۔ مجرے شروع ہو گئے تھے اور دو ایک ریاستوں میں بھی ہو آئی تھی میرا بچہ اپنے شباب کے آغاز میں اس پر عاشق ہو گیا۔ وہ مجھ سے چھپ چھپ کر اس کے گھر جانے لگا۔ مگر اس کے گھر [illegible] کسی راجہ کا ملازم آیا ہوا تھا۔ تارہ کی ماں نے اسے آنے جانے سے منع کیا۔ مجھے مطلع کر دینے کی دھمکی دی۔ مگر کمسن بچہ اور وہ بھی پہلا عشق۔ تارہ بھی اس کی طرف ملتفت تھی۔ آخر ایک دن ماں بیٹی میں بحث ہو گئی۔ ماں نے عشق کی آزمائش کے لئے تارہ سے فرمائش کی کہ وہ میرے بچے کو شراب پلائے۔ دوسری رات جب میرا بچہ گیا تو تارہ نے شراب بڑھائی اس نے انکار کیا لیکن جب تارہ نے یہ کہا کہ ماں نے عشق کی یہی آزمائش رکھی ہے تو اس نے پی لی۔ دوستو۔ ممکن ہے کہ تارہ کو نہ معلوم ہو کہ اس شراب میں کیا ملا تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس شراب نے چند گھنٹوں میں مجھ سے میرے جگر کے ٹکڑے کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کر دیا۔"

"دوستو۔ دم توڑتے ہوئے بچے نے مجھ سے دو وعدے لئے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس کی اس طرح کی موت کی کسی کو خبر نہ دوں گا۔ میرا بچہ بڑا غیور تھا اسے عزت کا بڑا خیال تھا۔ اور مرتے وقت بھی یہی خیال تھا کہ خاندان کے نام پر دھبہ نہ لگے اور دوسری یہ فرمائش تھی کہ میں اپنی بیوی کے زیورات تارہ کو دیدوں کیونکہ وہ تارہ سے اسکا وعدہ کر چکا تھا۔"

"میرے عزیز دوستو۔ پہلی فرمائش میں نے آج تک پوری کی۔ لیکن دوسری فرمائش کے لئے جب میں نے یورپ سے واپس آکر سنا اور تارہ کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں اس کے مرتے ہی شہر سے کہیں اور مقام پر چلی گئی تھیں۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر پتہ نہ چلا۔"

(سر احسان پھر چپ ہو گئے۔ اور میں نے دیکھا کہ چیف جسٹس اور پولیس کمشنر متوحش نظر آرہے تھے)

"دوستو۔ میری داستان ختم ہو گئی۔ صرف چند کلمے اور ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے میں ایک مقدمہ میں بمبئی گیا ہوا تھا وہاں ایک رات جی گھبرایا تو تھیٹر چلا گیا۔ مگر آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے دیکھا کہ وہی تارہ اسٹیج پر کھڑی گا رہی تھی۔ مزید احتیاط کے لئے میں نے اپنا کارڈ بھیجا اور ان کے ڈریسنگ روم میں ان سے ملاقات کی۔ یہ مجھے بالکل پہچان نہ سکی کیونکہ میرا نام بدلا ہوا تھا پہلے داڑھی نہ تھی اور اب سفید داڑھی ہے۔ بہرحال مجھے یقین ہو گیا کہ تارہ یہی ہے۔ حضرات میں اتنی مدت کے بعد آج اپنے بیٹے کی قاتلہ سے بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ دل میں ہزاروں طرح کے جذبے پیدا ہو رہے تھے۔ بچے کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔ خون کے دھبے ہر طرف نظر آرہے تھے۔ تارہ کا گلا گھونٹنے کو بیقرار ہو رہا تھا ...." ابھی سر احسان نے اپنا جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ مہارانی غش کر گئیں۔ ہم سب ان کی طرف دوڑے۔ مگر سر احسان نے ہمیں اپنے اپنے مقام پر بیٹھے رہنے کو کہا۔

"دوستو۔ کیا اب اس کے کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ تارہ کون تھی۔ آپ کی اور ہماری مہارانی 'چندراوتی'۔"

ہم سبھوں کا حیرت سے عجیب عالم تھا۔ "کہاں فتحپور کی مہارانی اور کہاں گیا کی ایک طوائف۔"

جہاں آرا فرش سے چونک رہی تھیں، "سر احسان، نواب صاحب رحم، خدا جانتا ہے میں ذرہ برابر واقف نہ تھی۔ میری ماں نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا۔"

سر احسان نے مسکرا کر کہا۔ "بیوی۔ ہرچند مجھے آپ کے بیقصور ہونے کا یقین ہے مگر میں پھر بھی آپ کا دیکھنا گوارا نہ کرتا اگر مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا نہ ہوتا۔"

سر احسان نے اُٹھ کر گھنٹی بجائی۔ اور ایک بڈھا خادم لکڑی کا ایک بڑا سا صندوقچہ لے آیا۔ سر احسان نے اُسے کھول کر چاندی سونے کے معمولی معمولی پرانے اور میلے زیور نکالے اور ایک ایک کرکے جہاں آرا کو پہنانے لگے۔ ہم سب ساکت متحیر بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ جہاں آرا کی خوفزدہ آنکھیں سر احسان کے ہاتھوں کی ہر گردش کو گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھیں۔ جہاں آرا کے جسم پر قیمتی جواہرات کے ساتھ یہ بھدے گہنے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے۔

سر احسان کے گھنٹی بجانے پر اسی بڈھے خادم نے الماری کھول کر شراب کی ایک بوتل نکالی اور سر احسان کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ سر احسان نے اپنا گلاس بھر لیا اور کھڑے ہو کر کہنے لگے:

"میرے معزز دوستو۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ اتنی دیر تک میری پر غم داستان سنتے رہے۔ مگر آج کی صحبت غنیمت تھی اور مجھے آپ کو اس کا شاہد بنانا تھا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ رہ گیا جہاں آرا چندراوتی کا فیصلہ؛ وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب مجھے دُنیا میں زندہ رہنے کی ضرورت نہیں" یہ کہکر سر احسان نے ہماری طرف سر تسلیم خم کیا اور اپنے گلاس کی شراب دفعتہً پی گئے۔ اور ساتھ ہی جھوم کر گر پڑے۔ کرنیل چانسلر نے دوڑ کر ان کی نبض ہاتھ میں لے لی۔ مگر طائر روح جسم سے پرواز کر چکی تھی۔ ہم سب پریشانی کے عالم میں سر احسان کے گرد کھڑے تھے کہ جہاں آرا بھی چیخ کر گریں۔ چیف جسٹس نے دوڑ کر سنبھالا۔ مگر وہ بھی دم توڑ رہی تھیں اور زہر آلود شراب کی باقی نصف بوتل بھی خالی ہو چکی تھی۔

سید علی اکبر کاظمی۔ بی۔ اے (کشمیری)

مصور کا ناتمام شاہکار

(۱)

نواب جمشید یار کی کوٹھی عین دریائے جمن کے کنارے تھی۔ ایک طرف تاج اور دوسری طرف جمنا کی چاندنی آنکھ کی فرحت اور دل کی سرور کے لئے کافی سامان تھا ــــ نواب صاحب نے اس قطعہ کو صرف اسی نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے خرید لیا تھا۔ میں جس کمرہ میں ٹھیرایا گیا تھا وہ وسعت کے لحاظ سے گو مختصر تھا مگر میری ضروریات کے لئے بالکل کافی تھا۔

نواب صاحب کے ملازم نے بتایا تھا کہ یہ کمرہ خود نواب صاحب کی پرائیویٹ نشست گاہ کا کام دیتا تھا اس وجہ سے اسے بہ نسبت دیگر کمروں کے زیادہ سجایا گیا تھا۔ عمدہ فرنیچر قیمتی سازو سامان اور دلکش آرائشی تصاویر سے کمرہ کی تزئین کی گئی تھی۔

کمرہ کے اردگرد کھلی الماریاں رکھی ہوئی تھیں جن میں بیش قیمت کتابیں، قلمی دستاویزات و مکاتیب، رسالوں اور اخباروں کے فائل قرینے سے سلسلہ وار رکھے ہوئے تھے۔ ہر الماری کے تختہ پر اس کی فہرست چسپاں تھی، چنانچہ مجھے یہ معلوم کرنے میں مطلق دقت نہ ہوئی کہ نواب صاحب کی تاریخی کتابیں کس الماری میں رکھی تھیں اور اس کی فہرست کن کن کتابوں پر مشتمل تھی۔

نواب صاحب اپنے داماد شہریار بہادر کے ہمراہ شکار پر گئے ہوئے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے دولتکدہ پر ان کی عدم موجودگی میں حاضر ہوا تھا لیکن ان کے خوش خلق ملازم جانتے تھے کہ میں ان کا عزیز ترین دوست ہوں اسلئے کوٹھی میں میری آمد کی خبر فوراً پھیل گئی اور ہر ایک نے مجھے گرمجوشی سے لبیک کہا پھر نہایت پُر تکلف کھانے کے بعد مجھے باعزاز اس کمرہ میں پہونچا دیا گیا جہاں کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

رات ہو چکی تھی مگر نہ معلوم دس بجے جانے کے بعد بھی مجھے کیوں نیند نہ آئی اس وجہ سے ارادہ کیا کہ بجائے پلنگ پر لیٹے لیٹے وقت ضائع کرنے کے کچھ دیر مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ غنودگی پیدا ہو جائے اس خیال سے پلنگ پر سے اُٹھا اور تاریخ کی الماری کے قریب پہونچ کر ایک کتاب منتخب کی اور واپس آکر پڑھنا شروع کر دیا۔

"ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا زوال" میرے لئے ایک دلچسپ موضوع کا باعث ہوئی، اور میں اس کے متعدد صفحات پڑھ کر بیحد مسرور ہوا۔ میری عادت ہے کہ دوران مطالعہ میں ہر پیراگراف کے بعد نظر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہوں تاکہ نگاہ کو آرام ملے۔ حسبِ عادت میں اس عمل کو کئی بار کر چکا تھا کہ ایک دفعہ میری نظر کتاب پر سے ہٹ کر ایک بیضوی تصویر پر پڑی جو میرے پلنگ کے عین مقابل دیوار کے وسط میں لٹک رہی تھی اور جسے اس وقت تک میں نے نہ دیکھا تھا۔

(۲)

سبز جھالر کے برقی فانوس سے ہلکی روشنی صرف میری کتاب پر پڑ رہی تھی اور کمرہ کا وہ حصہ جس میں تصویر لٹک رہی تھی گو کامل تاریکی میں تو نہ تھا مگر پھر بھی جھالر میں سے چھن چھن کر کچھ روشنی اس پر پڑ رہی تھی جونہی میری نظر تصویر پر جا کر ٹھیری میں نے ہاتھ سے کتاب رکھدی اور غور سے تصویر دیکھنے لگا تصویر ایک نوجوان حسین لڑکی کی تھی۔

تصویر کینوس (Canvas) پر بنی ہوئی تھی۔ صاحبِ تصویر کا چہرہ گردن، شانہ اور نصف سینہ دکھایا گیا تھا۔ بازو اور لمبے لمبے بال تاریک "فضائے بعید" (Land Scape) میں غیر محسوس طریقے سے جذب کر دئے گئے تھے۔ اور یہی وہ صنعت تھی جو تصویر کو جاذبِ توجہ بنا دیتی تھی۔ تصویر کا فریم بیضوی تھا اور نہایت قیمتی مطلا نقش و نگار سے مزین۔

مصوری میں معمولی شُدبُد کے سوا مجھے اور کچھ لگاؤ نہ تھا مگر اس تصویر کی ظاہری کشش اور رنگوں کی آمیزش آنکھوں میں کچھ اس طرح کھُپی جا رہی تھی کہ بے اختیار جی چاہا کہ اسے قریب سے جا کر دیکھوں۔

چنانچہ میں پلنگ پر سے اُٹھا اور تصویر کے پاس گیا۔ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ آنکھوں میں خمارِ بادہ کی سی مستی، رخساروں پر شباب کی سی سرخی ایسی خصوصیات تھی کہ جنھوں نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے مبہوت بنا دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آخر اس تصویر میں کیا دلکشی ہے جو اس قدر جاذبِ توجہ ہے۔ میں نے بہت سے باکمال مصوروں کے نقوش دیکھے تھے۔ مغل، بنگال اور پہاڑی اسکول کے بہت سے بے نظیر نمونے میرے البموں میں موجود تھے اور گو خود کبھی تصویر کشی نہ کی تھی مگر اوائل عمر سے تصویر اور نقاشی کا مداح تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ فن سے نا واقف ہونے کے باوجود بھی ہر اس تصویر کو اپنے پاس رکھ لیا کرتا تھا جو مجھے اچھی معلوم ہوتی تھی میں کسی خاص اصول یا قاعدہ کا پابند نہ تھا بلکہ صرف جاذبِ نظر تصویر میرا عام معیار تھا یہی وجہ تھی کہ میرے پاس کئی تصویریں ایسی تھیں جنھیں ماہرین قطعی معمولی بتاتے تھے مگر میں نے صرف اس وجہ سے رکھ چھوڑا تھا کہ وہ مجھے "اچھی معلوم ہوتی تھیں"۔
لیکن ایسی تصویر کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس تصویر میں کیا خوبی تھی کہ اس قدر مسحور کر رہی تھی۔

بہت دیر غور و تعمق کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تصویر کی حقیقی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ بالکل جاندار معلوم ہو رہی تھی۔ تصویر نے مجھے پہلے بہت مسرور کیا پھر حیرت ہوئی اور تھوڑی دیر تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد میرے منھ سے "آہ" نکلا اور اسٹول پر سے اتر پڑا۔

(۳)

میں نے الماری کے قریب جا کر اس جلد کو تلاش کرنا شروع کیا جس میں تصاویر اور نقوش کے متعلق تفصیلی حالات درج تھے بہت جستجو کے بعد مجھے ایک رجسٹر مل گیا جس میں نواب صاحب کی تمام تصاویر کے متعلق حالات لکھے ہوئے تھے اس رجسٹر کی ورق گردانی کرنے کے بعد مجھے وہ جگہ مل گئی جسے میں تلاش کر رہا تھا۔ یعنی بنگال اسکول کے مصوروں کے نقوش کے حالات ایک علحدہ ضمیمہ کی صورت میں مل گئے میں نے تصویر دیکھتے ہی یہ رائے قائم کر لی تھی کہ یہ کسی بنگالی مصور کے موقلم کا نتیجہ تھی۔

ردیف "م" فہرست پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ۱۰ نمبر کی تصویر کسی قدیم بنگالی مصور آنو تش چندرا سرکار کی بنائی ہوئی تھی اور فہرست میں اسے "مصور کا ناتمام شاہکار" کا عنوان دیا گیا تھا۔

عنوان کے نیچے تصویر کے جو حالات لکھے ہوئے تھے انھیں یہاں درج کیا جاتا ہے:

(۴)

"صاحبِ تصویر بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی لڑکی تھی اس کا گاؤں گنگا کے کنارے واقع تھا اور اطراف کے دیہات میں اس لڑکی کے حُسن کا چرچا ہونے لگا کیونکہ وہ بہت ہی حسین تھی۔ لڑکی یتیم تھی اور ایک اندھی ماں کے سوا اس کا کوئی سرپرست نہ تھا"

"نوجوان مصور اس گاؤں میں آیا اور لڑکی کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ ایک دن وہ گنگا کے کنارے بیٹھا ہوا کشتیوں کا نقش بنا رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے پاس سے گزری اور اس خوبصورت جوان کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔۔۔۔۔۔"

غرض کیا ہی منحوس ساعت تھی جبکہ مصور اور لڑکی کی شادی ہو گئی۔ لڑکی جو حسین ترین مخلوق تھی مصور کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگی وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی جس سے نوجوان مصور کے دل پر بجلیاں گرتی تھیں۔ لڑکی مصور کو دل و جان سے چاہتی تھی مگر اس کا پیشہ، موقلم، رنگوں کی پیالیاں اور تختیاں اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ اسے آرٹ سے نفرت تھی کیونکہ وہ خود ایک تصویر تھی۔۔۔۔۔۔۔۔"

"مصور سارا وقت تصویر کشی اور رنگ گھولنے میں گزار دیتا تھا مگر لڑکی کو اس میں دلچسپی نہ ہونے کے باعث سخت اذیت ہوتی تھی"

"مصور کو لڑکی کی مسکراہٹ دل و جان سے بھاتی تھی وہ طرح طرح کی مضحکہ خیز تصویریں بنا کر لڑکی کو دکھاتا تھا

جنھیں دیکھ کر وہ مسکرا رہی تھی اور مصور باغ باغ ہو جاتا تھا یوں ان کی محبت روز بروز مضبوط ہو رہی تھی"

"ایک دن مصور کو خیال آیا کہ لڑکی کی تصویر بنائے اور اسے اس طرح بنائے کہ اس کا شاہکار سمجھا جائے، اپنی پوری صنعت صرف کر دے اور کسی طریق سے اس تصویر میں بھی اصل کی بات پیدا کر دے ـــــ سب سے بڑھ کر لڑکی کی مسکراہٹ!"

"لڑکی نے جب یہ سنا کہ مصور اپنی دلھن کا بھی نقش اتارنے پر آمادہ ہو گیا ہے تو اسے سخت روحانی تکلیف ہوئی اور اس کا دل بیٹھنے لگا کیونکہ اسے آرٹ سے نفرت تھی مگر چونکہ فطرتاً مرنجان مرنج اور مطیع تھی اس وجہ سے اپنے خاوند کے حکم کی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئی"

لڑکی مصور کے سامنے ہفتوں بیٹھ کر تصویر کھنچواتی رہی۔ مصور کو اس تصویر کے بنانے میں وہ لطف محسوس ہو رہا تھا جو بیان سے باہر ہے اس نے اپنے موقلم کی تمام شوخیاں و رعنائیاں اپنی دلھن کی تصویر بنانے میں صرف کر دیں اس کا شوق و ولولہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا جس وقت وہ لڑکی کو سامنے بٹھا کر اور اپنے کینوس پر گردن جھکا کر موقلم کو جنبش دیتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک غیر فانی دنیا میں پہونچ گیا ہے"

"لڑکی جسے آرٹ سے نفرت تھی اس جبریہ حاضری اور مسلسل نشست کو برداشت نہ کر سکی اور کنول کی طرح مرجھانے لگی۔ اس کی صحت میں فرق آ گیا چہرہ کی روشنی معدوم ہو گئی۔ رخساروں کی سرخی زردی مائل ہونی شروع ہو گئی۔ مگر وہ نہ صرف اپنے خاوند کا حکم ماننا چاہتی تھی بلکہ اسے مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس سے محبت کرتی تھی"

"وہ مصنوعی مسکراہٹ پیدا کر کے خوش نظر آنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکتا تھا اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا مگر اپنے مصور کے شاہکار کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے مجسمہ بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تصویر اب ختم ہونے کو تھی اور مصور خوش ہوتا تھا کہ اگر کبھی (خدا نخواستہ) لڑکی مر گئی تو وہ تصویر اس کے لئے ایک اچھی یادگار ثابت ہوگی۔ اب تصویر کا چہرہ، سینہ اور کندھے بن چکے تھے اور بال بنانے کے لئے صرف ایک ہفتہ کی اور ضرورت تھی مگر لڑکی کی صحت اب اور بھی خراب ہو گئی تھی"

"مصور اپنے ذوق میں اس قدر منہمک تھا کہ بہت کم نظر اٹھا کر دیکھتا تھا۔ جب تصویر ختم ہونے کو آئی یعنی آنکھ اور لبوں پر صرف دو تین برشوں کی اور کسر رہ گئی تو لڑکی کی صحت اس طرح مضمحل ہو گئی جس طرح شمع ٹمٹماتی ہے اور بجھتے بجھتے رہ جاتی ہے"

دن ہفتے، اور مہینے گزر گئے، لڑکی کے رخساروں کا رنگ تصویر میں بالکل اتر آیا تھا، آنکھوں کی چمک بھی پیدا ہو گئی تھی مگر مصور جس دھن میں تھا وہ یہ ظاہری اوصاف نہ تھے بلکہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنی تصویر میں لڑکی کی مسکراہٹ کو ابدی طور پر منتقل کرے تاکہ وہ جس وقت تصویر کو دیکھے لڑکی کو اپنی طرف مسکراتا ہوا پائے۔ اور یہی وہ

مسکراہٹ تھی جس نے اس کے دل کو موہ لیا تھا!"

تصویر ختم ہو گئی تھی مگر صرف لبوں پر ایک برش کے ذریعہ مسکراہٹ پیدا کرنی اور باقی تھی اس وجہ سے اس نے برش بورڈ پر رکھا، پیالیاں ایک طرف علحدہ کیں اور کرسی پر سے کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی اور دزدیدہ نگاہوں سے تصویر کی جانب دیکھا ـــــ آہ! کس قدر خوبصورت رنگ تھے، کیسی عمدہ شبیہ اتری تھی، معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی اب منھ سے بول اٹھے گی لیکن صرف ایک کسر باقی رہ گئی تھی یعنی تصویر میں اس کی طبعی مسکراہٹ نہ آئی تھی اور یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہ تھا صرف ایک برش کی حاجت تھی"

"مصور نے تصویر کی خوبیوں کو سراہا اور بے اختیار ہو کر بولا!! خوب! تصویر نہیں بذات خود زندگی ہے!"

"مصور نے اپنی محبوبہ کی طرف نظر اٹھائی ـــــ" "لڑکی کے لبوں پر تو اب بھی مسکراہٹ تھی، مگر اس کے تھوڑی دیر بعد ہی یکایک لڑکی کے منھ سے ایک ہلکی سی سسکی نکلی اور وہ ہمیشہ کیلئے اس مسکراہٹ کو لیکر رخصت ہو گئی!"

(۵)

"لوگ کہتے ہیں کہ مصور نے اپنی محبوبہ کی طرف پلٹ کر دیکھا مگر اس وقت اپنی دلھن کو آرٹ پر قربان ہوتے ہوئے دیکھ کر اسے اتنا دکھ نہ ہوا جتنا اس خیال سے کہ اس کا شاہکار ابھی ناتمام تھا ـــ اور وہ مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی تھی"

"مصور اپنی تصویر میں مسکراہٹ پیدا نہ کر سکا تھا اس نے اپنی ساری عمر کی کمائی کو اس طرح ضایع ہوتے ہوئے دیکھ کر اپنا موقلم پھینک دیا، پیالیاں الٹ دیں اور آرٹ سے ہمیشہ کے لئے دست کشی کر کے ایک چیخ ماری اور اپنی محبوبہ کی روح سے جا ملا۔

"انھوں نے... یہ تصویر اسی مصور کا ناتمام شاہکار تھا جسے نواب جمشید یار نے اپنے عمدہ مجموعہ میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی تھی اور جس کے حالات پڑھ کر میں بیحد متاثر ہوا۔

ظفر قریشی دہلوی

مالہٗ وماعلیہ

دورِ حاضر کے بعض اکابر شعراء کے کلام کا خوردبینی مطالعہ جس میں حضرت نیاز نے جوش، سیماب، جگر، ماہر وحشت وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر معنی و بیان اور فنِ عروض کے نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے۔ وہ حضرات جو معیاری شاعری کی خصوصیات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔ مینجر نگار۔ لکھنؤ

تلاشِ سکون

سلیمہ کی شادی کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھی کہ اس پر تعجب کیا جاتا۔ لیکن ایک پہلو اس کا ضرور عجیب و غریب تھا کہ "سلیمہ باوجود علیم سے منسوب ہو جانے کے کیوں باپ کی بیت کے تعلقدار کو بیاہ دی گئی"

علیم بار بار صفدر کے تار کو پڑھتا۔ لیکن کچھ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ کل کا آیا ہوا خط اس کے پاس موجود تھا لیکن اس میں کہیں شادی کا تذکرہ نہ تھا۔ رفع شک کی غرض سے علیم نے صفدر کو جوابی تار روانہ کیا۔ ۳ گھنٹے کے بعد جواب آیا کہ سلیمہ کی شادی کل ہو گئی۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ واقعہ کی نوعیت جب غیر معمولی ہو تو انسان مشاہدات کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ علیم کو صفدر کے اس تار پر بھی کلی اعتماد نہ ہوا۔ وہ پریشان تھا کہ اب کیا کرے۔ وہ غصہ سے کانپنے لگتا۔ جب اُسے یہ خیال پیدا ہوتا کہ اس کے چچا اُس کو یوں برباد کر دیں گے اور برسوں کے طے شدہ فیصلہ کو یوں توڑ دینگے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اُس نے خود سلیمہ کو لکھا:

"عزیزہ، ممکن تھا کہ میں تم کو تمہارے پرانے خطاب سے مخاطب کرتا۔ لیکن صفدر کی اطلاع اس قدر حیرت نما ہے کہ اُس کے تصور سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ تار ملفوف کر رہا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہو تو میرا خط بغیر پڑھے پھاڑ ڈالئے۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے حق خطاب نہیں رہتا"

علیم

چار دن جواب کے انتظار میں علیم نے نہایت بےچینی سے کاٹے۔ پانچویں دن جواب آیا۔

"بھائی جان - آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ "ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے" جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں اپنے متعلق کچھ نہیں کہتی۔ کیونکہ بناوٹ پر محمول کیا جائے گا۔ مگر آپ کے متعلق ضرور کہوں گی کہ خدا آپ کو اس حادثہ کے برداشت کرنے کی طاقت دے"

سلیمہ

(۲)

اجمیر کا عرس اپنی گوناگونی کی وجہ سے اپنے اندر ایک عجیب دلکشی رکھتا ہے۔ اور شاید غالب نے اسی قسم کے اجتماع کو دیکھ کر کہا ہوگا!

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ فصل بہاری کا

علیم اجمیر اس خیال سے آیا تھا کہ شاید اُن لوگوں کی صحبت میں جو دنیا چھوڑ دینے کا اعلان کر چکے ہیں۔ وہ بھی دنیا اور دنیا والوں سے آزاد ہو جائے گا۔ قاعدہ ہے کہ وہ ہستیاں جو ساری عمر خدا کی طرف رُخ نہیں کرتیں اور مذہب کو دفتر توہمات خیال کرتی ہیں۔ ان کو جب سکون قلب کی ضرورت پیش آتی ہے تو پھر مجبوراً اسی "دفتر توہمات" کی طرف آتی ہیں۔ علیم باوجود اپنے "کفر پرور" دماغ کے رات دن ریاضت اور عبادت میں گزارتا تاکہ اس کا ذہن سلیمہ کے تصور سے خالی رہے۔ لیکن اُس کا دماغ سکون سے یکسر خالی تھا۔ اُس کی ریاضتیں اُس کی چلہ کشیاں، جن کو وہ ترکِ حیوانات اور فاقے کر کر کے پوری کر رہا تھا حضورِ قلب سے معرا تھے۔ اور ان وظائف میں جن کو وہ کمر کر پانی میں کھڑا ہو کر پڑھتا ان میں ایک منٹ کے لئے سلیمہ کی روح فرسا خیال سے اُس کو نجات نہ ملتی۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ سلیمہ سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ہے۔ پہاڑوں کے تاریک و دہشتناک غاروں میں سلیمہ کا تصور نور کی طرح ضو فگن رہا کرتا۔ اور دعاؤں میں مار مار کر روتا۔ یا جنگل کی تاریک اور گھنی جھاڑیوں میں گم ہو جاتا۔ لیکن سلیمہ کا خیال تھا کہ کہیں اُس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔

اس زندگی میں علیم کا واہمہ اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ اُس کو کائنات کا ذرہ ذرہ سلیمہ کی محبت کا پیغام سناتا معلوم ہوتا۔ کالج چھوڑنے کے بعد علیم اپنی زندگی کو یوں ہی مزاروں اور خانقاہوں میں تباہ کرتا رہا۔ اُس نے اسی پریشانی میں حج بھی کیا۔ کہ شاید وہاں اُس کو سکون مل سکے مگر افسوس کہ اُس کی یہ امید وہاں بھی پوری نہ ہوئی۔ وہ مضطرب اور دیوانہ وار کعبہ کے در و دیوار سے سلیمہ کے خیال سے نجات مانگتا۔ اُس کی یہ "التجائے نجات" صدا بصحرا سے زیادہ وقعت نہ رکھتی۔

مدینہ میں علیم کو قدرے ضرور سکون ملا۔ وہ جس وقت روضۂ اطہر کی جالی تھام کر اپنی پر درد داستان زبان سے نہیں بلکہ دل سے کہتا تو اُس کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا دل منور ہو رہا ہے اور غم کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ لیکن یہ حالت عارضی ہوتی تھوڑی دیر کے بعد پھر اُس کی حالت وہی ہو جاتی۔

۳

بمبئی پہونچکر علیم نے اپنی زندگی بالکل بدل دی۔

قابلیت اور ذہانت انسان کو عمر میں ایک موقع ضرور بہم پہونچاتی ہے کہ اگر وہ اس قوت پرواز ہو تو سربلند ہو سکے۔ علیم جیسے تعلیم یافتہ کا بمبئی میں کامیاب ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ وہ نہایت معمولی کوشش سے ایک کارخانہ کا منیجر ہو گیا مگر باوجود اپنی لاانتہا ہی ذمہ داریوں کے اُس کی زندگی سراسر مدہوش تھی۔ اگرچہ وہ کارخانہ میں کبھی دلچسپی نہ لیتا تھا لیکن اُس کا سخت طرز عمل کارخانہ کے مزدوروں اور ملازموں کو ہر وقت برانداز رکھتا تھا۔ کیونکہ معمولی باتوں پر کام پڑ دینا اور نوکروں کو برطرف کر دینا اُس کے نزدیک نہایت معمولی بات تھی۔ وہ بالکل نہ جانتا تھا کہ رحم کیا چیز ہے اس کا

قول تھا کہ جب خدا خود رحیم نہیں ہے تو وہ ہستی کیوں رحیم ہو جو اُس کی ذات کی مظہر ہے۔ اُس کے نزدیک مصیبت زدہ مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ عنایت و مہربانی یہ ہے کہ ان کو مزید تباہیوں کی طرف ڈھکیل دیا جائے تاکہ وہ جلد از جلد اپنی اس مصیبت ناک زندگی سے نجات حاصل کر سکیں۔ وہ خدا ایک ایسی طاقت کو کہتا تھا جو رحمٰن و رحیم نہیں بلکہ ظالم و جابر ہے۔ اُس کو لوگوں کی اس خود فراموشی پر بڑی ہنسی آتی جو خدا کی ان تباہ کاریوں کے باوجود اُس کو کریم مانتے ہیں۔ عبادت اُس کے نزدیک ایک بھینٹ تھی۔ جس کو مخلوق خدا کے خوں آشام جذبات فرو کرنے کے لئے اُس کے سامنے چڑھاتی رہتی ہے۔

علیم کے سخت گیر برتاؤ سے کارخانہ کا کام چمک اُٹھا۔ اور مالک کو اُس سے بے انتہا فوائد پہونچے۔ اور مالک کارخانہ کے خاندان میں اُس کی جلد پذیرائی ہوگئی۔

ثریا مالک کارخانہ کی لڑکی اپنی تعلیم ختم کر کے پونا سے آئی تھی۔ چند روز کی یکجائی نے ایک دوسرے کو روشناس کر دیا۔ علیم نے حصولِ سکون کی خاطر اپنی زندگی ثریا کے قدموں میں ڈال دی اور اس میں اُس کو واقعی اضطراب سے نجات مل گئی۔ اور علیم و ثریا نہایت گرویدگی سے زندگی گزارنے لگے۔

ایک دن کارخانہ میں کسی غلطی پر علیم نے میٹ کو بُری طرح مارا اور کارخانہ سے نکال بھی دیا۔ کارخانہ میں اس واقعہ سے ایسی آگ لگی کہ دوسرے دن تمام مزدوروں نے اسٹرائک کر دی۔ مالک کو خبر ہوئی دوڑا آیا۔ مزدوروں سے وجہ دریافت کی۔ انھوں نے اپنا مطالبہ پیش کیا کہ "اس منیجر کو نکال دیا جائے ورنہ ہم کارخانہ کو پھونک دیں گے۔" مالک نے فیصلہ کے لئے دو گھنٹے کی مہلت چاہی مزدوروں نے کہا کہ "نہیں ہم ابھی فیصلہ چاہتے ہیں۔ ادھر یا اُدھر۔" مجبوراً مالک کو علیم کی علٰحدگی کا اعلان کرنا پڑا۔

مالک بہت پریشان تھا کہ اب کیا کرے۔ ثریا کی علیم سے مجنونانہ محبت اب راز نہیں رہی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ثریا جو کچھ نہ کر گزرے تھوڑا ہے۔ اس لئے اُس نے علیم کو ثریا کی اتالیقی سپرد کر دی اور کہدیا کہ "ثریا مزید تعلیم کے لئے لندن جانا چاہتی ہے۔ آپ اُس کی تعلیم کا انتظام فرمائیے۔" علیم اس واقعہ سے بالکل دلگیر نہیں ہوا۔ بلکہ اُسے خوشی ہوئی کہ اُس کی ذمہ داریاں کم ہوگئیں۔

علیم نے تین مہینے ثریا کے ساتھ انہماک سے گزارے لیکن رفتہ رفتہ اس کا دل اُچاٹ ہونے لگا اور چند روز کے بعد تو پھر اُس کی وہی حالت ہوگئی۔ وہی عدم سکون، وہی اضطراب، وہی پریشانی۔ ثریا اب اس کے لئے بالکل جاذبِ نظر نہیں رہی۔

اضطراب کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ علیم تقریباً دیوانہ ہوگیا۔ اور اُسی عالم میں مے نوشی کی عادت ڈال لی۔ ثریا جو ہر وقت علیم کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اب دنوں علیم اُس کو نہ ملتا۔ وہ حیران و پریشان اُس کو مدہوشی کے

عالم میں کسی ہوٹل یا کسی کوٹھے سے لاتی۔

ثریا اس تغیر پر حیران تھی اس نے کوئی کوشش علیم کو پھر وہی گزشتہ علیم بنانے کے لئے نہ اٹھا رکھی لیکن علیم کی حالت روز بروز گرتی ہی گئی۔

کبھی ثریا کو اپنے حسن پر ناز تھا۔ لیکن اب علیم کے انداز کو دیکھ کر اُس سے بھی بدگمان ہوگئی تھی۔

(۴)

صفدر نے نہایت تعجب سے تار پڑھا۔ لکھا تھا کہ:

"صبح کی ٹرین سے پہونچ رہا ہوں۔"

علیم

صفدر کو علیم کی گمشدگی کی وجہ سے اُس کی موت کا یقین ہوگیا تھا۔ تار نے ایک نئی روح اس میں دوڑا دی اور وہ نہایت بے چینی سے گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ صفدر کو زیادہ تلاش نہ کرنا پڑا۔ اُس کو جلد علیم کا ڈبہ مل گیا۔ صفدر نے چاہا کہ دوڑ کر علیم سے لپٹ جائے۔ مگر ثریا نے نہایت تیزی سے کہا کہ "یہ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ ایسا غضب نہ کیجئے ڈاکٹر نے تو زیادہ بات کرنے کی بھی ممانعت کر دی ہے۔" ثریا کو دیکھ کر صفدر کچھ پریشان سا ہوگیا اور پھر جلدی جلدی سوالات کرنے لگا۔ ثریا نے پھر کہا کہ "واقعات کا علم پھر بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت تو سب سے مقدم گھر پہونچنا ہے۔" صفدر، مُردوں کی طرح علیم کو گاڑی میں ڈال کر گھر لایا۔

اُسی وقت علیم کی آمد کی خبر چچا کو پہونچی دوڑے آئے۔ خیریت پوچھی گھر لیجانے پر مُصر رہے۔ لیکن علیم کسی طرح جانے پر راضی نہ ہوا۔

علیم کے چچا نے گھر پہونچکر سلیمہ کو تار دیا کہ "علیم سخت بیمار ہو کر آیا ہے آکر آخری دیدار کرلو۔" اور جب دوسرے دن علیم سے ملنے گئے۔ تو اس کو اطلاع دیدی کہ "سلیمہ کل صبح تک آجائے گی۔"

میرٹھ پہونچکر علیم کی حالت نسبتاً بہتر ہوگئی تھی لیکن سلیمہ کی آمد کی خبر سے پھر اس پر دورہ پڑا۔ اور گھنٹوں کے لئے وہ بیکار ہوگیا۔

مہینوں گزر گئے تھے کہ ثریا پٹی سے لگی علیم کی خدمت میں مصروف تھی۔ اور دنوں سے نہ سوئی تھی۔ علیم کے سو جانے کی وجہ سے وہ پٹی پر سر رکھ کر اونگھ گئی۔ علیم پچھلی رات کو ایک دم جاگ اٹھا اور ثریا کو جگا کر پانی مانگا۔ پانی پی کر علیم نے عجیب نظروں سے ثریا کو دیکھا۔ علیم کی نظروں میں وہ کیف اور لذت تھی کہ جس کو ثریا نے ساری عمر محسوس نہیں کیا تھا۔ بہت دیر تک محویت کے عالم میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر علیم نے ثریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سینہ سے لگایا اور کہا۔ "ثریا میری جو حالت ہے اُس سے تم بخوبی واقف ہو۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا مگر ناشکری ہوگی اگر میں تمہارے خلوص، تمہاری محبت، تمہاری خدمت کا اعتراف نہ کروں۔ اور تم سے اپنے گناہوں کی معافی نہ چاہوں جو میں نے کئے ہیں

اگرچہ میری نظر میں انسان دنیا میں صرف گناہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جس سے کسی کو مفر نہیں۔ انسان ایک مجبور و لاچار ہستی ہے۔ اُس کو اپنے متعلق بالکل علم نہیں کہ کہاں سے آیا اور کیوں آیا اور کہاں جائے گا۔ اس لئے انسان سے جو کچھ اُس کی زندگی میں ہو جائے وہ ثواب کے ذیل میں آتا ہے نہ کہ عذاب کے۔

اپنے اس کلیہ کے تحت میں گو مجھ کو یہ حق نہیں رہتا کہ تم سے کسی قسم کے معذرت خواہ الفاظ کہوں۔ لیکن تمہیں دنیا کی ہر چیز میں اشتباہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں تم سے عذر خواہ ہوں کہ میں نے تم کو جان کر دھوکا دیا۔ جو چیز میرے قبضہ میں تھی اُس کو تمہاری خدمت میں پیش کیا۔ لیکن میں کرتا تو کیا کرتا جبکہ میری قلبی سوزش نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور میں نے جو کچھ کیا اُس آگ سے بچنے کے لئے کیا جو مجھ کو پھونکے دیتی تھی۔ تمہارے ساتھ میری فریفتگی مکر اور دھوکہ تھی۔ مگر آہ تم اپنی نادانی سے اُس کا شکار ہو گئیں۔ اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے دل میں میرے متعلق وہی شعلہ برق افگن ہے جو مجھ کو پھونک رہا ہے۔ سلیمہ کی محبت نے مجھ کو اس منزل میں پہونچا دیا کہ مجھ کو آج اپنا آخری وقت نظر آتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری موت تم پر کیا ستم ڈھائے گی۔ اور تمہارا کیا حال ہوگا۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ دنیا غم خانہ ہے جس میں کسی کو سکون نہیں اور اگر کبھی انسان کو کوئی مسرت نصیب ہو جاتی ہے تو "خون جگر" کے ایک ایک قطرہ کا حساب "ودیعت مژگان یار" ہونے کی وجہ سے دینا پڑتا ہے۔ تمہاری وہ خوشی کی زندگی جس کو تم نے مجھ سے ملاقات ہونے سے قبل گزارا تھا۔ تم کو صرف اس لئے چھوڑ گئی تھی کہ تم اس المناک زندگی کے برداشت کی طاقت اپنے اندر پیدا کر سکو۔ اور خوب اچھی طریقہ سے تباہ و برباد ہو۔ میں تنہا مست رہا تھا مجھ کو مٹ جانے دیا ہوتا۔ لیکن نہیں فطرت کو تو یہ منظور تھا کہ کوئی اور پُر مسرت زندگی بھی اس کے ساتھ تباہ کی جائے۔ مگر "ستم ظریفی" تو ملاحظہ ہو کہ اس دوسری ہستی کی تباہی کا مجھ کو ذریعہ بنایا۔ لہٰذا جو کچھ ہوا یا آئندہ ہو اس پر تم کو غم کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تم نے اپنا حق ادا کر دیا۔ اور تم نے میری ایسی خدمت کی کہ اس کے معاوضہ کے لئے میرے پاس کچھ نہیں کہ پیش کر سکوں۔ لہٰذا تم میرے پاس آ جاؤ تاکہ میں تم کو گلے لگا کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر سکوں۔ اس وقت تمہاری محبت کے بدلہ میں یہی ایک تحفہ ہے جس کو پیش کر سکتا ہوں۔"

ثریا کی آواز جوشِ گریہ نے بند کر دی تھی اور علیم بھی بے اختیارانہ رو رہا تھا۔ ثریا نے بمشکل اتنا کہا۔ "ایسی ناامیدی کی باتیں نہ کرو اب تم سو جاؤ۔" علیم نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ثریا کے منع کرنے سے آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد علیم سو گیا۔ مگر ثریا تمام رات جاگتی رہی۔ صبح ہوا چاہتی تھی کہ علیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت علیم کی طبیعت سخت خراب تھی۔ تشنج کا دورہ پڑا۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ سانس تیز چلنے لگی۔ ثریا ابھی علیم کو سنبھال ہی رہی تھی کہ ماما نے سلیمہ کی آمد کی خبر دی۔ علیم ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس خبر کو سُن کر بیہوش ہو گیا۔ ثریا گھبرا گئی اور صفدر کو آواز دی۔ صفدر نے آ کر دیکھا تو علیم ختم ہو چکا تھا۔ صفدر چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ ثریا سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ لیکن اُس کی عجیب حالت تھی کبھی صفدر کو دیکھتی اور کبھی علیم کو۔ شدتِ غم اور حیرت نے اُس کی آنکھوں میں آنسو خشک کر دئے تھے اور جسم تھر تھر

کانپ رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے بہزار دقت اپنے آپ کو سنبھالا اور علیم کو درست کرنے لگی۔ کہ اتنے میں ماما نے صفدر سے کہا کہ "آپ دوسرے کمرہ میں چلے جائیے، سلیمہ بی آنا چاہتی ہیں"۔

صفدر دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔ صفدر کے جاتے ہی سلیمہ کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور "ہائے بھائی جان" کہہ کر علیم سے لپٹ گئی۔ زار و قطار روتی جاتی تھی اور کہتی تھی "بھیا تم نے اپنی اس گنہگار بہن کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ کم از کم عذر گناہ تو کر سکتی"۔ سلیمہ کے لاش سے لپٹنے سے لاش میں ایک ارتعاش پیدا ہوا اور فوراً بند ہو گیا۔

علیم کے دفن کے بعد ثریا نے سلیمہ کو علیم کا خط دیا۔ سلیمہ نے اندازِ بیتابی سے کھولا لکھا تھا۔

(۵)

سلیمہ!

"واقعات ہائلہ کے بعد کو حق تخاطب چھین جاتا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے ایک دوسری نسبت کا بھی فخر حاصل ہے۔ اس لئے اتنی جسارت کرتا ہوں۔ اور اپنے قلبی تاثرات کو آپ تک پہونچا رہا ہوں"۔

"ممکن تھا کہ میں اس وقت قسمت کی شکایت کرتا۔ لیکن نہیں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ کیونکہ قسمت کا مفہوم میرے نزدیک "جبر" وہ "قہر" کے سوا کچھ نہیں پھر ظلم کی صورت میں "جبر" کے متعلق کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ "بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد"

"اس دوران میں گو میں آپ سے دور رہا لیکن آپ کے دل گداز خیال کو ہمیشہ اپنے سے قریب رکھا۔ اور آج اسی کو لے کر اس دُنیا کو چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن افسوس کہ آپ نے مجھ کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ قرب روحی کے خیال سے اپنے آپ کو کچھ سکون دے سکوں۔ کیونکہ روح کا مفہوم میرے نزدیک اس سے زیادہ نہیں کہ ترتیب عناصر سے ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہی ہر شے کی معراج ہے کہ جو ذرے کسی وقت اجتماع سے ایسی حالت پیدا کریں۔ انتشار کے عالم میں پھر اُسی فضائے لامحدود میں محو رقص ہوں"۔

"آپ کو میری باتیں عجیب معلوم ہوں گی۔ لیکن چونکہ میں نے آپ کو اس قدر تعلیم دے دی تھی کہ آپ ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں گی۔ میرے خیالات دماغی فریب نہیں ہیں۔ بلکہ یہ وہ باتیں ہیں جن کو میں نے تجربہ کی کسوٹی پر کسا ہے۔ آپ کی محبت نے مجھ کو ملحد بھی بنایا اور رومشرب بھی۔ لیکن مجھے دونوں صورتوں میں ایک ہی حالت نظر آئی۔ سکون نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ بلکہ دنیا میں ہر طرف دھوکہ اور فریب کا جال پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اس دام کے اسیر مختلف الحیثیت ہیں۔ کوئی اسیر دام جبر ہو کر بھی اپنے متعلق خیال اسیری نہیں لاتا۔ اور کوئی پھڑکتا ہے۔ اور مضطرب و بیقرار ہوتا ہے۔ ایسے اسیر کے لئے قید حیات پر قید محبت بڑھا دیتے ہیں تاکہ مانوس قفس ہو جائے"۔

"میرے نزدیک اگر میری عمر میں فطرت نے کہیں رحم سے کام لیا ہے۔ تو یہ میری موت کا معاملہ ہے۔ میں ممنون ہوں اور بیحد ممنون۔ یہاں تک پہونچنے میں میرا گناہ صرف اتنا تھا کہ آپ کے مواعید پر یقین کر لیا۔ اور اپنے آپ کو ان کی رو میں بہا دیا فقدانِ محبوب انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اور میری دانست میں کسی کو تباہ و برباد کرنے کا سب سے زیادہ زبردست حربہ

"غیر محسوس طاقت" کے پاس بھی افتراقِ محبوب و محب ہے۔"

"میں آپ کو کسی قسم کا الزام نہیں دیتا۔ کیونکہ میں "ازل" سے "شرارِ آرزو" صرف جلنے کے لئے لایا تھا۔ میرے خیالات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ میں نے اُن کا اظہار نہایت دلیری سے محض اس وجہ سے کر دیا کہ اگر آپ کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں میری محبت باقی ہو تو آپ اُس کو نکال دیں۔ اور خواہ مخواہ "دعا" یا "ثواب" کے نام سے میرے لئے زحمت نہ گوارا فرمائیں کیونکہ دُعا کا مفہوم میرے نزدیک "داخلی فریب" سے زیادہ نہیں۔ اور میں آپ کی نظر میں اپنی اصلی صورت میں دکھائی دوں۔ اور کسی قسم کی عنایت کا مستحق قرار نہ پاؤں۔"

"علیم"

(۶)

خط دیکھ کر سلیمہ کی طبیعت اس قدر خراب ہوئی کہ پھر وہاں ایک منٹ نہ ٹھہر سکی۔ اور پہلی گاڑی سے پہلی بھیت روانہ ہو گئی۔ — پیچھے کے بعد ثریا نے بھی صفدر سے اجازت سفر چاہی۔ صفدر کا جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن ثریا کے اصرار نے اُس کو بھی مجبور کر دیا۔ وداع کا منظر نہایت دل خراش تھا اور ثریا کے ان الفاظ نے کہ "میں نے آپ کی امانت کو آپ تک پہونچا دیا لیکن آپ مجھے خالی ہاتھ واپس کر رہے ہیں" صفدر کو سخت بیتاب بنا دیا تھا۔

ثریا جس وقت میرٹھ سے چلی اسے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ بھیت پہونچتے پہونچتے شدید ہو گیا۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لیکن بخار نہ اُترنا تھا نہ اُترا۔ اور تیسرے دن ثریا نے بھی اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

محمد ذوالفقار کیفی

ایثار

موسم سرما کی ایک تاریک رات میں، اتفاقاً، قاہرہ کے ایک بلند مرتبہ رئیس کا گزر ایک تنگ و تاریک گلی میں ہوا۔ اس نے ایک شکستہ دیوار کے نیچے ۱۴-۱۵ سال کی ایک نوعمر دوشیزہ کو سربگریباں دیکھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس سخت سردی سے اسے محفوظ رکھ سکتی اس کے تقریباً عریاں جسم پر کچھ نشانات تھے، جو بظاہر کوڑوں کے معلوم ہوتے تھے۔

وہ رئیس یہ منظر دیکھ کر خاموش کھڑا ہو گیا، فقر و شکستگی کے اس دل ہلا دینے والے منظر نے اس کے دل و دماغ پر غیر معمولی اثر کیا، پھر وہ اس کی جانب بڑھا اور نہایت رفق و ملاطفت سے اس نے اس نازک اندام لڑکی کا بازو ہلایا، اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا سر اُٹھایا، اس طرح کہ وہ فرار پر بالکل طیار معلوم ہوتی تھی، اور نہ معلوم کیا سمجھ کر اس نے بے ساختہ کہا۔

"میں اب واپس نہیں جا سکتی"

لیکن اس شخص کی تسکین و تسلی سے رفتہ رفتہ اس کا ڈر غائب ہو گیا اور کچھ کچھ اس کی وارفتہ طبیعت سکون پذیر نظر آئی، اس نے ایسا محسوس کیا کہ غالباً یہ شخص وہ نہیں ہے۔ جس کے تخیل نے اس سے کہلوا دیا تھا کہ "میں اب واپس نہیں جا سکتی"۔ اس احساس کے بعد اس نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جن سے اطمینان ٹپک رہا تھا۔

"میں تمہارا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"محترم بزرگ! میں نہیں جانتی کہ میرا نام کیا ہے؟"

"اچھا تمہیں کیا کہکر پکارتے ہیں؟"

"لوگ تو کہتے ہیں کہ مجھ مجہول الحال کو کہیں سے اُٹھا لایا گیا تھا"

"کیا یہ سچ ہے؟"

"میں نہیں کہہ سکتی، ہاں اتنا جانتی ہوں کہ میں اپنے باپ سے صحیح طور سے واقف نہیں ہوں اور نہ یہ کہ وہ ہیں یا نہیں؟ مگر ایک آدمی سے واقف ہوں، جس نے میری پرورش کی، پالا پوسا اور اپنے گھر میں رکھا، اسی کو میں اپنا باپ سمجھتی تھی، اسی کو دیکھ کر میرا دل محبت و سرور کی لہروں سے لبریز ہو جاتا تھا، لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ مجھ پر طرح طرح کے عذاب توڑتا ہے اور ایسی نت نئی تکلیفیں برداشت کرنے پر مجبور کرتا ہے جنہیں کوئی باپ اپنی اولاد کے ساتھ روا نہیں رکھ سکتا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کارگاہِ عالم میں میں تنہا ہوں، میرا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ والی ہے نہ وارث اور نہ ہمدرد ہے نہ غمگسار،

باہر جب کسی لڑکی کو میں دیکھتی تو اس سے پوچھتی تمھارے ماں ہے ؟ وہ جواب دیتی "کیوں نہیں - ہماری اماں ہمیں بہت چاہتی ہیں، پیار کرتی ہیں، پیسے دیتی ہیں، اگر ہمیں کوئی مارتا ہے تو وہ اس سے خفا ہو جاتی ہیں، ہماری اماں بڑی اچھی ہیں" میں یہ افسانہ سنتی تو میرے غم و الم میں اور اضافہ ہو جاتا۔ میرا دل یاس و حرماں سے بھر جاتا، یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگتی کہ میرا وجود خود ایک مستقل عذاب ہے، کسی سخت گناہ کی پاداش میں، میں ننگ وجود بنا کر اس عالم آب و گل میں بھیجی گئی ہوں، اور شاید خدا اس کا انتقام میرے اس ناپاک وجود ہی سے لینا چاہتا ہے۔

ایک زمانہ ہوگیا، اور میں اپنی حالت پر قانع رہی، اس کا جور و ستم روز افزوں تھا، اور میرا صبر و شکر۔ آخر جب اس نے محسوس کر لیا کہ میری جبین نیاز اس سنگ در کے علاوہ کوئی اور سنگ آستاں نہیں تلاش کر سکتی، تو اس کا جذبۂ جور پسندی اور ترقی کر گیا، یہاں تک کہ اب وہ سخت زد و کوب کرنے لگا، اگر معمولات کے ادا کرنے میں مجھ سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو میرا پیٹنا ایک لازمی امر تھا، اس روح فرسا ستم کو بھی میں خاموشی سے برداشت کرتی رہی تاآنکہ آج کی یہ رات درد و مصیبت کا خاص پیغام لے کر آئی، واقعہ یہ ہوا کہ آج وہ شخص کچھ ایسے سرمستی کے عالم میں آیا، اور اس نے کچھ ایسی باتیں کیں، کہ مجھے محسوس ہوا وہ اپنے جذبۂ حرص و ہوس "کو پورے طور پر "بروئے کار" لانا چاہتا ہے اور میرے ننگ و ناموس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس جوہر کو کھو دینے کے بعد میرے پاس باقی کیا رہ جاتا ؟ مجبوراً میں نے فرار اختیار کیا اس طرح کہ کوئی میری جائے قرار نہ معلوم کر سکے، میں راستے سے ناواقف ہونے کے باوجود برابر چلتی رہی۔ یہاں تک کہ تھکے اس گلی میں پناہ لی، جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں، دو روز گذر چکے ہیں کہ میرے کام و دہن لطف ذائقہ سے محروم ہیں، کیا آپ کی عنایت سے مجھے "نان خشک" میسر آ سکتی ہے کہ میرے پیٹ کی آگ ٹھنڈی ہو اور مجھے سہارا ہو جائے ؟

اس آدمی نے مصیبت زدہ لڑکی کی یہ داستان حیرت سنی اس پر کچھ ایسا تاثر طاری ہوا کہ وہ "اپنے گریۂ بے اختیار" کو ضبط نہ کر سکا، اس کے گالوں پر آنسو موتی کی طرح ڈھلک رہے تھے، اس نے اس مصیبت زدہ اور دل فگار لڑکی کا بازو پکڑا اور بلا کچھ کہے ہوئے روانہ ہو گیا، اپنے مکان پر پہونچ کر اس نے نہایت شریفانہ برتاؤ کیا، اور اپنے حسن سلوک سے اسے باور کرا دیا کہ اس سے زیادہ وہ کسی چیز کی تمنا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس شخص کے مکان میں اس طرح داخل ہوئی کہ اپنے اخلاق و عادات شکل و شمائل اور حسن و جمال میں اپنی ہمسنوں سے بدرجہا ممتاز تھی، صاحب خانہ سے جو شخص واقف تھا وہ اس لڑکی سے بھی واقف تھا کہ ایک یتیم و بیچاری لڑکی ہے، اور یہ گھر اس کا ملجا و ماویٰ ہے۔

صاحب خانہ کے بھی ایک لڑکی تھی۔ جس کی تربیت جدید اطوار و اسلوب پر ہوئی تھی۔ یہ صاحبزادی بھی اپنے ذہنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک عجیب و غریب چیز تھیں، آپ کو حسن و عشق کی اخلاق کش داستانیں بہت مرغوب تھیں۔ فیشن کے بارے میں آپ "اسپشلسٹ" واقع ہوئی تھیں، کم کون فیشن زیادہ دلکش اور مرغوب طبائع ہے حسب خواہش جس سے چاہتیں عقلمندی کا برتاؤ کرتیں جس سے چاہتیں توہین و تذلیل روا رکھتیں اور پھر اس اصول سے والدین بھی منتفع نہیں تھے، آپ کا قلب خودی

خود بینی، خود نمائی، اور رشک و حسد کے جذبات سے لبریز تھا، کیا مجال کہ آپ کے روبرو کسی اور کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا جا سکے آپ نے جو یہ دیکھا کہ کل کی آئی ہوئی یہ نوخیز چھوکری سب کے دلوں پر جھوٹا اور یہ بزرگوار کے دل پر خصوصاً اپنا سکہ جما رہی ہے اپنے خداداد حسن خلق سے لوگوں کو موہ رہی ہے تو اس سے آپ بغض رکھنے لگیں، لیکن نہایت چالاکی سے اپنے اس جذبۂ فاسد کو اپنی سہیلیوں سے بھی چھپائے رکھا، لیکن اپنے دل میں مستحکم ارادہ کر لیا کہ اگر موقع ہاتھ آ گیا تو چوکوں گی نہیں، زک دے کے رہوں گی ادھر تو جذبۂ فاسد کارفرما تھا، اُدھر وہ نئی آئی ہوئی الھڑ چھوکری اپنے ولی نعمت کے جذبۂ شکر و سپاس میں اس قدر غرق تھی کہ ذرا بھی نہ سمجھی کہ ؎

پنہاں ہے دام سخت قریب آشیانہ کے!

کہ ایک روز ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

اتفاقاً صاحب خانہ رات کو بہت دیر میں آیا، بالاخانہ کے زینہ پر وہ چڑھ رہا تھا کہ اُس کی نظر ایک خط پر پڑی۔ اس نے اُسے اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا :-

"حسب وعدہ آج آدھی رات کو پائیں باغ میں اُسی سرو کے درخت کے نیچے تمھارا انتظار کروں گا"

ابھی پورے طور سے وہ خط پڑھ بھی نہیں چکا تھا کہ اُسے ساری فضا ہلتی ہوئی معلوم ہوئی، معلوم ہوا کہ پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ پھر اپنا دل بہلانے کے لئے اس نے کہا شاید اس لڑکی کے نام ہو جسے اُس روز وہ لایا تھا، اور یہ تو بڑی ناانصافی ہوگی کہ بغیر کسی ثبوت کے خود اپنی لڑکی کے متعلق اس قدر سوء ظن سے کام لیا جائے، پھر اس نے گھڑی دیکھی آدھی رات قریب تھی۔ وہ واپس ہوا اور پائیں باغ میں دبے پاؤں درختوں کی آڑ لیتا ہوا اسی درخت کے نیچے پہونچ گیا جہاں دو چور یعنی عاشق و معشوق ملنے والے تھے وہ چھپ کے بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے ؟

اس شخص کو تو وہیں چھوڑئے، اب ادھر کی سنئے یہ خط در حقیقت اس معصوم لڑکی کا نہیں تھا جو یہاں آکر اپنا دکھ درد بھول گئی تھی، بلکہ خود صاحب خانہ کی دختر بلند اختر کا تھا، اس وقت صاحبزادی اپنے کمرہ میں سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہوئی آئینہ سے چشمک زنی کر رہی تھیں اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف تھیں، اور یہ سوچ رہی تھیں کہ اس وقت کیسا ہوتا پہن کر مقام مقصود کی طرف کار فرما ہوں ؟ ادھر یہ بیچاری غریب لڑکی مست خواب و شباب تھی، اس کا حُسن "حُسن بے پروا تھا" "خود بین و خود آرا" نہیں تھا، لیکن اس وقت خلاف معمول اپنے ولی نعمت کی چاپ سنکر وہ بیدار ہو گئی۔ اس خلاف وقت دھمک آہٹ کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی، وہ ایک طرف کھڑی ہو کر جھانکنے لگی کہ کون ہے ؟ یہاں آکر جو اس نے ایک نظر ڈالی تو یک لخت تمام باتوں سے واقف ہو گئی، اور سمجھ گئی کہ اب کوئی گل کھلانا چاہتا ہے ؟ یہ دیکھ کر اس نے اپنا سر جھکا کر کچھ سوچنا شروع کیا اور اس بلائے ناگہانی کے دفعیہ کی تدبیر سوچنے لگی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا سر اُٹھایا، اس طرح کہ معلوم ہوتا تھا وہ کوئی غیر متزلزل عزم کر چکی ہے۔

اس نے جلدی سے زینہ طے کیا اور صاحبزادی کو دیکھا کہ بن ٹھن کر مقام معہود پر جا رہی ہیں اس نے جھپٹ کر دامن پکڑ لیا تو صاحبزادی گھبرا کے دیکھنے لگیں اور غرانے لگیں: "کیوں کیا ہے؟ تم کیا چاہتی ہو؟ کیا تم میری نگہبان و اتالیق ہو؟"

اس نے کہا: "نہیں! میری اتنی مجال کہاں؟" یہ کہکر اس نے سارا قصہ دہرایا اور یہ بھی بتلا دیا کہ اس وقت اس درخت کے نیچے خود پدر بزرگوار جلوہ فرما ہیں، لیکن اس نے تسلی دی اور کہا کہ تم مت گھبراؤ، غالباً تمہارے والد کو یہ نہیں معلوم کہ وہ خط کس کے نام ہے، اب تم اپنے کمرہ میں واپس جاؤ اور تمہارے بجائے میں وہاں جاتی ہوں اور مجھے دیکھ کر اگر تمہارے متعلق کوئی خیال ہوگا بھی تو دور ہو جائے گا ــــ وہ بیگناہ لڑکی زینہ سے اتر کر اسی درخت کے نیچے پہونچ گئی، اس کے پہونچنے کے بعد اس بدکردار لڑکی کا شریف باپ اپنی جگہ سے نکلا قریب آیا تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، اس نے کہا شکر ہے کہ خدا نے میری عزت رکھ لی اور تو یہاں نظر آئی، میں نے تیرے ساتھ اسی لئے سلوک کیا تھا کہ تو ایسی ناپاک حرکتیں کرے، میں تو اپنی بھولی بھالی لڑکی کو سمجھ رہا تھا کہ اس فعل شنیع کی مجرم وہ ہے" تیر اگناہ اس کے سر تھوپ رہا تھا، جو ناکردہ گناہ تھی، بدبخت! تو کسی احسان کی مستحق نہیں جا دور ہو، میرے گھر کو اپنے ناپاک وجود سے خالی کر دے"۔

لڑکی نے یہ الفاظ سُنے اور دامن سے اپنا منہ چھپا کر چپ چاپ نکل کھڑی ہوئی، ایک نہر کے کنارہ پہونچ کر اس نے اپنی پوٹری سے ایک کاغذ نکال کر کچھ لکھا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں:- "اس نے مجھ پر بیحد و نہایت احسانات کئے تھے، میں نے آج اس کا عیب چھپایا، اس کی لڑکی کی جان بچائی اور خود اپنی جان اس معاوضہ میں کھو دی، الحمدللہ"

صبح کو پولیس نے نعش صاحب خانہ کے حوالہ کر دی، نعش دیکھ کر اسے بہت صدمہ ہوا اور وہ بے اختیار رونے لگا، اسے اپنی گزشتہ حرکت پر سخت ندامت ہوئی پھر تجہیز و تکفین کا حکم دیا۔ اس کے پاس لڑکی کی کوئی یادگار نہیں باقی رہ گئی تھی سوا ایک چھوٹی سی پوٹری کے جسے اس نے احتیاط سے اپنے صندوق میں رکھ لیا تھا۔

اس سانحہ کو مدت گزر گئی۔ دن رات میں بدلتے رہے اور رات دنوں میں تبدیل ہوتی رہی، ہفتے مہینے بنے اور مہینوں نے سالوں کی صورت اختیار کی۔ اب رفتہ رفتہ صاحب خانہ کو اپنی صاحبزادی کے اخلاق و کردار کے متعلق زیادہ آگاہی ہوئی، وہ حالات معلوم ہوئے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے، ان واقعات نے مضمحل اور پژمردہ کر دیا تھا، ایک روز یوں ہی بیکاری میں بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا گئی تو اس نے اپنا صندوق الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ اس میں اس لڑکی کی وہ پوٹری بھی نظر آئی جسے اس سے قبل اسنے کھولا بھی نہیں تھا، لیکن ایک خط ملا جسے اس نے پڑھنا شروع کیا اور جب ان الفاظ پر پہونچا جو لڑکی نے جان دینے سے پیشتر لکھے تھے تو اس پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ابھی اچھی طرح وہ پڑھ بھی نہیں چکا تھا کہ سب کچھ سمجھ کر شدت رنج و الم سے وہ بیہوش ہو کر گر پڑا، یہی غشی اس کے لئے مرض الموت ثابت ہوئی، نہ افاقہ ہونا تھا نہ ہوا، کبھی کبھی ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی کبھی اچھا ہو جاتا، پھر بیمار پڑ جاتا تا آنکہ اس نے ایک روز اپنی جان، جان آفریں کو سپرد کر دی۔

رئیس احمد جعفری

نیا شوالہ

(۱)

پدماندی کے کنارے شیوجی کا ایک خوبصورت مندر تھا، پیپل کا بڑا سایہ دار درخت مندر کے مذہبی وقار میں اور اضافہ کر رہا تھا، تلسی کا مقدس پودا ایک بلند مقام پر اُگا تھا، گیندا اور جُہاسی کے پھول مندر کے احاطے میں کھلے ہوئے تھے، ایک بلند بانس پر جھنڈا لہرا رہا تھا جس پر ہنومان جی کی تصویر تھی۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز دور سے مندر کا پتہ دیتی تھی، پدماندی مندر کے چرن میں عقیدت مندانہ شان سے بہ رہی تھی، شیوجی کا مندر قرب و نواح کا مشہور مندر تھا، یہاں دور دور سے لوگ نذر عقیدت چڑھانے آتے تھے، مندر کا نوجوان جوگی ستوتی گرو کا بڑا چیلا تھا گرو جی اسے بہت عزیز رکھتے اور اس کی قدر و منزلت فرماتے تھے۔ نوجوان جوگی بڑا گیانی تھا، وہ دن رات تپسیا کرتا رہتا، ہر کس و ناکس سے اس کا برتاؤ نہایت ہی محبت آمیز ہوتا تھا، رات کو پیپل کے نیچے کتھا ہوتی تھی، وید پران کا درس دیا جاتا، مہابھارت، رامائن کی کہانی سنائی جاتی گاؤں کے لوگ کتھا سننے کے لئے جمع ہو جاتے۔ صبح کو بھجن گائے جاتے تھے اور اسی قسم کے مذہبی مشاغل سے مندر کی دنیا آباد رہتی تھی، گاؤں کے زن و مرد صبح کو پدماندی میں اشنان کر کے مندر میں جل ڈالتے اور پھول چڑھانے آتے اور جوگی سے آشیرباد لے کر چلے جاتے تھے۔

(۲)

کامنی تڑکے اشنان اور پوجا کے لئے ندی کنارے آتی تھی، سنہری دوب پر چلتے ہوئے وہ سہری معلوم ہوتی، اس کی ملاحت اور شگفتگی پر سحر کی تمام رعنائیاں قربان تھیں۔ مندر میں پوجا کرتے وقت تو وہ خود دیوی بنجاتی تھی اور اسے دیکھ کر ہر شخص اپنے دل میں جذبۂ ایمان و عقیدت کو قوی تر پاتا تھا۔ اس کا محو عبادت ہونا خود پرستش کی چیز تھی ــــــ
نہ معلوم کیوں ایک ہفتے سے وہ پوجا کے لئے بہت زیادہ سویرے آنے لگی تھی۔ اس کی شوخ اداؤں میں تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ اس کی پیاری پیشانی پر شکن کی چند لہریں بھی دکھائی دیتی تھیں، کامنی کچھ کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی۔ مندر کے سایہ میں پہونچتے ہی اس پر وحشت برسنے لگتی جسے وہ بہت سنجیدگی سے چھپانے کی کوشش کرتی، پوجا کے وقت اسکی محویت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا اور کون جانتا ہے کہ اس وقت اس کی دل ربا آنکھیں پرنم نہ ہو جاتی تھیں ــــ جب مندر کا جوگی اسے آشیرباد دینے آتا تو وہ اپنے چہرے پر سے سارے اثرات کو محو کرنے کی ناکام کوشش کرتی ــــ مگر ناکام

اس کا چہرہ تمتما اٹھتا، نظریں نیچی ہو جاتیں اور وہ بالکل سمٹی سمٹائی نظر آتی تھی۔

دن گزرتے گئے اور کامنی کا معمول وہی رہا، وہ بہترین پھولوں کا تحفہ لاتی اس کے گوندھے ہوئے ہار اور منتشر پھول سارے چڑھاووں میں بہت زیادہ نمایاں ہوتے، وہ دل میں عقیدت، آنکھ میں پیار، نگاہوں میں محبت لے کر مندر آتی اور درد، مایوسی و مجبوری کی تصویر بن کر واپس جاتی۔ اس کی اس سوگوار کیفیت کو مندر کا جوگی بہت دنوں تک نظر انداز نہ کر سکا اور ایک دن کامنی سے از راہ تلطف دریافت کیا —— "بچی تو اس قدر اُداس کیوں رہتی ہے ؟ پرماتما تیرا بھلا کرے" کامنی اس کا کچھ جواب نہ دے سکی، پھوٹ پڑی اور بہت دیر تک روتی رہی، غالباً یہ سب سے زیادہ قیمتی چڑھاوا تھا جو مندر میں چڑھایا گیا۔ جوگی نے اس کی بہت دل دہی کی، لیکن اس کا ہر فقرہ کامنی کو اور زیادہ گریاں کر دیتا۔ کچھ دیر کی تسلی و تشفی کے بعد جوگی یہ کہہ کر چلا گیا۔ "جا بچی تجھے پرماتما سکھی رکھے!"

اس کی آواز میں رقت تھی اور کامنی کا تو عجیب حال تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود آنسو بن کر گھل جائے گی جب جذبات کا طوفان تھما اور آنسو کا سیل رکا تو سوگوار کامنی اپنے گھر چلی گئی، مگر کس حال میں!

(۳)

کامنی کے چلے جانے کے بعد جوگی مندر میں جا کر رات کی کتھا کے لئے پران کا پاٹھ کرنے لگا، مگر آج اس کے مطالعہ میں کوئی چیز حایل ہوئی جا رہی تھی، اس کی یکسوئی تباہ ہو چکی تھی، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کسی کے آنسوؤں کی یاد نے مقدس کتاب کی تحریر کو سراسر دھو ڈالا تھا، لیکن یہ ضرور ہوا کہ الفاظ دھندلے پڑ گئے، ایک خاص خیال تھا جو سب پر چھایا جا رہا تھا جب گیانی جوگی منو مہاراج کے اس قول کو پڑھ رہا تھا کہ "عورت کسی حالت میں اعتماد کے لائق نہیں عورت ایک سانپ ہے، عورت سے دل کا کھیل مت کھیلو"۔ اس کا دل رک رک کر دھڑکنے لگا، اور اس کی زبان کی روانی رک گئی، وہ کچھ سوچنے لگا، آج پہلی بار اسے منو مہاراج کے زریں قول پر شک پیدا ہوا، ہر چند کہ وہ اس نظریہ کا بالکل مخالف نہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں تبدیلی پیدا کرنی ضرور چاہتا تھا۔ یہ سمجھتا اس کا پہلا کفر جایان سے زیادہ قریب تھا۔ ہر عورت اعتماد کے قابل نہیں۔ عورت ایک گلاب کا پودا ہے، جن میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ یہ تھے تبدیل شدہ نظریئے کے پہلے دو اجزاء، اور تیسرے جزو کے متعلق جوگی قطعی رائے قائم کرنے سے معذور تھا وہ اس مقام سے آگے بڑھ گیا، لیکن اس کے دماغ میں یہ ٹکڑے چکر لگاتے رہے اسے مطالعہ بند کر دینا پڑا اور وہ پودوں میں پانی ڈالتے چلا گیا، لیکن ہر پھول کو دیکھ کر کسی کا جمال صبیح اس کی نظروں میں پھر جاتا پودوں کی شادابی دیکھ کر اسے کسی کی رعنائی یاد آ جاتی اور گھاس پر شبنم کے قطروں کو دیکھتے ہی کسی کے قیمتی آنسوؤں کا خیال اس کے دل میں گداز پیدا کر دیتا، اب جوگی کو بجائے پرماتما کی قدرت کے ہر شے میں کسی ارضی دیوی کی جھلک دکھائی دینے لگی۔

وہ دن بھر کسی کے دل پذیر تخیل میں محو رہا —— غروب آفتاب سے پہلے کامنی گاگر میں جل لانے ندی کے کنارے جاتے ہوئے مندر کے قریب سے گزری، جوگی نے اس زہرۂ ارضی کے حسن ملائک فریب کو دیکھا اور لرز کر رہ گیا ——

ڈوبتے ہوئے آفتاب کی مضمحل کرنوں میں آنسو کے دو قطرے سرمژگاں ستارۂ شام کی طرح چمکے، اور جوگی کے دامن کو مقدس بنا کر لازوال ہو گئے۔ اب جوگی منوجی کے نظریئے کے تیسرے ٹکڑے پر بھی اپنی قطعی رائے قائم کر چکا تھا —— دل تو پہلو میں صرف اس لئے دھڑکتا ہے تاکہ اسے کسی عورت کے قدموں پر نچھاور کر دیا جائے، چاہے وہ اسے ٹھکرا دے یا اس کے قریب سے بے نیازانہ گزر جائے —— یہ تھا نوجوان جوگی کا تراشیدہ نظریہ —— رات کو کتھا ہوئی جوگی نے منو مہاراج کے مذکورہ قول پر سخت نکتہ چینی کی، بہت سے لوگ محو حیرت تھے اور جوگی کی زبان قینچی سی چل رہی تھی، مگر پلیو زندگی کی محبت کا نقشہ کھینچ کر اس نے رائے عامہ کو اپنے خیال کا پیرو بنا لیا تھا، جوگی کے سیلاب دلیل کے سامنے منوجی کی روح بھی ایک تنکے کی طرح لرزاں تھی —— کتھا ختم ہوئی، جوگی اپنی کٹیا میں چلا گیا ——

اس کی زندگی کی یہ سب سے اہم رات تھی، آج اس کے دل کے مندر میں محبت کی دیوی براجمان تھی، جس کی پوجا شور ناقوس میں نہیں کی جاتی، بلکہ رات کی خاموشیوں میں، جس کے حضور بھجن گائے نہیں جاتے، بلکہ جس کی عبادت "گریۂ خاموش" سے ہوتی ہے، جس کے آگے چڑھاووں کے عوض آنسوؤں کے ہار ہدیۃً پیش کئے جاتے ہیں جس کا ہر پلو دیں پھول ایک دنیائے محبت کی تصویر ہوتا ہے، نوجوان جوگی کے بیدار دل میں ایک زندہ خلش کروٹیں لے رہی تھی ایک لذت آگیں درد ایک بے چین کر دینے والا گداز —— اس نے رات بسر کی لیکن دل نوازِ صبح کی یاد میں۔

(۴)

—— ابھی سپیدۂ سحر اچھی طرح نمودار نہ ہوا تھا کہ جوگی اُٹھ بیٹھا، زہرۂ آسمان اس پر مسکرا رہی تھی، وہ سراپا کانپ رہا تھا۔ اس کی ساری تمنائیں آنکھوں میں کھنچی آ رہی تھیں وہ تلسی کے مقدس پودے کے پاس کسی محبت نامہ کی جستجو کر رہا تھا، جس نے اس کے نظام زندگی کو درہم برہم کر دیا تھا، آج وہ اُٹھ کر پہلی بار مندر کا گھنٹہ بجانا بھی بھول گیا، وہ سراپا انتظار تھا —— صبح ہوئی ستارے جھلملا جھلملا کر رخصت ہوئے ہر جگہ آثار حیات پیدا ہونے لگے، پرندوں کے دلکش نغموں نے آمد سحر کا اعلان کر دیا اور ہر جاندار اپنی تمنائے ہوئے اُٹھا —— کامنی بھی جس کی آنکھیں رات کو جاگ کر "سحر بیدار" ہو گئی تھیں پو پھٹتے ندی میں اشنان کرنے آئی "صبح معصوم" کی قیامت خیزیوں نے ندی کی موجوں میں بھی زندگی پیدا کر دی اور لرزاں موجیں کامنی کے بلوریں جسم سے ایک بار مس کر جانے کی آرزو لئے ہوئے بڑھیں اور کامیاب ہوئیں۔ اس لمس سے نازک نورانی لہریں پیدا ہوئیں، اور فضا میں ایک دلکش لطیف نغمہ پھیل گیا، کامنی اشنان کر کے مندر کی طرف چلی جیسے کوئی حور آب کوثر سے نہا کر نکلی ہو، اور ندی دیدۂ حیران ہو کر اسے دیکھتی رہی، کامنی آج مندر جانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن آہ! راستہ تو اسی طرف ہو کر گیا تھا، مندر کے دروازہ پر پہنچ کر وہ خود بخود اندر کھنچ گئی وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کر رہی ہے، مندر کے اندر آج وہ اپنے نازک جسم پر کسی کی جذبات سے لبریز نگاہوں کا بار محسوس کر کے شرمائی جا رہی تھی، وہ جلد پوجا میں مشغول ہو گئی اور سراپا ایک اثر خیز دعا بن کر مستجاب ہوئی جا رہی تھی لیکن وہ پورا تھا کرنے

سے بھی قاصر تھی، آج کامنی خود ایک "گریۂ مسلسل" "ایک حسین تمنا" "ایک رنگین درد" بن گئی تھی ——— اس جمیل و ساحر منظر کی نوجوان جوگی تاب نہ لا سکا اور بے تابانہ کامنی کی طرف بڑھا، کامنی لجاونی کی طرح سمٹ گئی اور چونک اٹھی جوگی جوگی بے پناہ جوڑ رہا تھا بولا ——— "اے میری سرمایۂ حیات! اے محبت ناک لڑکی! اے وہ کہ جس نے میرے دل میں قیامت برپا کر دی ہے، جس نے میری روح تک کو اپنا اسیر بنا ڈالا ہے، مجھے اپنے قدموں پر مٹ جانے دے! میں تیرے حضور اپنے دل کا ادنیٰ تحفہ لایا ہوں، اسے قبول کر! ——— اے میرے دل کے مندر میں بسنے والی دیوی مجھے اجازت دے کہ تیرے قدموں سے آنکھیں ملوں ..... !" کامنی لجاتی ہوئی بولی ——— "جوگی جی مہاراج آپ میرے دھرم گرو ہیں، میں آپ کی داسی ہوں ......" وہ اور کچھ نہ کہہ سکی لیکن وہ اپنے دل ربایانہ انداز اور خاموشی سے بہت کچھ کہہ رہی تھی ——— نوجوان جوگی بے خودانہ انداز سے پھر کامنی سے مخاطب ہوا ——— "آہ! دھرم گرو بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے وہ بھی مستغنی نہیں ——— ایک بار محبت کا سبق سیکھنے کے بعد گرو اور چیلے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، آؤ، اب تو میں تیری پوجا کرتا ہوں ——— چل! ایک نامعلوم دنیا میں چل جہاں ہم ایک نیا شوالہ تعمیر کر سکیں جس کی بنیادیں پریت اور محبت پر ہوں جہاں میں تیری الفت کی سمرن جپ سکوں اور تیری پوجا اپنی بہترین عبادت سمجھوں ......" ——— یہ کہہ کر جوگی رونے لگا اور کامنی بھی محبت کے آنسو بہا رہی تھی .... یہ تھا ان کا پیمانِ وفا، نازک لیکن بہت زیادہ مستحکم، فرشتوں نے اس منظر پر کیٹ کو دیکھا اور محوِ حیرت رہ گئے کیونکہ انھوں نے بھی خدائے قدوس کے حضور میں کبھی اس سے زیادہ خلوص و محبت کا جذبہ پیش نہ کیا تھا۔

اختر - اُرینوی

قولِ فیصل

حضرت علی اختر اختر حیدرآبادی کی معرکۃ الآرا نظم جس میں شاعر و شیطان کو ایک دوسرے کا فریق قرار دے کر کائنات کے خیر و شر، مذہب و اخلاق کی ضرورت اور فلسفۂ تکوین کو پیش کرتے ہوئے خدا اور اس کی حقیقت پر نہایت حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، حضرت اختر اس وقت ہندوستان کے تنہا فلسفی شاعر ہیں، جو پختگی کلام، علوئے فکر اور خیالات کی گہرائی کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے - ایک ایک شعر موتی کی لڑی ہے اور اس کا ہر ہر لفظ جڑا ہوا نگینہ، یہ نظم ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے - بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ دو پونڈ کے دبیز کاغذ پر مع رنگین گرد پوش کے شائع ہوئی ہے -

قیمت دو روپیہ (عہ)

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

تخلیقِ شاعر

(ایک ہندی گیت سے ماخوذ)

شاعر نے کرسی اپنی بیوی کی کرسی سے قریب کھینچ لی اور محبت آمیز انداز سے اس کی شگوں زلفوں میں شانہ کرنے لگا اس نے کہا "افسانہ یقیناً دلچسپ ہوگا - تم مجھے پڑھ کر ضرور سناؤ گی - اور بتاؤ گی کہ اس نے ہماری زندگی میں کیونکر انقلاب پیدا کیا؟" اس کی بیوی نے میز سے ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگی -

"ہندوستان کی کسی بستی میں ایک دوشیزہ رہتی تھی - جس کا نام کملا تھا - وہ کنول کے پھول سے زیادہ حسین تھی مگر وہ کسی آدمی سے شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتی تھی، لوگوں میں مشہور تھا کہ درپردہ اس کا کسی مرد سے ارتباط ہے چنانچہ اس کی ماں بھی اس سے اکثر شادی کے متعلق استفسار کرتی رہتی -

آخر کار ایک دن لڑکی نے اقرار کر لیا کہ:

"بے شک میں اپنا دل ایک من موہن کی نذر کر چکی ہوں - مگر مجھے یہ معلوم نہیں - کہ وہ کون ہے - اور کہاں سے آتا ہے - کیونکہ وہ رات کی خاموشی اور تاریکی میں میرے پاس آتا ہے - اور صبح ہونے سے قبل مجھے چھوڑ کر روح کی طرح غائب ہو جاتا ہے" - اس کی ماں نے اسے مشورہ دیا - کہ وہ دروازے اور کھڑکیاں شام سے قبل بند کر دے - تاکہ وہ صبح کو اسے دیکھ سکے، ہرچند کملا کو فریب کاری مرغوب نہ تھی - مگر وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ کسی طرح وہ اپنے محبوب خیال کا پورا حال معلوم کرے، چنانچہ اس نے ماں کے مشورہ پر عمل کیا - جب صبح مرغ نے بانگ دی، تو اس نے کملا سے کہا کہ وہ اب جانا چاہتا ہے - مگر کملا نے اسے یقین دلایا کہ ہنوز صبح نہیں ہوئی - مگر جب اس نے جانے پر اصرار کیا تو کملا نے جلدی سے کھڑکی کھول دی - تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے - مگر اس پر روشنی کی کرن پڑتے ہی ایک کڑکتی صدا سنائی دی کہ ———

——— "تم پر دن کی روشنی نے غلبہ پا لیا ہے - اس لئے تمھیں ہمیشہ کے لئے زمین پر رہنا ہوگا"

"چنانچہ اس طرح ایک فرشتہ کو فانی انسانوں میں تبدیل کر دیا گیا، اور گو اسے کملا سے بہت الفت تھی - اور اس سے شادی بھی کر چکا تھا - لیکن کملا کو تمام عمر پشیمانی اس حرکت پر تاسف رہا - جس کی وجہ سے اس کے خاوند پر آسمان کے دروازے بند کر دئے گئے" پڑھنے والی کی شیریں آواز ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی -

وہ بولی: "کہانی کا باقی حصہ ہم سے متعلق نہیں اب میں تمھیں اپنی زندگی کا افسانہ سنانا چاہتی ہوں"۔

شیاما کی سرمہ سا آنکھیں غصہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ انّا کو گھور رہی تھی۔ اور اپنا ننھا پاؤں زور زور سے فرش پر پٹخ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دروازے پر اس شدت سے پیوستہ لگ رہے تھے۔ کہ اس کشمکش میں اسکی ساری سر سے ڈھلک کر پشت پر آ رہی۔

"میں ضرور اندر جاؤں گی۔ میں اماں کے پاس جاؤں گی۔ حرامخور انّا! جا، دفع ہو جا"۔

—"بی بی تمھاری اماں نے کہا تھا کہ تم باغ میں جا کر کھیلو۔ آؤ میں تمھیں ایک اچھا کھیل بتاؤں"

—"میں کھیلنا نہیں چاہتی۔ میں اماں کے پاس جاؤں گی"۔

شیاما انتہا ضدی واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اور گھر کے تمام آدمی اسے چاہتے تھے۔ بلکہ خائف بھی رہتے تھے۔

وہ یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ اُسے کسی ایسے فعل کے علم سے تاریکی میں رکھا جائے جو اس کے مکان کی چار دیواری سے متعلق ہو۔ وہ غیر معمولی ذہنیت کی مالک تھی۔ اور وہ اس قوت سے اکثر کام لیا کرتی تھی۔

آج صبح اس کی والدہ نے اسے حکم دیا کہ وہ انّا کے ساتھ باغ میں جا کر کھیلے۔ کیونکہ وہ بہت مصروف تھی۔ مگر جونہی شیاما کو یہ حکم ملا وہ اس مصروفیت کی حقیقت معلوم کرنے پر تل گئی۔ اور انّا سے تکرار کرنے لگی۔

چونکہ انّا کسی طرح نہ مانتی تھی، اس لئے اس نے ایک نئی تدبیر سوچی۔ وہ بولی:

"اچھا انّا، تم باغ میں چلو۔ میں اپنے کمرے سے گیند اور بلا لے کر آتی ہوں"

انّا اس فوری انقلاب پر حیران تو ہوئی۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کے خیال سے اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ شیاما کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ وہ باغ میں غائب ہو گئی۔ اور اس کے بعد شیاما دبے پاؤں والد کے کمرہ سے گزر کر ماں کی مصروفیت کا سراغ لگانے کی غرض سے اس کے کمرہ میں داخل ہو گئی۔

یہ تھی وہ فطرت جس کا مظاہرہ شیاما بچپن میں کیا کرتی تھی۔

جب شیاما جوان ہوئی۔ تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اُن کے خیال میں یہ امر ان کی بہت تذلیل تھی۔ کہ ان کی لڑکی کو کوئی موزوں خاوند نہ ملے۔ شیاما کی رائے اُن سے مختلف تھی۔ لیکن بظاہر ان کی تجاویز سے اتفاق کرتی رہی۔ اسے اپنے گھر اور والدین سے عشق تھا۔ اس لئے یہ گوارا نہ تھا۔ کہ وہ اپنی زندگی کی مسرتوں کو کسی مرد کی نذر کر دے۔ خصوصاً ایسے آدمی کے جس سے اس کی شناسائی بھی نہ ہو۔ اور وہ عمر میں بھی اس سے بڑا ہو۔

وہ اپنے آپ سے کہا کرتی۔

"مجھے سب سے پہلے خود اپنے شباب سے محظوظ رہنا ہے۔ میں شادی کر کے ناکارہ نہیں ہو جانا چاہتی۔ اور نہ مجھے بچے پیدا کرنا اتنا مرغوب ہے۔ میں کالج میں داخل ہونے کو شادی پر ترجیح دیتی ہوں"۔ شیاما اور اس کے والدین میں خوب بحث ہوئی۔ وہ اپنی تجویز پر مُصر تھے۔ اور اُن کے نزدیک اس کا کالج میں داخل ہونا دولت اور وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ شیاما نے کہا۔

"لیکن میں تحصیل تعلیم کے بعد شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ فی الحال مجھے کالج میں داخل ہونے کی اجازت دیدیجئے خدا کے لئے ...."

اس کے دلائل غیر موثر ثابت ہو رہے تھے۔ مگر اس کے والدین محسوس کر رہے تھے۔ کہ انھیں شکست تسلیم کرنی ہوگی۔ چنانچہ جب انھوں نے مجبوراً اپنی رضامندی ظاہر کی۔ تو اس کے ساتھ ہی شیاما کو سخت سست الفاظ بھی سننے پڑے۔ اور تنبیہ کر دی گئی کہ اس تعلیم کے نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

شیاما کو نتائج کی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے کالج میں داخل ہو گئی۔

اس کا پہلا سال نئی فضا سے مانوس ہونے میں گزرا۔ وہ اپنی ہم عمر ہجولیوں کی صحبت میں بہت خوش رہتی۔ اور کالج کی دلچسپ مصروفیتوں اور علمی دلچسپیوں سے پورا پورا لطف اُٹھاتی۔

اس کا مرغوب مضمون ادب تھا۔ اور اگر وہ جانبداری سے کام نہ لے۔ (یہاں افسانہ نگار کے ہونٹوں پر ایک لطیف تبسم کھیلنے لگا) تو اسے یہ اقرار کرنے میں باک نہ ہونا چاہئے۔ کہ ادب کا معلم بھی بہت دلچسپ انسان تھا۔ وہ کالج میں سب سے کم عمر معلم تھا۔ وہ ایک خوشرو نوجوان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت اندرونی ابتہاج کی وجہ سے مسکراہٹ رہتی تھی۔ اس کا نام منوہر جی تھا۔ تمام طلبہ اُسے دوسرے پروفیسروں کی ضد سمجھتے تھے۔ اس کا لکچر بہت دلچسپ ہوتا تھا۔ اور اس کی علمی قابلیت غیر معمولی تھی۔ خصوصاً شیاما کے لئے وہ دیوتا سے کم نہ تھا۔ کیونکہ اسی پروفیسر کی بدولت اسنے نظم کی خوبیوں کو سمجھنا سیکھا تھا۔

کالج کے تمام طلبہ اُسے چاہتے تھے۔ اور اس کی عزت کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود شیاما کی طرح اس کے مضمون سے دلچسپی نہ لیتے تھے۔ چنانچہ نصف سال کے عرصے میں وہ اس مضمون کو اس قدر چاہنے لگی۔ کہ اس کا جی دوسری مصروفیتوں میں بالکل نہ لگتا۔

شیاما کا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ ایک شام اس کی ہم جماعتوں نے اُسے ٹینس کھیلنے کی دعوت دی۔ اُس نے

جو خوشی منظور کر لی۔ کیونکہ اسے یہ کھیل بہت مرغوب تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنا وقت کسی نہ کسی طرح کاٹ دینا چاہتی تھی، کیونکہ منوہر جی چار دن سے رخصت پر تھے۔ اور ان کے دلچسپ لکچروں کے بغیر وہ اپنی زندگی میں کچھ ناگوار خلا سا محسوس کر رہی تھی۔ تیسرا سٹ کھیلا جا چکا تھا کہ ایک لمبا چپلا خوش رو نوجوان جامعہ سے نکل کر ٹینس کے میدان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

شیاما کا دل قدموں کی مانوس چاپ سن کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر یہ سوچ کر کہ وہ تماشائی کی حیثیت سے آ رہا ہے اس نے اپنی تمام مساعی کھیل کے مظاہرہ میں صرف کر دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس روز وہ اس رعنائی سے کھیل رہی تھی کہ ایک انجان تماشائی بھی داد دئیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

جب شیاما کی ایک کاری ضرب نے کھیل کا خاتمہ کر دیا تو پروفیسر نے بہت تعریف کی اور وہ اپنی کامیابی پر بہت مسرور ہوئی۔ پروفیسر بولا:

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس قدر اچھا کھیل سکتی ہو۔ اچھا کسی وقت میرے ساتھ کھیلنا۔"

اس نے کہا: "بہتر، آپ کیسے ہیں؟"

"شکریہ، میں اچھا ہوں"

میں دراصل تمہیں وہ شعر بتانے آیا تھا۔ جس کے متعلق تم نے گزشتہ ہفتہ مجھ سے استفسار کیا تھا۔ وہ اردو کی ایک رزمیہ نظم کا شعر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ آ سکو۔ تو میں تمہیں کتاب بھی دے سکتا ہوں۔"

شیاما نے زیر لب اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے ساتھ ہو لی۔

اس نے پوچھا: "تو تمہیں نظم سے دلچسپی ہے"

"جی ہاں – مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہارا آخری مضمون خوب تھا۔ مگر صحیح ذوق رکھنے والے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ دلچسپی کا اظہار یوں سب کرتے ہیں۔ لیکن صحیح طور پر دل سے محسوس کرنے والے کم ہوتے ہیں۔"

دونوں جامعہ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ پروفیسر نے الماری سے کتاب نکالی۔ اور بولا:

"اسے لے جاؤ، مگر احتیاط سے رکھنا۔ کیونکہ اس کا دوسرا نسخہ ہمارے کتب خانہ میں نہیں ہے۔"

شیاما نے شکریہ ادا کیا۔ اس کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ ایک لمحہ کے لئے پروفیسر کے ہاتھ میں رہا۔ اور پھر وہ چلی گئی۔ راستہ بھر اس کا دل اچھل اچھل کر اس کی پسلیوں سے ٹکراتا رہا۔

"لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں۔ جو صحیح طور پر دل میں محسوس کرتے ہیں۔"...... وہ دل میں دہرا رہی تھی۔

مگر میں تو محسوس کرتی ہوں۔ دنیا میں نظم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ خوبصورت خیالات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے سے بہتر کیا کام ہو سکتا ہے؟

شیاما تین ماہ تک کالج کے وقت کے سوا پروفیسر سے نہ ملی۔ ایک دن باقی جماعت کے چلے جانے کے بعد اسے اچانک پروفیسر نے بلایا۔

"تمہارا جواب مضمون بہت اچھا تھا" اس نے کہا "مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم ایک قابل نقاد بن سکتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری چند مختصر نظموں کو ایک نظر دیکھ لو۔ کیا تم ایسا کر سکو گی؟"

شیاما کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ کہ وہ بمشکل گفتگو کر سکتی تھی۔

"یقیناً بڑی خوشی سے۔ مجھے اس میں راحت محسوس ہو گی"

کچھ دیر کے بعد اس کے ڈسک پر ایک چھوٹا سا پلندہ پڑا ہوا تھا۔ وہ پلندہ کو اس حفاظت سے گھر لے گئی۔ گویا دنیا کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس نے شام کا کھانا کھاتے ہی مطالعہ کا عذر کر کے والدین سے رخصت لی۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چند گھنٹے بعد وہ میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے لکھا:

"یہ نہایت بلند نظمیں ہیں۔ صحیح اور پاکیزہ جذبات سے لبریز۔ میں آپ کی اس عزت افزائی کی بہت ممنون ہوں۔ آپ نے میرے مطالعہ کے لئے جو گوہر پارے عنایت فرمائے ہیں ان میں صحیح مشرقی شاعری کا اوج ہے۔ آپ نے مجھ سے صداقت کے اظہار کے لئے اصرار کیا تھا۔ سو میں سب کچھ سچ کہہ رہی ہوں آپ کا تخیل بہت بلند ہے" دوسرے دن اس نے تمام نظمیں رقعہ کے ساتھ لوٹا دیں۔ پروفیسر نے رقعہ خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔ اس نے شیاما کی طرف ایک نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ اور پھر چند ماہ تک وہ ایک دوسرے سے بالکل نہ ملے۔ مگر یہ فراق دیرپا نہ تھا۔ وہ شروع ہی سے ایک دوسرے کی طرف آپس میں کشش محسوس کرتے تھے۔ پروفیسر نے اسے ایک دن کی سیر کے لئے دعوت دے دی۔ وہ شرما گئی اور کچھ سوچنے لگی آخر کار اسے کہنا پڑا۔

"شکریہ – میں آپ کے ساتھ چلوں گی"۔

ان کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ پہلے پہل ہر آنے والا دن دونوں کی زندگی میں ایک نئی مسرت کا اضافہ کرتا۔ دونوں اکٹھے رہتے اور ہر کام باہم مل کر کرتے۔ مگر اب کچھ انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ وہ شام تک تو شیاما کے ساتھ رہتا لیکن کھانے کے بعد کام کرنے کے لئے چلا جاتا۔

وہ کہتا: "تمہیں بھی کچھ کام کرنا چاہئے، مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے دار المطالعہ میں آ کر بیٹھ جاؤ۔" پھر وہ گفتگو کا انداز بدل کر کہتا: "جب تم وہاں ہوتی ہو۔ تو مجھے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے۔ اور چونکہ مجھے کام کرنا ضروری ہے۔ اس لئے تمہیں اس میں دخل نہیں چاہئے..........."

شاید یہ حقیقت کا سبز رنگ تھا۔ جو شیاما ان الفاظ کو سن کر محسوس کرتی۔ مگر وہ مجبور تھی۔ اس لئے اسے اس تجویز سے اتفاق کرنا پڑتا تھا۔ اور اکثر اسے شام کو تنہا بیٹھنا پڑتا۔ مگر اس حال سے اسے غیر معمولی ذہنی اذیت برداشت کرنی پڑتی۔ اسے تنہائی سے

نفرت تھی۔ اور اب بلا وجہ اسے تنہائی کی مصیبت اٹھانی پڑتی — مگر کیا یہ تکلیف درحقیقت تنہائی کی وجہ سے تھی؟ نہیں۔ بلکہ یہ اس کی بچپن کی وہ فطری بغاوت تھی۔ جو اب عود کر آئی تھی۔ وہ شام کے اکثر گھنٹے کرب میں گزارتی۔ اسے اپنی ذمہ داری اور اطاعت کا پورا احساس تھا۔ مگر یہ عذاب بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ اس نے مجبور ہو کر خاوند سے درخواست کی کہ وہ صرف اسے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدے اور وہ اس کے کام میں مداخلت نہ کرے گی — اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ۔

"اگر میں تمہیں کام بتا دوں۔ یا تمہیں اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدوں تو میرا کام بگڑ جائے گا۔ اس لئے تمہیں اس کام میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔"

شیاما ان دلایل کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے اپنی خواہش پر قابو نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ دبے پاؤں دار المطالعہ کے باہر پہنچ گئی۔ اور بند دروازے کی کنجی کے روزن کے ساتھ کان لگا کر سننے لگی۔ شاید اس کا یہ فعل شرمناک حد تک قبیح تھا۔ مگر اس کے احساس کے باوجود وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

وہ سُن رہی تھی اور اس کے چہرے پر حیرانی سے شکنیں پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک دھیمے سُر میں خود ساختہ اشعار گا رہا تھا۔ اشعار صحیح جذبات کا عکس اور نظم کی بہترین رنگینیاں لئے ہوئے تھے۔ اس کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ وہ وہاں بُت کی طرح کھڑی ہو گئی — بالآخر آواز سنائی دینی بند ہو گئی۔ اور شیاما نے حرکت کی۔ اس کا ہاتھ دروازے کے دستے پر تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اندر داخل ہو جائے۔ یا اسے اپنی تخلیق کی مقدس فضا میں تنہا چھوڑ کر چلی جائے۔ اس تذبذب کے عالم میں اس کے کانوں میں اس کہانی کے الفاظ گونجے۔

"تم پر دن کی روشنی نے غلبہ پا لیا ہے۔ اس لئے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین پر رہنا ہو گا۔" چنانچہ اس طرح پر ایک فرشتہ کو فانی انسان میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور گو کُملا سے اُسے بہت اُلفت تھی۔ اور اس سے شادی بھی کر چکا تھا۔ لیکن کُملا کو تمام عمر اپنی اس حرکت پر ندامت رہا۔ جس کی وجہ سے اس کے خاوند پر آسمان کے دروازے بند کر دئے گئے......"

آہ! وہ کیا کرنے والی تھی۔ کیا کُملا کی طرح اپنے خاوند کے الہامی جذبات کو فنا کرنا چاہتی تھی۔ وہ دبے پاؤں پیچھے اُتر آئی۔ اور گو اسے اس راز کے متعلق اپنے خاوند سے استفسار کرنے کی وجہ سے ہر وقت اندرونی خلش رہتی۔ تاہم اسے اس کا اجر مل کر رہا کیونکہ اس کا خاوند دنیا کا ایک نامور شاعر ہو گیا۔ اور وہ وفاداری سے زندگی کے باقی ایام میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔

منوہر جی نے محبت آمیز انداز میں اپنی بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"پیاری شیاما! مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تمہیں میری شاعری کے لئے کتنی قربانی کرنی پڑی ہے۔ اب میں اس کے متعلق ایک گیت لکھوں گا۔"

نسیم رضوانی

افیونی

افیون تو ایک ایسی چیز ہے جس کو اپنے اثرات کے اعتبار سے ایک بنگالی اور ایک بھوٹانی، ایک پنجابی اور ایک آسامی کے لئے یکساں ہونا چاہیئے لیکن اس سلسلہ میں لکھنؤ نے جو شہرت حاصل کی ہے وہ شاید دنیا کے کسی حصہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ بظاہر یہ خصوصیت عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو افیونیوں کو بھی دیکھ چکے ہیں اور اہلِ لکھنؤ سے بھی ملے ہیں اس خصوصیت کی وجہ جانتے ہوں گے کہ "لکھنویت" اور "افیونیت" دونوں اس حد تک متصل ہیں کہ ایک اجنبی کو ایک پر دوسرے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ افیونیوں میں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کے رہنے والے ہوں قدرتی طور پر بہت سی ادائیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو اہلِ لکھنؤ کے لئے مخصوص ہیں اور لکھنؤ کے اس باشندے میں بھی افیون کی سی شان ہوتی ہے جس بیچارے نے کبھی افیون کی صورت بھی نہ دیکھی ہو خدا جانے اس مماثلت کی کیا وجہ ہے لیکن آپ کو چاہیئے کہ ہمارے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے کسی ایسے لکھنوی سے ملئے جو افیونی نہ ہو اور پھر اس کا مطالعہ اس نظر سے کیجئے کہ اس میں "افیونیت" ہے یا نہیں تو آپ کو ہمارے بیان کی تائید کرنا پڑے گی اسی طرح آپ کسی افریقی افیونی کو دیکھئے تو وہ باوجود اپنی ملکی وحشت کے آپ کو اپنی خاص کیفیت میں بہت بڑی حد تک لکھنوی نظر آئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افیون کے استعمال کے بعد انسان اس حد تک شائستہ ہو جاتا ہے کہ اس پر لکھنوی ہونے کا شبہ کیا جائے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اہلِ لکھنؤ نے شائستگی افیونیوں سے لی ہے بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ کچھ "حسابِ دوستاں در دل" والا قصہ معلوم ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے افیونیوں کے متعلق ہم نے اس قدر روایتیں سُنیں کہ آخر ہم کو کسی لکھنوی افیونی سے ملنے کا شوق پیدا ہوا لیکن جب اس شوق کی تکمیل نہ ہوئی تو اس نے رفتہ رفتہ آرزو کی صورت اختیار کر لی۔ ہمارا یہ شوق غالباً بیجا بھی نہ تھا ذرا تصور تو فرمایئے کہ ایک تو افیونی اور پھر لکھنوی یہ دونوں خصوصیات اپنی اپنی جگہ پر تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن جب وہ ایک ہستی میں جمع ہو جائیں تو وہ ہستی ہو گی یا قیامت؟ ایک تو کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ مختصر یہ کہ ہم خدا کی اس عجیب و غریب صنعت کو دیکھنے کے لئے بیچین تھے لیکن اب نہ تو وہ لکھنؤ رہ گیا ہے اور نہ اس کی وہ روایتی خصوصیات باقی ہیں لیکن خداوند کریم تو بڑا مسبب الاسباب ہے اُس نے ہماری جستجو کو ناکام نہ رہنے دیا اور ہم کو بہت جلد میر صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہو گیا۔

میر صاحب اپنے کو شاہی خاندان سے متعلق بتاتے تھے اور اس کا ثبوت پندرہ روپیہ ماہوار کا وثیقہ تھا جو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو بغیر کسی دقت کے برابر مل رہا تھا آپ نہ صرف خالص لکھنوی تھے بلکہ نجیب الطرفین افیونی بھی تھے اور اپنی جماعت

میں اس خصوصیت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے گھر کے اکیلے تھے بیوی بچّوں اور عزیزوں کا لطف اپنی افیون ہی سے حاصل تھا اور وہ اپنے کو افیون کے لئے مٹائے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی کم ہوگی لیکن افیون نے ان کو قبل از وقت بڈھا ہی کا انگور بنا دیا تھا اس کے علاوہ ان کی عام صحت کا یہ حال تھا کہ اگر وہ افیون کے عادی نہ ہوتے تو ان کی موت یقیناً تپ دق سے واقع ہوتی، مگر اب بھی وہ غریب کھانسی، دمہ اور قبض وغیرہ سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ توانائی کا یہ حال تھا کہ اگر میڈیکل کالج کے طلبا ان کو دیکھ پاتے تو اس زندہ انسانی ڈھانچے کو کبھی نہ چھوڑتے اور اپنے کالج کے میوزیم میں مطالعہ کرنے کے لئے یقیناً بند کر دیتے۔ شکل و صورت کا تو ذکر ہی کیا ضعیفی میں انسان خوبصورت تو نہیں البتہ خوبصورتوں کو ہنسانے والی ایک چیز بنجاتا ہے۔ لیکن میر صاحب پر تو معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بوڑھاپا پھٹ پڑا ہے کمر بھی اور گھٹنے اور گھٹنے جھک گئی تھی۔ تمام جسم کی کھال لٹک پڑی تھی چہرہ پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سر کے اُلجھے ہوئے پٹے بھی بے مرمت پڑے تھے اور کھچڑی داڑھی بھی آزادی کے ساتھ جدھر چاہتی تھی پھیل رہی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ انگلیوں کے ناخن بھی قطع و برید سے معاف کر دئے گئے تھے۔ لباس کے معاملہ میں وہ بہت ہی سادہ دل واقع ہوئے تھے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ خاندان شاہی کا یہ چراغ نہایت سادہ وضع میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُن کے گھر میں کپڑوں کے لئے کوئی بکس کوئی صندوق یا کوئی صندوقچی نہ تھی اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی میر صاحب کے پاس جس قدر کپڑے تھے وہ سب ان کے جسم پر رہتے تھے ہم نے تو کبھی بھی ان کے کپڑوں کو دھوبی کے یہاں جاتے یا دھوبی کے یہاں سے ان کے کپڑے آتے ہوئے نہیں دیکھے۔ بس جو کپڑے وہ جسم پر پہنے ہوئے تھے وہ گویا ان کی کھال ہو کر رہ گئے تھے اب اگر آپ ہم سے یہ پوچھیں کہ ان کپڑوں کا کیا رنگ تھا تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصلی رنگ کا تو خیر حال معلوم نہیں لیکن کثرت استعمال سے وہ کپڑے رنگ بدلتے بدلتے اب جس ایک رنگ پر قائم ہو گئے تھے اس کو اصطلاح عام میں صافی کا رنگ کہتے ہیں اسی طرح اگر آپ یہ دریافت کریں کہ ان کا لباس کس کپڑے کا ہوتا تھا یعنی تنزیب یا نین سکھ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ہم نے میر صاحب کو ہمیشہ موم جامہ زیب تن کئے ہوئے دیکھا ہے جس پر مکھیوں کی نشست سے ہر وقت مختلف قسم کے نقش و نگار بنتے اور مٹتے رہتے تھے۔ البتہ ان کے کپڑوں کی خوشبو یا بدبو کے متعلق ہم کچھ بھی عرض نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ علم حاصل کرنے کی ہم کو کبھی جرأت نہیں ہوئی۔

میر صاحب کا دولت کدہ ایک بہت ہی ویران محلہ میں تھا جس کا بیشتر حصہ لکھوری اینٹ اور گارے کی شکل میں مکان کے صحن میں نظر آتا تھا اور جو باقی رہ گیا تھا وہ بھی کوئی تاریخی کھنڈر معلوم ہوتا تھا لیکن میر صاحب کی ضروریات کے لئے ایک مختصر سی کوٹھری کافی تھی جس میں وہ اپنی تمام گرہستی کے ساتھ رہتے تھے اور باقی تمام مکان فی سبیل اللہ چھوڑ رکھا تھا۔ میر صاحب کی مختصر سی کوٹھری میں ایک آدھی وہ چارپائی جو شاہی زمانہ کے کھٹ بنوں نے اپنے ہاتھ سے بنی تھی، حالانکہ اب وہ اپنی بوسیدگی کے اعتبار سے ٹوٹی ہوئی قبر معلوم ہوتی تھی لیکن میر صاحب اس حالت کو غنیمت سمجھتے تھے بہ نسبت اس کے کہ آج کل کے

بد تمیز کھٹ بنے اس تاریخی چارپائی میں ہاتھ لگائیں۔ اس چارپائی پر کچھ بستر تھا تو ضرور لیکن صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ اور کن کن چیزوں پر مشتمل تھا۔ چارپائی کے علاوہ اس کوٹھری میں جس چیز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی وہ حقّہ تھا، اس حقّہ کے متعلق یہی بیان کیا جاتا ہے کہ میر صاحب کے دادا جان مرحوم و مغفور کو غدر کے زمانہ میں کسی شاہی محل میں پڑا ہوا ملا تھا اور وہ اب تک نہایت حفاظت کے ساتھ نسلاً بعد نسل چلا آرہا تھا میر صاحب نے تو بنظر احتیاط اس کو کبھی پانی سے تازہ تک نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پانی سال بھر سے پہلے بدلتے تھے البتہ اس کی چلمیں جب سے اب تک چار پانچ مرتبہ ضرور بدلی گئی تھیں اور اس میں بھی میر صاحب کی احتیاط کو دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں میر صاحب کی آنکھ جھپکی اور حقّہ الٹ کر زمین پر آرہا بس اسی میں چلمیں ٹوٹ گئیں چارپائی اور حقّہ کے بعد ٹین کے سماور کا نمبر تھا جو ہر وقت گرم رہتا تھا اور جس میں ہر وقت چاء کی پیالی کو پیالوں کی ٹوکری، کچھ کلہڑ، کچھ دونے، انگلسو کا ڈبہ جس میں چمچہ وغیرہ تبا کر رکھا جاتا تھا، ایک اسٹول جس پر گول چینی کی پیالی، کاتبوں کی دوات کی طرح رکھی تھی، ایک آگ دھونکنے والی دفتی، کچھ آگ سلگانے کے لئے گو ورٹے، ایک آبخورہ، ایک گھڑا، ایک تانبے چینی کا ڈونگا اور ایک دیا سلائی کی ڈبیا بھی تھی ان ہی تمام چیزوں کی میر صاحب کو ضرورت تھی اور ان ہی سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے لیکن زیادہ تر توجہ اسٹول پر رکھی ہوئی پیالی کی جانب رہتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی زندگی اسی پیالی میں بند ہے۔

میر صاحب کا زیادہ تر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گزرتا تھا لیکن ہر روز کم سے کم ایک مرتبہ آپ اپنے ایک دوست کے مکان پر ضرور جاتے تھے جہاں آپ کے تمام ہم مشرب یکجا ہو کر تھوڑا سا وقت دلچسپی کے ساتھ گزارتے تھے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے ملکی اور قومی، سیاسی اور معاشرتی، ادبی اور تمدنی، اخلاقی اور علمی مسائل پر بحث ہوتی تھی، واقعات حاضرہ پر رائے زنی ہوتی تھی اور دنیا کے اہم سے اہم معاملات نہایت غور و فکر کے بعد طے پاتے تھے اور اس انجمن میں میر صاحب کو وہی درجہ حاصل تھا جو کسی ذمہ دار کانفرنس کے صدر کو حاصل ہوتا ہے ان کی رائے قطعی اور فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کے تجربہ تدبر اور تجربہ کاری کا تمام ہمعصروں پر بڑا اثر تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ اپنے یاران میکدہ میں میر صاحب سب سے زیادہ کہنہ مشق اور سب سے پرانے افیونی تھے۔ ان باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ہمارے میر صاحب کس پایہ کے افیونی تھے۔

میر صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم نے ان کے ساتھ بہتر سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ ان کی افیون کے اخراجات کا ٹھیکہ لے لیا جس کے بعد میر صاحب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ ابھی تک دنیا باوفا دوستوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ میر صاحب پر اس طرح قابو حاصل کر لینے کے بعد ہم نے ان کی خاص سوسائٹی میں بھی داخل ہونا شروع کر دیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس نئی دنیا کی سیر کرتے رہے۔ میر صاحب کا معمول تھا کہ اپنے دوستوں کے مجمع میں جاتے ضرور تھے لہٰذا ہم نے بھی ان کے ہمراہ جانا شروع کر دیا اور وہاں جا کر صحیح معنوں میں ایک نئی دنیا دیکھی جس کو ہم اس

کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے اس کے وسط میں ایک بڑا سا پتیلہ چولھے پر چڑھا رہتا تھا جس میں چائے دم ہوتی تھی اور اس پتیلے کے چاروں طرف میر صاحب کے تمام دوست حلقہ باندھ کر بیٹھتے تھے اور سب کے سامنے کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور تھا کسی کے سامنے چائے کی پیالی ہوتی تھی تو کوئی کھچڑی لئے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے آگے حقہ ہوتا تھا تو کوئی اپنی عزیز از جان پیالی میں چسکی لئے بیٹھا ہوتا تھا کسی کے ہاتھ میں طلسم ہوشربا کی کوئی جلد ہوتی تھی تو کوئی گنڈیوں سے شغل کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر ایک کسی نہ کسی کام میں مصروف ضرور ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ اہم ترین معاملات پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا کسی نے کہا:— (ہر جگہ قوالی بڑھا کر پڑھئے)

"اماں بھائی۔ غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

دوسرے بولے:۔ "ارے یار پھر کہاں ہم اور کہاں یہ صحبتیں مر کر چلے جائیں گے پھر ہم ہوں گے اور قبر کا کونا"

تیسرے نے کہا:۔ "سچ ہے بھائی اتنا ہی باقی ہوس"۔

چوتھے نے فرمایا:۔ "خدا معلوم کیا حشر ہو بڑے گناہ کئے ہیں"۔

پانچویں بولے:۔ "واللہ ہم سا رو سیاہ بھی دنیا میں کوئی نہ ہوگا نہ نماز کے نہ روزے کے آخر خدا کو کیا منہ دکھائیں گے بھائی اور چاہے جو کچھ کرو نماز ضرور پڑھ لیا کرو بڑی برکت ہوتی ہے اور سارے گناہ معاف ہو جائیں گے یہ نماز نہ پڑھنا تو جہنم کی سیر کرائے گا"۔

میر صاحب نے فرمایا:۔ "اماں لاحول ولا قوۃ کیسی باتیں کرتے ہو خداوند کریم بڑا رحیم ہے، اماں وہ ہم کو نہ بخشے گا تو کیا فرنگیوں کو بخشے گا، بھائی ہم کلمہ تو پڑھتے ہیں ان گنہگاروں کو دیکھو جو دنیا کے گناہ کرتے ہیں اور پھر بھی بادشاہت کرتے ہیں گو وہاں جا کر پتہ چلے گا"۔

ایک اور صاحب کہنے لگے:۔ "کیا بات کہی ہے واللہ مگر میر صاحب یہ انگریزوں کی شاہی بھی کافر تھی نے کرکری کر دی سنا ہے کہ اب تو لڑائی ہونے والی ہے"۔

میر صاحب:۔ "اماں جانے بھی دو کچھ تھی وہ بیچارہ کیا کرتا وہ تو کہو کہ سرکار نے ڈھیل چھوڑ رکھی ہے نہیں تو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیں سرکار سے کوئی کیا لڑے گا۔ ہزاروں بندوقیں، توپیں، تیر و کمان، تلوار سب ہی تو اس کے پاس ہیں سر جھکو دے جو کوئی سر بھی اٹھائے، اماں آج چاہے توپوں میں بارود بھر کر سارے شہر کو اڑا دے۔ ہوائی جہاز سے آگ برسا دے، ریلوں کو لڑا دے، موٹروں سے کچل دے، اماں ایک ہوائی جہاز ایسا ہے کہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک صاحب نے فوراً آنکھیں کھول کر فرمایا ارے ہاں بھائی میر صاحب خوب یاد دلایا، یار ان ہوائی جہازوں سے تو بڑی بے پردگی ہوتی ہے۔ سب پردہ دار عورتوں کو یہ لوگ دیکھتے ہوں گے"۔

دوسرے صاحب کہنے لگے:۔ "ہاں بھائی کل ہی کا ذکر ہے کہ ایک ہوائی جہاز میرے مکان پر نکلا مگر بہت نیچا تھا یہ

بھی لڑکے کا لنگر لئے جو اس پر مارا تو قسم ہے آپ کے سر عزیز کی کہ بس ذرا سا بچ گیا نہیں تو زمین پر ہوتا اور بڑی چہل پہل ہوتی۔ میر صاحب نے تجویز پیش کی۔ بھائی تو اب کیا کیا جائے عورتوں کو انگنائی میں نکلنے دیا کرو یا ایک شامیانہ لگا دو۔

اس کے بعد پردہ کا مسئلہ چھوٹ گیا اور پھر یورپ کی آزادی پر تبصرہ ہونے لگا، انگریزوں کی دولت کا ذکر ہوا اُن کی تندرستی اُن کی غذا اُن کے لباس اُن کی معاشرت اُن کی گنزگی اُن کے کتوں اُن کی بیویوں اُن کے بچوں کا تذکرہ ہوا بے فکری اور فارغ البالی کے موضوع پر دھواں دھار تقریریں ہوئیں، ہندوستان کے افلاس پر اظہار افسوس کیا گیا ہندو مسلم کشیدگی پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ سوراج کے امکانات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ جنگ کے آثار کا اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ جنگ کے ہولناک نتائج بیان کئے گئے اور پھر قرب قیامت کے وعظ کے بعد ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ ہم سب نماز شروع کر دیں اور اب کی رمضان میں روزے ضرور رکھیں افطاری کی فہرست مرتب ہوئی اور یہ دلچسپ کارروائی ایک صاحب کے چائے کی طرف متوجہ ہونے سے ادھوری رہ گئی۔ جس کے بعد سب نے چائے نوشی شروع کر دی اور پھر وہی دور شروع ہوا جس کے ساتھ ساتھ کوئی تو اپنی خاندانی فیاضی کے افسانے سنا تا رہا کوئی اپنے والد مرحوم کے کارنامے بیان کرتا رہا کسی نے اپنی جوانی کی رنگین داستان چھیڑ دی اور میر صاحب نے اپنے خاص انداز بیان میں واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے محلات کا ذکر شروع کیا جو نہیں معلوم کہاں کہاں ہوتا ہوا الہ آباد کی نمائش پر آ کر ختم ہوا۔ ایک صاحب جو دیر سے اپنے دونوں گھٹنوں میں سر دئے ہوئے بیٹھے تھے ذرا سا ابھرے اور سب کو داستان امیر حمزہ کی طرف متوجہ کیا جس کی سب نے تائید کی اور ایک صاحب نے شروع کر دیا داستان کا پڑھنا اور سب آنکھیں بند کر کے سننے لگے، وہ حضرت داستان پڑھ رہے تھے داستان کے ایک ایک فقرے پر ایکٹنگ بھی فرماتے جاتے تھے، لیکن سامعین کا یہ حال تھا کہ رفتہ رفتہ سب کے سر گھٹنوں میں گھستے جاتے تھے صرف داستان گو کی آواز کمرہ میں گونج رہی تھی باقی سب پر ایک سکوت بلکہ موت کی سی کیفیت طاری تھی۔ شوکت تھانوی

ناموس خاندان

(تمثیل)

سین ——— ایک قدیم وضع کے زمیندار کی سیلی پھیلی بیٹھک جس میں برائے نام سامان آرائش ہے کمرے کے کچے فرش پر کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ایک کثیف دری بچھی ہے۔ کھڑکیاں ندارد ہیں صرف ایک روشندان اور دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ سڑک کی جانب ہے دوسرا زنانہ مکان میں کھلتا ہے۔ زنانہ مکان کے دروازہ پر ٹاٹ کا ایک موٹا پردہ پڑا ہے۔ داخلے کے دروازہ کے بالکل مقابل کمرے کے وسط میں دیوار سے متصل ایک تخت ہے جس پر پھٹا پرانا فرش بچھا ہے۔ اسی فرش پر ایک پیرانہ سال قاضی جی معہ اپنی ریش دراز کے جلوہ افروز ہیں۔ سفید ململ کا قدرے کثیف کرتا اور ڈھیلے ڈھالے پائنچوں کا پائجامہ زیب بدن ہے۔ داہنی جانب تہ کی ہوئی جانماز اور قریب ہی تپائی پر قرآن رکھا ہے۔ بائیں طرف ایک پرانے خاصدان کے پاس کچھ کتابوں کا ڈھیر ہے۔ تخت پر قاضی صاحب کے بالکل سامنے حقہ رکھا ہے۔ بائیں طرف کی دیوار سے ملی ایک چارپائی ہے جس پر ایک جانب تہ کئے ہوئے بچھونے کا پلندہ رکھا ہے۔ تخت کی داہنی طرف دو تین شکستہ حال کرسیاں جن کے تیجے ٹوٹ گئے ہیں پڑی ہوئی ہیں۔ قاضی صاحب اکیلے بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ حقہ کی نے منہ سے لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی ہی تھوڑی دیر کے بعد ایک آدھ کش لگا لیتے ہیں۔ ٹھیک جس وقت قاضی صاحب کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہوتے ہیں۔ پردے کے پیچھے سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں پھر ایک بار آواز سنائی دیتی ہے :۔ "اے تم اکیلے ہی بیٹھے ہو نا ؟" قاضی صاحب چونک کر گردن اٹھاتے ہیں، "اچھا، تم ہو بی" ——— جواب ملتا ہے "ہاں۔ کہو تو ذرا کو ذرا چلی آؤں۔ کچھ کہنا ہے" قاضی صاحب سلیپر پہن کر بیرونی دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہتے ہیں :۔ "ٹھہرو۔ ذرا دروازہ بند کر لوں" دروازہ بند کر کے اپنی جگہ پر واپس آتے ہیں۔

قاضی صاحب : لے اب چلی آؤ۔

(تیس اور چالیس سال کی درمیانی عمر کی ایک عورت، چوڑی دار پائجامہ اور کرتا پہنے، گلابی رنگ کا دوپٹہ جس میں سستے قسم کی لیس ٹکی ہے اوڑھے، آکر تخت کے کونے پر بیٹھ جاتی ہے، ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہے جس میں پان کے دو تین بیڑے، چھالیا اور سروتا رکھا ہے۔ تھالی تخت پر رکھ دیتی ہے)

قاضی صاحب :۔ کہو کیا ہے بی۔ (پان کا ایک بیڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے ہیں)

بی :۔ اے کچھ نہیں۔ تجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کہنے آئی تھی۔

قاضی صاحب :۔ تجمہ کے کپڑے ؟

بی :۔ ہاں۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے۔ دس بارہ دن میں رحمت کا بیاہ ہونے والا ہے نا۔ آخر لڑکی کے لئے کچھ کپڑے درکار ہوں گے کہ نہیں۔ بچاری کے پاس ایک تار نہیں ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) ہا! غریب کے لئے میرا دل کیسا کڑھتا ہے !۔ (کچھ توقف کے بعد) خیر گہنے پاتے کا تو کچھ نہ کچھ انتظام ہو ہی جائے گا۔ منگنی کی دو چار چیزوں کا کہیں سے بندوبست ہو جائے گا۔ اب رہے کپڑے۔

قاضی :۔ تو پھر کہیں سے منگنے کے کپڑوں کا بھی بندوبست کر لو۔

بی :۔ منگنے کے کپڑے! اے ہوٹو بھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو ؟ بھلا سوچو تو برادری کیا کہے گی ؟

قاضی :۔ (مسکراتے ہوئے) اور برادری زیور کے بارے میں کچھ نہ کہے گی ؟

بی :۔ زیور۔ زیور کا معاملہ دوسرا ہے۔ آج کل سبھی مانگے تانگے کے زیور سے کام چلاتے ہیں۔ ابھی اس دن کی بات ہو مولوی رحمن کی دلھن خانصاحب کی بڑی بہو کا جھومر اور گلوبند پہنے تھیں۔ میں نے دیکھتے ہی تو پہچان لیا میں بولی "اے ہے سارہ کیسا پیارا گلوبند ہے!" بس سارہ کا تو جیسے خون خشک ہو گیا ہو۔ مگر ان کی ساس بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑھیا ڈھڈو۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ قبر میں پاؤں لٹکائے تو بیٹھی ہی ہیں لیکن اب تک شوخ رنگ کے کپڑے پہننے کا ارمان نہ گیا۔ جب دیکھو پوپلے منھ میں پان ٹھنسا ہوا ہے۔ منمناتی ہوئی آواز میں بولیں "تمھیں بھی پسند آیا۔ اے یہ گلوبند تو جس نے دیکھا پسند کیا۔ اچھا ہے نا ؟" میں نے کہا بیشک بڑا خوبصورت ہے۔ اور دیکھنا خانصاحب کی دلھن کے گلوبند سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ جیسے ایک ہی کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو۔ رتی برابر بھی تو فرق نہیں" بس میرا یہ کہنا تھا کہ بڑھیا پیک کی پچکاری مار گول گول دیدے بنا کے کہتی کیا ہے "کہاں خانصاحب کی دلھن کا گلوبند کہاں یہ۔ میٹھو بہن کیسی باتیں کرتی ہو ہوش کے ناخن لو۔ ابھی پرسوں تو سارہ کا دولہا اس کے لئے لکھنؤ سے یہ گلوبند مول لایا ہے" اللہ اکبر! ذرا یہ دیدہ دلیری کا سفید جھوٹ تو دیکھو۔ میں بولی "بہن خیر۔ خدا کا شکر ہے۔ چلو داماد کمانے کے تو قابل ہوا۔ مبارک ہو" پھر اس پر لاوہ یہ کہ .....

قاضی جی :۔ (بات کاٹتے ہوئے) اچھا۔ اچھا۔ ہوگا۔ اب یہ بتاؤ کہ تجمہ کے کپڑوں کے بارے میں کیا طے کیا کتنی لاگت آئے گی ؟

بی :۔ اب میں کیا جانوں۔ منالال بزاز کو کھڑے کھڑے بلوا لیجئے۔ وہ حساب کر کے بتا دے گا۔

قاضی :۔ لیکن آخر تم نے بھی تو کچھ اندازہ لگایا ہوگا۔

بی :۔ اچھا ٹھہرو۔ بتاتی ہوں (قدرے توقف کے بعد) اب تم یوں سمجھو کہ کم سے کم دو جوڑے تو چاہئے ہی ہوں گے

قاضی صاحب :۔ دو جوڑے کیسے ؟ ایک سے کام نہیں چل سکتا۔

بی :۔ تم بھی کیسے بھولے ہو۔ جانتے ہو کہ لڑکی رات کی رات مہمان رہے گی آخر دوسرے دن جوڑا بدلنا چاہئے کہ نہیں ؟

کیا تمھارا مطلب ہے بیچاری دو دن تک وہی جوڑا پہنے رہے!

قاضی صاحب: (ہچکچا کر) لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟

بی: حرج! میں کہتی ہوں لوگ کیا کہیں گے۔ دیکھ لینا ہر طرف تھڑی تھڑی ہوگی۔ جہاں ایک دوسرے سے کانا پھوسی کریں گے "اے دیکھنا بہن قاضی صاحب کی دلہن کے پاس بس یہی ایک جوڑا ہے۔ کل شام کو بھی اسی پہنے ہوئے تھیں۔ آج پھر وہی ڈانٹے ہیں — اور پھر یہ لوگ اپنے کو رئیس اور نواب کہتے ہیں" ہونھ! مجھ سے نہ ہوگا کہ میں چپکی بیٹھی یہ طعنے سنا کروں۔ یہ بڑا عزت آبرو کا معاملہ ہے میں اپنی بچی کو کپڑے لتے سے آراستہ کئے بغیر ہرگز تو برات میں جانے نہ دوں گی۔ واہ..........

قاضی صاحب: لیکن بی۔ تم جانتی ہو آج کل خرچ کی کیسی تنگی ہے۔

بی: خرچ۔ خرچ کی تو ہمیشہ ہی تنگی رہتی ہے۔ کوئی نئی بات ہے — مگر..........

قاضی صاحب: مگر کیا؟

بی: مگر یہ کہ کیا مہاجن سے کچھ روپیہ قرض نہیں لیا جا سکتا۔ اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ ایک چھوٹی سی رقم کے لئے وہ انکار کر دے۔

قاضی صاحب: لیکن تم نے یہ نہ بتایا کہ آخر کپڑوں میں خرچ کتنا ہوگا۔

بی: ٹھہرو۔ مجھے سوچنے دو (سوچتی ہے اور انگلیوں پر کچھ حساب لگاتی ہے) بس یہ سمجھو کہ کوئی دو سو روپیہ درکار ہوگا۔

قاضی صاحب: (تعجب کے لہجے میں) دو سو!!!

بی: ہاں دو سو۔ بات یہ ہے کہ گھر میں پہننے کے کپڑوں سے تو بہر حال یہ جوڑے اچھے ہونا ہی چاہئے۔ اسی سے دام بھی زیادہ لگیں گے۔ لڑکی انھیں کوئی روز روز تھوڑی ہی پہنے گی۔ وہ تو شادی بیاہ کے موقعوں کے لئے ہوں گے۔

قاضی صاحب: (تعجب کے لہجے میں دوبارہ) دو سو بی!!

بی: دو سو سے تو کم تو کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ آخر کچھ اپنی حیثیت کا، خاندان کے ناموس کا بھی تو خیال کرو۔ اور روپیہ کا کیا ہے؟ روپیہ تو ہاتھ کا میل ٹھہرا۔ ادھر آیا ادھر خرچ ہوا۔ بڑی چیز عزت آبرو کا پاس ہے۔ اُس سے کیا فائدہ کہ لوگ طعنے دیں کہ "ہاں بہن۔ بیاہ تو بڑے دھوم دھڑکے سے رچایا لیکن اب دلہن کی گت دیکھو۔ بدن پر چیتھڑا تک نہیں۔

قاضی صاحب: (مری ہوئی آواز میں) تمھیں معلوم ہے بی۔ وہ جو اس بیاہ کے لئے میں نے دس ہزار کی رقم قرض لی تھی اب قریب قریب دگنی ہوگئی ہے۔ اور اصل تو در کنار اب تک سود تک ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

بی: روپیہ! روپیہ۔ خدا کی مار اس موئے روپیہ پر۔ جب دیکھو روپے کی پکار مچی ہوئی ہے۔ روپیہ کوئی ہمارے ساتھ عاقبت میں تو نہیں جائے گا نہیں؟ — تو پھر بولو کیا کہتے ہو۔

قاضی صاحب: (اکتا کر) اچھی بات ہے بی۔ سوچ کر بتاؤں گا۔

بی: سوچ کر بتاؤ گے؟ — یہ خوب کہی۔ میں نہیں جانتی۔ اسی اٹھوارے میں کپڑے سل کر تیار ہو جائیں سمجھے کہ نہیں — آخر منا لال بزاز کو کیوں نہیں بلوا بھیجتے۔

قاضی: منا لال بزاز کو کس منھ سے بلوا بھیجوں۔ ابھی ابھی تو اس نے حساب بھیجا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں کہ بغیر پچھلا روپیہ بیباق ہوئے وہ کپڑا دینے کو تیار ہو جائے۔ خیال تو کرو کتنے دنوں سے رقم چڑھی ہوئی ہے کہاں تک صبر کرے بیچارہ؟

بی: (پان کا بیڑا کلے میں دبائے ہوئے) جو کچھ بھی ہو فصلانہ کی وصولیابی تک تو اسے انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

قاضی صاحب: فصلانہ؟

بی: ہاں فصلانہ کی وصولی میں اب دن ہی کتنے باقی ہیں۔ دس بارہ روز میں وصول ہو جائے گا۔ سوچتی ہوں فصلانہ ملتے ہی نجمہ کے گلوبند مہاجن کے یہاں سے چھڑوا لوں۔ کب سے گروی پڑا سڑ رہا ہے۔

قاضی صاحب: مگر بی۔ فصلانہ تو جو کچھ وصول ہوگا سرکاری مالگذاری میں چلا جائے گا۔

بی: سرکاری مالگذاری!

قاضی صاحب: ہاں مالگذاری تھوڑی روکی جا سکتی ہے۔ مہاجن اور بزاز کو تو خیر ٹالا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن سرکاری مالگذاری کا معاملہ دوسرا ہے وہ کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔

بی: (یکایک رو پڑتی ہے) میں سمجھ گئی۔ تم مجھے الو بناتے ہو — یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں...... (ہچکیاں لے کر رونے لگتی ہے۔ قاضی صاحب ہکا بکا ہو کر بیوقوفوں کی طرح چاروں طرف دیکھتے ہیں) اوں اوں — دنیا جہان کی بہو بیٹیاں (ہچکی) کیسے اچھے اچھے (ہچکی) — کیسے اچھے اچھے (ہچکی) کپڑے پہنتی اوڑھتی ہیں (ہچکی) — گہنے پاتے (ہچکی) گڑیوں کی طرح لدی رہتی ہیں — اور — اور میری بچی (ہچکی) موئے کنگالوں کی طرح چیتھڑے لگائے........ (ہچکی) کیسی ذلت کی بات ہے!!

قاضی صاحب: ہائیں۔ ہائیں بی — سنو تو — ارے بھئی (کھڑے ہو کر) اچھا میں ابھی بزاز کو بلوائے دیتا ہوں

بی: (آنسو خشک کرتے ہوئے) تو پھر جلدی کرو۔

قاضی: اور تم! آخر تمھیں بھی تو کپڑے چاہئے ہیں۔

بی: اونھ — میرا کیا ہے؟ تم میری فکر نہ کرو۔

قاضی: لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کپڑے تو تمھیں بھی درکار ہوں گے۔

بی: نہیں جی۔ میرا کیا ہے۔ تم جو کچھ لے دو گے پہن لوں گی — مگر میری بچی کو اچھی طرح حیثیت کے موافق پہن اوڑھ کر جانا چاہئے۔

(اندر سے ایک آواز سنائی دیتی ہے)

آواز: اماں - اماں -

بی: کون؟ — جعفر - مدرسہ میں آج جلدی چھٹی ہو گئی کیا؟

(اٹھارہ سال کا ایک اول جلول لڑکا، بدوضع کپڑے پہنے بولتوں کی صورت بنائے داخل ہوتا ہے)

بی: (جعفر کے اترے ہوئے چہرے اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھ کر) خیریت تو ہے - جعفر؟ — بیٹا تم اداس کیوں ہو؟

جعفر: اماں - فیس

قاضی: فیس؟

جعفر: جی ہاں - آج داخل ہو جانا چاہیے - نہیں تو نام کٹ جائے گا - اور ماسٹر صاحب کہتے تھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں ملے گی -

بی: (جعفر کے پاس آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) — میرا بچہ! میرا بچہ — یہ ماسٹر نگوڑے یونہی روز روز میرے لال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں — ابھی اسی روز بیچارے کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، یا جانے کیا تو درجے میں بیٹھنے بھی نہ دیتے تھے -

جعفر: ہاں اماں - خوب یاد دلایا - قواعد کی کتاب آج ہی مل جائے - نہیں تو انگریزی کے ماسٹر صاحب درجے کے پاس نہیں پھٹکنے دیں گے -

قاضی: خدا غارت کرے ان ماسٹروں کو! کتابیں — کاپیاں — فیس — روز یہی رونا - روز یہی چیخ پکار! آخر ہم نے بھی تو پڑھا ہے - ہم نے تو اتنی عمر میں کبھی نہ اتنی کتابیں خریدیں نہ ڈھیر کی ڈھیر کاپیاں مول لیں - تختیوں سے خاصہ کام چل جاتا تھا — یہ انگریزی تعلیم تو دیوالہ نکالے دیتی ہے -

بی: اور پھر کتابیں بھی کیسی — کیڑوں کوڑوں جیسے مہین حرفوں سے چھپی ہوئی - میں تو جعفر سے کہا کرتی ہوں کہ بیٹا کتابیں پڑھ پڑھ کے ایک دن تو اپنی آنکھیں پھوڑ لے گا -

جعفر: (تھوڑے توقف کے بعد) اماں فیس -

قاضی صاحب: (جھنجھلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں) میں کہتا ہوں تمہارے ماسٹر صاحب دو چار دن صبر نہیں کر سکتے کیا فیس لیکر بھاگا نہیں جا رہا ہے -!

جعفر: لیکن یہ رقم کوئی ان کی جیب میں تو جائے گی نہیں - آپ تو جانتے ہیں کہ ....

قاضی: اچھا کل کتنی فیس ہوئی؟

جعفر: پچیس روپے -

قاضی: پچیس روپے؟ خدا کی پناہ! .... پچیس روپے!!

جعفر: ہاں، ابا -

قاضی: پچیس روپے - جاؤ بیٹا - اپنے ماسٹر صاحب سے کہہ دینا کہ وہ مجھے اس طرح اُلو بنا کر نہیں لوٹ سکتے -

جعفر: (متعجب ہو کر) مگر ابا یہ تو میرے امتحان کی اور پڑھائی کی فیس ہے -

قاضی: (غضبناک ہو کر) بلا سے - ہو گی امتحان کی فیس — مجھے تمہارا انگریزی مدرسہ میں پڑھنا کبھی پھوٹی آنکھ نہ بھایا — لڑکوں کو اچھا خاصہ کرستان بنا دیتے ہیں - جہاں شد بد پڑھ لیا بس داڑھی منڈا، فرنگیوں جیسے کپڑے پہن، لگے ادھر اُدھر اینڈنے -

بی: اے ہاں - ٹھیک تو کہتے ہو - دور کیوں جاؤ، اے اب سجاد ہی کو دیکھ لو نا - پکا کرستان بنا پھرتا ہے - روزہ رکھنا اس کے نزدیک فاقہ کرنے کے برابر ہے - نماز پڑھنے کو تو توبہ توبہ نعوذ باللہ ٹکریں مارنے کے برابر سمجھتا ہے - داڑھی مونچھ غائب موئے فرنگیوں کی طرح چوکی کے بڑے پاٹ پر بیٹھتا ہے — ہا! ہا! میں باز آئی اپنے بچے کو ایسے مدرسے میں بھیجنے سے!

جعفر: لیکن اماں - آپ کو معلوم ہے مجھے پڑھنے کا کتنا شوق ہے -

بی: میرے لال اس پڑھائی سے، میں پوچھتی ہوں، آخر فایدہ کیا - کوئی لاٹ گورنر تو بن نہیں جاؤ گے؟ .... رہا پڑھنے کا شوق - سو تمہارے ابا کے پاس ایک چھوڑ نہ جانے کتنی کتابیں بھری پڑی ہیں جب جی چاہے پڑھو - کوئی منع کرتا ہے؟

جعفر: اماں، آپ تو سمجھتی نہیں — یہ کتابیں میرے کس کام کی، عربی فارسی کی کتابیں -

قاضی: (غصے میں) کیا کہا؟ پھر تو کہنا یہ کتابیں کس کام کی ———— ہاں بھلا یہ کتابیں جن میں خدا رسول کی باتیں لکھی ہوں، جنھیں پڑھنے سے عاقبت درست ہو - تیرے کس کام کی!!

جعفر: مگر ابا - اب آج کل تو ان کتابوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا — اور میں کہتا ہوں آخر ایسی کتابوں کے پڑھنے سے فایدہ ہی کیا؟ سوا اس کے کہ انھیں پڑھ پڑھ کے آدمی اچھا خاصا "ملانٹا" بن جائے سو مجھے تو ملا بننے سے چڑ ہے -

قاضی: (کھڑے ہو کر جعفر کی طرف بڑھتے ہوئے) چپ رہ - نالایق! میرے سامنے ایسی واہیات باتیں! ابھی کہیں کا - دور ہو جا میرے سامنے سے — دیکھتی ہو اس پاجی کی بدتمیزی - یہ انگریزی تعلیم کا اثر ہے - نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ - بس خدا رسول کا مضحکہ اڑانے کو دیدو .... ٹھہر تو جا مردود! ابھی مزا چکھاتا ہوں اس گستاخی کا - (قاضی صاحب دانت پیستے ہوئے جعفر کی طرف بڑھتے ہیں - بی ان کا ہاتھ تھام لیتی ہے)

بی: جعفر کے ابا! جانے دو - چلو ہوگا - بچہ تو ....

قاضی: بچہ ہے؟ انیسواں سال لگ گیا اور ابھی — بچہ ہی ہے — پالا لنگا کہیں کا نکل یہاں سے مردود!

بی: اے یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے - اے بس اب غصہ تھوک دو - چلو کھانا کھائیں جعفر غریب بھوکا ہوگا - گندن! — ارے او گندن! ....

کندن: اچھا بی۔ آئی۔

بی: کندن۔ کھانا طیار ہوا؟

کندن: بی تو ابھی بنیے کے ہاں سے پلٹا ہے موئے نے سودا وودا کچھ بھی نہیں دیا کہلوا بھیجا ہے کہ جب تک پچھلا حساب چکایا نہ جائے گا میں ایک دانہ نہیں دینے کا۔

بی اور قاضی صاحب: (ہم آواز ہو کر) یہ کیا؟ ــــ اس کے کیا معنے ہوں؟!!

جعفر: خدایا روز یہی رونا رہتا ہے ــــ مجھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں نہیں برداشت کر سکتا آج پیسہ کی تنگی ہے، کل روٹی کی محتاجی ہے ــــ میں نکل جاؤں گا۔ مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالوں گا۔

قاضی: کیا بکتا ہے بے ہودہ! بچہ سے بچپن میں ٹانگ اڑانے کو کس نے کہا تھا۔

جعفر: ابا۔ آپ ہی بتائیے۔ آخر کب تک اس طرح کام چلے گا ــــ اس مصیبت کا کوئی علاج تو ہمیں سوچنا ہی پڑے گا۔

قاضی: بس بس خاموش رہ۔ نہیں تو ایسا ٹھیک کروں گا کہ یاد کرے گا۔

جعفر: ابا۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مفلسی اور ناداری کی یہ زندگی نہیں دیکھی جاتی ــــ یہ پیسہ پیسہ کی محتاجی! کس قدر ذلت کی بات ہے۔ ہم سے ایک معمولی مزدور بھی اچھا ہوگا۔ دن بھر محنت مشقت کر کے ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کیا۔ شام کو مٹھی بھر پیسے۔ بس گھی ہوگیا۔ آہ کیسا اطمینان کتنی آزادی! ــــ اور ہم؟ ہم جو رئیس اور نواب کہلاتے ہیں۔ شریف بنے اینڈتے پھرتے ہیں۔ ذرا خیال تو کیجیے ہم لوگوں نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے۔ ــ ــ ــ ــ ہم فاقے کرتے ہیں بھوکوں مرتے ہیں لیکن کیا مجال جو ہاتھ پاؤں ہلا کر کوئی کام کاج کریں ــــ ہم کتوں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارا وجود ایک آسمانی بلا ہے ایک ہولناک عذاب!!..............

قاضی: اسے چپ رہنا ہے کہ نہیں۔

بی: (قاضی صاحب اور جعفر کے درمیان بیچ بچاؤ کرتے ہوئے) جعفر کے ابا...... اجی جعفر کے ابا۔

جعفر: نہیں۔ ہرگز نہیں چپ رہوں گا۔ بولے جاؤں گا۔ خوب چیخوں گا۔ دل کی بھڑاس نکالے بغیر زبان نہیں روکوں گا، اب مجھ میں ضبط کی قوت باقی نہیں۔ چپکا بیٹھا اس ذلت آمیز مفلسی کا تماشا نہیں دیکھ سکتا ــ ــ ــ ــ ــ اماں کے یہ پیچکے پچکے چہرے، یہ کیفیت اگر کبھی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے کلیجہ پر گھونسہ مار دیا ہو........ جب دیکھو خرچ کی تنگی ہے۔ جب سنو بنیے کے یہاں سے ادھار آرہا ہے مہاجن کا سود چڑھتا جاتا ہے ــــ اور یہ ظالم بنیے اور مہاجن۔ انسانی جونکیں! یہ ہم لوگوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس کر چھوڑیں گے..... آخر کب تک صبر کروں؟ کب تک یہ ذلتیں سہوں؟ ــــ نہیں نہیں ایک منٹ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔ جہاں سینگ سمائیں گے نکل جاؤں گا اور مزدوری کر کے پیٹ پالوں گا۔

بی: (جلدی سے جعفر کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) ہائیں جعفر! کیا بکتے ہو؟ مزدوری کرو گے؟ باپ دادا کی عزت پر بٹہ لگاؤ گے؟ خاندان کا نام ڈبوؤ گے؟

جعفر: باپ دادا کی عزت! خاندان کا نام!.......... سب وہم ہے۔ سب دھوکا ہے۔ کیسا ننگ و ناموس؟ اور کہاں کی عزت!! جب ہمارے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا ہی نہ ہوگا تو کیا خاندان کے نام کو شہد لگا کر چاٹیں گے؟۔

یہ جھوٹی شیخی ایک عجیب بلا ہے جو ہمیں نگلے جا رہی ہے۔ یہ مصنوعی ننگ و نام ایک مہلک پھوڑا ہے جو اندر ہی اندر ہماری ہڈیاں تک گھلائے دے رہا ہے!!

قاضی: لونڈے کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

جعفر: دماغ خراب نہیں ہوا، درست ہوگیا ہے۔ پہلے میں پاگل تھا۔ اب جنون کا سودا سر سے اترا ہے اب ہوش آیا ہے، آنکھیں کھلی ہیں، جیسے کوئی ہولناک خواب دیکھتے دیکھتے یکایک بیدار ہو جائے ــــ یہ ہم پر خدا کا قہر نازل ہو رہا ہے۔ باپ دادا کی نام نہاد شرافت ہمیں زہریلی ناگن بن کر ڈس رہی ہے۔ آہ افسوس! افسوس!........ ننگ ناموس! عزت آبرو۔ سب خیال، سب وہم!!! ــــ ذرا آنکھیں اٹھا کر اماں جان کی طرف دیکھئے۔ ان کے چیتھڑے والے بھی نظر ڈالئے۔ ننگ و ناموس اسی چیز کا نام ہے؟ عزت اور شرافت اسی کو کہتے ہیں؟......................

اچھا رخصت۔ اس ذلیل زندگی کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ!

(جعفر دروازہ کی طرف بڑھتا ہے۔ بی دونوں ہاتھ پھیلائے وحشتناک صورت بنائے اس کے پیچھے پیچھے لپکتی ہے)

بی: میرا بچہ! میرا لال.......................... (پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

اسد اللہ کاظمی۔ ایم۔ اے

راکھی

(۱)

چنار گڑھ کا قلعہ گھرا ہوا تھا۔ توپوں کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سمت دھوئیں کی مسموم فضا میں حملہ آور سپاہیوں کے دستے پے در پے ڈھالوں کو سپر کئے ہوئے سمندر کی طرح آگے بڑھتے جاتے تھے۔ قلعہ کی فصیل پر شیر خاں مستعدی کے ساتھ کمان کر رہا تھا اسکے ایک اشارہ پر ہزاروں تیر، بڑے بڑے پتھر، روغن نفط اور گولے بیک وقت برسنے لگتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حملہ آوروں کا بڑھتا ہوا ٹھٹھنے والا سیلاب قلعہ کی آہنی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر لاشوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مسلسل ایک گھنٹے سے جاری تھا اور اب رفتہ رفتہ حملہ آوروں کے جوش میں کمی ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک قلب فوج میں جنبش ہوئی اور ایک خوش رو نوجوان جس کے چہرے سے عجیب قسم کا تقدس برستا تھا، نمودار ہوا۔ یہ دوسرے افسروں کی طرح فوجی لباس پہنے ہوئے تھا۔ مگر اس کے عمامہ میں ایک بیش قیمت بڑی سی مرصع کلغی لگی ہوئی تھی۔ یہ ہندوستان کا نوجوان شہنشاہ ہمایوں تھا۔ اس نے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور ساری فوج کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ ہر ہر دستہ کے سامنے گھوڑے کو چند لمحوں کے لئے روک لیتا اور سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا۔ اس نے دو گھنٹے کے اندر ساری فوج کا جائزہ لے لیا۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر قلب فوج میں واپس چلا آیا۔ شہنشاہ کی ہمت افزائی اور اس کی موجودگی نے سپاہیوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ گولوں کی زور شور سے بارش ہونے لگی اور ہر دستہ جان پہ کھیل کر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح قلعہ کی دیوار پر چڑھ جائے۔ اور شہنشاہ کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرے، بارہا ایسا ہوا کہ چند جانباز سیڑھیاں لگا کر سر کو ہتھیلی پر رکھ کر دیوانہ وار چڑھے مگر سیڑھیاں نیچے گرا دی گئیں اور چڑھنے والوں کو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑا یا زخموں سے چور ہو کر نیچے گرے۔ اب شام ہو رہی تھی اور ہمایوں بیتاب تھا کہ جس طرح ہو آج ہی قلعہ فتح ہو جانا چاہیئے۔

"بیرم خاں قلعہ آج ضرور فتح ہو جانا چاہیئے" شہنشاہ نے کہا۔

"جہاں پناہ! اب تو شام ہو چکی مگر کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ کیونکہ رسد بند ہو جانے کی وجہ سے قلعہ والے فاقے کر رہے ہیں۔ اور ان کے لئے سوائے قلعہ حوالہ کر دینے کے کوئی چارہ نہیں، کل انشاء اللہ تعالےٰ کوکب ہمایونی چنار کے قلعہ پر لہراتا ہوا نظر آئے گا" بیرم خاں نے کہا۔

اتنے میں شہنشاہ کی نظر چند جانباز سپاہیوں پر پڑی جو قلعہ کی دیوار پر سیڑھی لگا کر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر قلعہ والوں نے سیڑھی نیچے گرا دی تھی اور وہ زمین پر تڑپ رہے تھے۔ شہنشاہ اس جانبازی کے نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ خود سیڑھی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ جائے گا۔ اس نے بیرم خاں کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا

"بالکل بیکار ہے، جہاں پناہ! کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ شام ہو چکی ہے اور رات بھر کی تاخیر کے لئے ایسی عزیز جان کو جس کی قیمت کونین کی سعادت سے بلند تر ہے۔ ہلاکت میں ڈالنا۔ دانشمندی کے خلاف ہے۔" بیرم خاں نے کہا۔

"اچھا جیسی تمہاری رائے۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ اب جلد بازگشت بجنے کا حکم دو۔ کل میں خود اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر چڑھوں گا" شہنشاہ نے کہا۔

جواب میں بیرم خاں نے مودبانہ سر کو جھکا لیا۔

(۲)

رات تاریک تھی اور ایک تہائی حصہ اس کا گزر چکا تھا۔ ہمایوں کے فوجی کیمپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دن کے تھکے ماندے سپاہی پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں سے زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور پہرہ کے سپاہی چاروں طرف گشت لگا رہے تھے۔ اس سناٹے میں شاہی خیمے کے اندر کسی معاملہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔

"ارکین سریر سلطنت! آپ کو معلوم ہے کہ فردوس مکانی دشمنوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی فیاضی، رحم اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ پس ما بدولت کے لئے بھی مناسب ہے کہ فردوس مکانی کے پاک نقش قدم کی اتباع کرتے ہوئے، اسی مقدس فیاضی رحم، اور محبت کے سرسبز اور شاداب درخت کی ہمیشہ آبیاری کرتے رہیں۔ شیر خاں اب اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ غور کرو، سوچو، سمجھو اور بتلاؤ کہ اس کو کیا جواب دیا جائے" شہنشاہ نے کہا۔

"جہاں پناہ! لیکن شریر، کینہ، اور احسان فراموش افغانوں کے ساتھ رحم، انصاف کا خون' اور احسان فراموشی کی حمایت ہے۔ شیر خاں کی یہ صرف مکاری ہے۔ فردوس مکانی کے سامنے بھی اس نے اسی طرح سر اطاعت خم کر دیا تھا اور فردوس مکانی نے اس کو ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا تھا مگر اس احسان فراموش نے اس کا جو صلہ دیا وہ جہاں پناہ سے پوشیدہ نہیں" ایک سردار نے کہا۔

"احسان فراموش! بالکل احسان فراموش!! ان طوطا چشم افغانوں سے وفا کی امید لا حاصل ہے" دوسرے سردار نے جوش سے کہا۔

"بڑے نمک حرام ہیں کمبخت" تیسرے سردار نے چہرہ پہ شکن ڈال کر کہا۔

اتنے میں چوبدار داخل ہوا۔ اور جھک کر مجرا بجا لایا اور کہا:

"عالیجاہا! چتوڑ سے دو راجپوت سوار آئے ہیں اور اُن کی التجا ہے کہ ابھی باریابی کا شرف بخشا جائے کیونکہ وہ

شہنشاہ کے نام ایک اہم پیام لائے ہیں"

"چتور........ راجپوت ——— اہم پیام - نہ معلوم کیا بات ہے" شہنشاہ نے آہستہ آہستہ کہا - پھر بآواز بلند کہا "اچھا فوراً حاضر کرو"

(۳)

"تم لوگ کون ہو ؟ کہاں سے آئے ہو ؟ - اور وہ کونسا اہم پیام ہے جس کے لئے بغیر صبح کا انتظار کئے ہوئے تم نے باریابی کی اجازت مانگی" شہنشاہ نے ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھا -

"جہاں پناہ" ایک راجپوت نے ادب سے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا - "ہم لوگ راجپوت ہیں اور چتوڑ کے سچے سیوک .... ہم اس وقت چتوڑ سے آرہے ہیں اور جہاں پناہ کے نام اپنی مہارانی سریمتی کرناوتی کا ایک خط لائے ہیں"

شہنشاہ کی آنکھیں اس دوران گفتگو میں برابر اُن کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھوں سے فیاضی رحم اور بہادری کا سچا نور برس رہا تھا - اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ہاتھ کو بیتابی کے ساتھ بڑھا کر بولا :-

"وہ خط کہاں ہے ؟"

اس کے جواب میں اُس راجپوت نے ایک دوسرے راجپوت کے ہاتھ سے جو اُس کے پاس کھڑا تھا ریشمی خریطہ جلدی سے لے کر شہنشاہ کے سامنے پیش کیا -

شہنشاہ نے وہ خریطہ میر منشی کو دیا اور کہا "مضمون سے ما بدولت کو آگاہ کرو"

میر منشی نے خط کو خریطہ سے نکالا - خط کے اوپر ایک جہانگیری کے قسم کی کوئی مرصع چیز لپٹی ہوئی تھی - یہ قیمتی جواہرات سے مرصع تھی اور اس میں سونے کی زنجیر خوبصورتی کے ساتھ لگی ہوئی تھی - میر منشی نے اس کو باحتیاط تمام کھول کر علٰحدہ رکھا اور خط کھول کر مضمون کی طرف متوجہ ہوا - خط کا مضمون یہ تھا :-

رام جی[1] اکلنگ جی گنیش جی

"جہاں پناہ کے کنول جیسے قدموں پر بے شمار سلام" عریضۂ نیاز حضور کو ایسے وقت میں لکھ رہی ہوں جبکہ میرے بدن کا ایک ایک قطرۂ خون آنے والی ہولناک مصیبت کے تصور سے خشک ہو چکا ہے - وقت بڑا نازک ہے اور زیادہ تاخیر مجھے ہمیشہ کے لئے تباہی و بربادی اور ذلت کے عمیق سمندر میں غرق کر دے گی - میں حضور کو یہ خط لکھ رہی ہوں - اور میرا پیارا چتوڑ بہادر شاہ والی گجرات کی فوجوں سے گھرا ہوا ہے - چتوڑ کے سچے سیوک اپنے سروں کو ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں مگر "ملیچھ توپوں" کے سامنے اُن کی بہادری کارگر نہیں ہوتی اور وہ چتوڑ کے ناموس کی قربانگاہ پر بھیڑ بکریوں کی طرح "ملیچھ توپوں" کے گولوں سے

[1] رام جی، اکلنگ جی، گنیش جی، یہ تین محافظ دیوتا تھے جن سے ہر کام میں مدد مانگی جاتی تھی -

بیدردی کے ساتھ ہر روز ذبح ہو رہے ہیں - ایسے وقت میں یہ "راکھی" آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں اور امید کیسی کامل یقین ہے کہ آپ اس کو قبول کریں گے کیونکہ بہادری کے قانون کے مطابق میری بھیجی ہوئی "راکھی" کو قبول کرنا اور اس کو باندھ کر میرا راکھی بند بھائی ہو جانا آپ پر فرض ہے - میں دیکھ رہی ہوں کہ میری بھیجی ہوئی "راکھی" میرے بھائی شہنشاہ ہمایوں کی کلائی پر بندھی ہوئی ہے ..... اب اس کی لاج آپ کے ہاتھ ہے ..... میرے مقدس بھائی ——— اب بلا کسی تاخیر کے جلد آیئے اور اپنی بہن کی عزت وحشیوں کے ہاتھ سے بچایئے اور اپنے شیر خوار بھانجے اودے سنگھ کی حفاظت کیجئے -"

آپ کی بہن : کرناوتی

۲۵ر اماوس سمبت[1] ۱۵۸۹

ہمایوں خط کا مضمون بڑے غور سے سن رہا تھا - خط کا مضمون ختم ہو چکا تھا اور اب اس کو کسی غور و فکر کی ضرورت نہ تھی وہ اس وقت اپنے فطری جذبہ سے سرشار تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے -

"راکھی کہاں ہے ؟ - میری کلائی پر باندھ دو" شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں سے مخاطب ہو کر کہا ———

پہلا نوجوان راجپوت جو اپنے ساتھی سے آگے کھڑا ہوا تھا آگے بڑھا ، شہنشاہ کے قدموں کو بوسہ دیا ، اور اس نے شہنشاہ کے داہنے ہاتھ کی کلائی پر راکھی باندھ دی اور تب اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پرنام کیا اور چند قدم ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا -

اس وقت دونوں نوجوان راجپوتوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ——— "شیر خاں کو جواب دیدو کہ ما بدولت نے اس کا جرم معاف کیا اور وہ کل حضور میں آکر ما بدولت کی اظہار خوشنودی کی سند حاصل کرے" شہنشاہ نے میر منشی سے کہا -

میر منشی نے جواب میں سر کو جھکا دیا -

"میرے بہادر دوستو ! میں پرسوں صبح کو یہاں سے اپنی پوری فوج کے ساتھ چتوڑ کی جانب کوچ کروں گا - اور اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کا فرض ادا کروں گا - اس کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے طیار ہوں - اپنے بہادر سپاہیوں کی عزیز جانیں ، خود اپنی جان ، رنتھمبور کا قلعہ - غرضکہ اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کی ہر ممکن قیمت میں ادا کرنے کے لئے طیار ہوں - تم لوگ بھی سستا لو اور ما بدولت کے ہمراہ رکاب روانہ ہو" شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں کو کہا -

"جہاں پناہ ! حضور کا حکم سر آنکھوں پر .... مگر مناسب ہے کہ ہم لوگ صبح ہی روانہ ہو جائیں اور جلد از جلد چتوڑ پہونچ کر اپنی مہارانی کو حضور کی آمد آمد کی خبر جانفزا سنا دیں - تاکہ سریمتی مہارانی کو اطمینان ہو سپاہیوں کے

[1] سمبت ۱۵۸۹ مطابق ۳۳-۱۵۳۲ء

دل بڑھا پایش، اور دشمن مشکر کانپ اٹھیں" پہلے نوجوان راجپوت نے جواب دیا۔

"تمہاری رائے انسب ہے ——— جاؤ ——— میری اجازت ہے ——— خدا حافظ ——— میری بہن کو جلد میرا پیام پہونچا دو — میں ابھی قریب قریب تمہارے ساتھ ہی پہونچوں گا" شہنشاہ نے جواب دیا۔

(۴)

ابتدائے آفرینش سے چتوڑ کے نام میں ایک تقدیس ہے۔ یہ راجستھان کا کعبہ ہے، بیت المقدس ہے، کاشی ہے اور سب کچھ ہے۔ اس سے بہادری کا نام زندہ ہے۔ اس سے بہادران راجستھان کے سروں میں اولوالعزمی کا سودا، آنکھوں میں بیداری، اور جگر میں تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چتوڑ کی پاک سرزمین پر جب کبھی "وحشیوں"[۱] کا حملہ ہوا تو بہادران راجستھان نے اس کی دفاع کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہا دیا — اس کی گود میں حیرت انگیز بہادری کے ہزاروں کارنامے کھیل رہے ہیں ——— ایسے کارنامے جن کی مثال تاریخ کے صفحات پر مشکل سے مل سکتی ہے۔

آج بھی جبکہ والیٔ گجرات سلطان بہادر شاہ اپنے جرار لشکر کے ساتھ منڈو کے راجہ کی معیت میں اپنے باپ مظفر شاہ کی ذلت کا انتقام لینے کے لئے چتوڑ کی پاک سرزمین کو گھیرے ہوئے پڑا ہے تو فدائیوں کی کمی نہیں ہے۔ بوندی کا بہادر فرزند بھی بہادر راجپوتوں کے ساتھ راجستھان کا راجہ سوبھگ راؤ، دیوکا راجہ دیوداؤ، اور راجستھان کے بہت سے سورما مقدس چتوڑ کی دفاع کے لئے پہونچ گئے ہیں۔

مگر اس مرتبہ چتوڑ کا حملہ آور عظیم الشان لشکر لے کر آیا تھا ——— ایسا عظیم الشان لشکر کہ راجستھان کی ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک کبھی دیکھا یا سنا نہ گیا تھا۔ لشکر عظیم کے علاوہ عجیب غریب آلات کا مقابلہ تھا جن کے آگے بہادران راجستھان کی بہادری کارگر نہ ہوتی تھی۔ رومی خاں "پھٹ توپوں" کے ذریعہ سے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ دشمن پر گولے برساتا تھا۔

(۵)

۱۲ جیٹھ ۱۵۸۹ سمبت (مطابق ۱۵۳۳ء) کی صبح عجیب ہولناک صبح تھی۔ گولے یمین و یسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے تھے اور چتوڑ کا قلعہ دھوئیں کی سموم فضا میں چھپا ہوا تھا۔ چند ماہ کی متواتر گولہ باری کی وجہ سے قلعہ کی دیواریں اور فصیلیں چور ہو چکی تھیں اور اب قلعہ میں کوئی دم باقی نہ تھا۔ لیکن مایوسی کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی بہادران راجستھان کے ہاتھوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی سرفروشانہ جرأت، آہنی استقلال اور امید کا رشتہ نہ چھوٹتا تھا

[۱] راجستھان کے لوگ اپنے حملہ آوروں کو اسی نام سے یاد کرتے تھے ——— راجپوتوں کو توپ سے بڑی نفرت تھی چنانچہ اسی بنا پر وہ اس کو "پھٹ" کہا کرتے تھے۔

آج جنگ اور گولہ باری کا سارا زور شور درۂ بیکا پر تھا۔ یہاں بوندی کا بہادر راجکمار پانچ سو بہادر راجپوتوں کے دستہ کے ساتھ کمان کر رہا تھا۔ اس دستہ کے اوپر رومی خاں اپنی پوری طاقت کے ساتھ گولے برسا رہا تھا اور بہادر شاہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ جس صورت سے ہو سکے اس درہ پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ قلعہ کی فتح اسی درہ کی فتح پر منحصر تھی۔ ...

مگر درہ کی حفاظت بوندی کا راجکمار کر رہا تھا اور "پھٹ توپوں" کی آتشباری، بیشمار لشکر اور بہادر شاہ کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ رومی خاں رات ہی سے سرنگ بچھانے میں مصروف تھا۔ اس نے درہ کے عاجز محافظوں کو توپوں کے گولوں اور گجرات کے بیشمار لشکر کے دفاع کی طرف متوجہ رکھا اور اس طرح سے سرنگ کو نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ مکمل کر لیا ——— کامل ایک گھنٹہ گزر چکا ہے کہ فتیلہ میں آگ لگائی جا چکی ہے ——— مگر درۂ بیکا کے جانباز محافظ آنے والی ہولناک مصیبت سے بے خبر دفاع کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ مگر چند سو جانباز راجپوتوں کا وجود ایک مضبوط چٹان ہے ——— درۂ بیکا کے چٹانوں سے بھی مضبوط ——— بہت زیادہ مضبوط ——— جس سے بیشمار فوجوں، گولوں، تلواروں اور نیزوں کا سیلاب ٹکرا ٹکرا کر الٹے پاؤں واپس چلا آتا ہے ——— ایک دھماکا ہوا اور درہ بیکا اڑ گیا ...... اور اس کے ساتھ بوندی کا راجکمار مع اپنے چند سو بہادر راجپوتوں کے راہی جنت ہوا۔ دشمنوں کی فوج میں خوشی کا نعرہ بلند ہوا کیونکہ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب قلعہ فتح ہو گیا لیکن انھیں معلوم نہ تھا کہ چتوڑ کا قلعہ ہے۔ دشمنوں کو بہت دیر تک خوشی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جب دھوئیں کا ابر چھٹا تو انھوں نے دیکھا کہ بہادران چتوڑ کا دوسرا دستہ مقابلہ کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ یہ راؤ درگا تھا جو چندوت کے بہادر سردار سنگھو اور دودو اور دوسرے بہادران راجستھان کے ساتھ بوندی کے راجکمار کی جگہ لینے کے لئے پہونچ گیا تھا۔ مگر چند راجپوت ایک بیشمار لشکر اور "پھٹ" آلات حرب کا کب تک مقابلہ کرتے۔ ہوا وہی جو ہونا تھا سب کے سب چتوڑ کی عزت و حرمت پر فدا ہو گئے۔ مگر اب بھی دشمنوں کی مراد پوری نہ ہوئی کیونکہ رانی جواہر بائی راٹھور نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ رانی فوجی لباس پہنے ہوئے تھی اور بہادر راجپوتوں کو للکار للکار کر دشمنوں کی صفوں کو درہم برہم کر رہی تھی مگر اس بہادر راجپوتنی کا بھی وہی حشر ہوا جو ہونا تھا۔

اب دفاع فضول تھا۔ محض جنون تھا اس لئے بہادر راجپوتوں نے آخری فیصلہ کر لیا کہ ہم سب لوگ کٹ مریں گے ..... مگر اودے سنگھ کو بچانا ضروری تھا۔ کیونکہ چتوڑ کے دفاعی دستہ کی سرداری وہی کر سکتا ہے جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑتا ہو۔ اس لئے دیولا کے راجکمار باگھ جی نے فوراً بڑھ کر میواڑ کا علم اٹھا لیا۔ اور اودے سنگھ کو بوندی کے راجکمار سورتان کے سپرد کر دیا گیا۔ ان ضروری انتظامات کے بعد قلعہ کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ راجپوتانہ کے موسم گرما کا آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تمازت آفتاب، لوؤں کی لپٹ، اور ناقابل برداشت گرمی کی حدت کی وجہ سے کسی انسان کا کھڑا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گجرات کا لشکر کثیر تھا، سامان رسد اور ہر قسم کے سامان وافر تھے

اس لئے گجراتی لشکر برابر بڑھ رہا تھا ــــ مگر چتوڑ کے جانباز سپاہیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ سامان رسد اور دوسرے ضروری سامان بھی ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت وہ فتح کے لئے نہیں۔ مرنے کے لئے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گجرات کے عظیم الشان لشکر کو دھیان میں نہیں لا رہے تھے کہتے ہیں کہ گھمسان کا معرکہ ہوا۔ شام تک جنگ جاری رہی اور جانباز اہل چتوڑ ایک ایک کر کے کٹ مرے۔

یہاں تو یہ ہو رہا تھا اور قلعہ کے اندر تیرہ ہزار عورتیں زعفرانی ساریاں پہنے، ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگائے گویا کہ وہ دوسری دُنیا میں اپنے شوہروں سے ملنے کے لئے جارہی ہیں، رانی کرناوتی کے ساتھ جلتی ہوئی آگ میں کود پڑیں اور اس طرح انھوں نے اپنی مقدس آبرو ــــ جو گنگا کے مقدس پانی کی طرح پاک تھی۔۔۔۔ جو رات کے چمکیلے ستاروں سے زیادہ چمکیلی تھی ــــ جو پہاڑ پر کی شبنمی صبح سے زیادہ دلفریب تھی، گجرات کے "وحشی" سپاہیوں کے ہاتھوں سے بچالی۔

(۶)

چنار گڑھ سے چتوڑ تقریباً ۵۲۵ میل ہے۔ ہمایوں نے شیر شاہ کا اظہار اطاعت قبول کرنے کے بعد اپنی بہن کرناوتی اور اپنے بھانجے اودے سنگھ کو بہادر شاہ والی گجرات کے حملہ سے بچانے کے لئے چتوڑ کی طرف کوچ کر دیا لیکن ایک عظیم الشان لشکر، سامان رسد، سامان حرب، یہ سب اسباب تھے جن کی وجہ سے تیزی کے ساتھ منزل طے نہیں کی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمایوں سارنگ پور پہونچا تو اس کو چتوڑ کی ہولناک تباہی کی اطلاع ملی۔ اس کے کلیجہ پر ایک چوٹ لگی۔ اس کا دل بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ بہت دیر تک غم و غصہ کے گہرے سمندر میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سر اُٹھایا اور فوراً بہادر شاہ کو جو اب تک چتوڑ ہی میں تھا ایک خط لکھا۔ خط میں بہادر شاہ کو بہت ملامت کی گئی تھی اور اس کو خبردار کیا گیا تھا کہ جو چتوڑ کا اس کے ہاتھوں ہوا ہے، وہی حشر گجرات کا ہونے والا ہے۔

(۷)

بہادر شاہ کا لشکر بہت بڑا تھا، سامان حرب کی بھی کمی نہیں تھی، پھر چتوڑ کی فتح نے گجراتی سپاہیوں کے حوصلے بھی بڑھا دئے تھے۔ گجراتی سرداران فوج کے حوصلے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ان کی رائے تھی کہ فوراً حملہ کر دیا جائے لیکن رومی خاں کی رائے ہوئی کہ اُردو کے چاروں طرف حصار باندھ کر جنگ کی جائے۔ بہادر شاہ رومی خاں کی گولہ اندازی کا لوہا مانے ہوئے تھا اور اس کو صائب الرائے بھی سمجھتا تھا اس کے علاوہ اس پر کچھ ایسا رعب چھا گیا تھا کہ اس نے رومی خاں کی رائے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا۔

مالوہ کے علاقہ میں منڈو کے قریب میدان جنگ قرار پایا۔ گجراتیوں نے اپنے فوجی کیمپ کے چاروں طرف خندقیں کھود دی تھیں اور بڑی بڑی توپیں لگا دی تھیں۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ ہمایوں کا ایک لشکری بھی گجراتی

کیمپ کے اندر گھسنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وقت یہ تھی کہ گجراتی لشکر کا ایک سپاہی بھی اپنے حصار سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ گجرات، مالوہ اور دوسرے مقامات کے راستوں پر جہاں سے رسد پہونچ سکتی تھی، مغلوں کا قبضہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کو شکل سے دو مہینے گزرے تھے کہ سامان رسد کی کمی سے سپاہی اور گھوڑے بھوک سے مرنے لگے۔ مجبور ہو کر بہادر شاہ ایک رات چُپ چاپ اپنے پانچ امراء کے ساتھ شاہی خیمہ سے نکل کر منڈو بھاگ گیا۔ گجراتی سپاہیوں کو جب اپنے بادشاہ کی غداری کی خبر ملی تو وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور سارا فوجی کیمپ مع مال و اسباب اور آلات حرب کے ہمایوں کے لئے چھوڑ گئے۔ لیکن ہمایوں کو تو بہادر شاہ کی گرفتاری کی لو لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اپنی پوری فوج کے ساتھ بہادر شاہ کے تعاقب میں منڈو کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب ہمایوں منڈو پہونچا تو رات ہو چکی تھی اور اتفاق سے رات بھی اندھیری تھی اور پھر سفر کی تکان سے چور بھی تھا لیکن بہادر شاہ کو گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھا ــــ ایسا بے چین تھا کہ رات کی تاریکی، سفر کی تکان غرضکہ کسی قسم کی مشکل اس کی بے چینی کی آگ کو بجھا نہیں سکتی تھی۔ اسی وقت شہر کے گوشہ میں فوج کے دستے پھیلا دئے گئے کہ جس گوشہ میں ملے فوراً پکڑ کر حاضر کرو۔ گھنٹوں کی تلاش کے بعد اُس مقام کا سُراغ ملا جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ ایک دستہ فوراً روانہ کیا گیا دستہ اس کے خیمہ کے دروازہ تک پہونچ چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ گرفتار ہو جائے لیکن جان ایسی پیاری چیز ہے کہ انسان بسا اوقات اپنی جان بچانے کے لئے شیر سے زیادہ بہادر، ہوا سے زیادہ تیز اور لومڑی سے زیادہ چالاک ہو جاتا ہے۔ بہادر شاہ گرچہ سو رہا تھا لیکن خطرہ کی آہٹ پاتے ہی فوراً جاگ گیا اور بجلی کی سرعت کی طرح اپنے چند رفقاء کے ساتھ جان بچا کر نکل بھاگا۔

ہمایوں کو جب خبر ملی تو اس نے فوراً تعاقب شروع کیا۔ بہادر شاہ منڈو سے بھاگ کر چمپانیر پہونچا اور فوراً قلعہ بند ہو گیا مگر ہمایوں بھی برق بلا کی طرح پیچھا کئے ہوئے تھا۔ بہادر شاہ ابھی سامان درست بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ ہمایوں پہونچ گیا۔ ہمایوں جوش میں بھرا ہوا تھا۔ قلعہ کی دیوار میں لوہے کی لمبی لمبی میخیں ٹھونک دی گئیں اور اکتالیس سپاہی جان پر کھیل کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ ان میں ہمایوں بھی تھا۔ پھر کیا تھا۔ ان جانباز سپاہیوں نے خود شہنشاہ کی قیادت میں دربانوں کو مار کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اور آن کی آن میں ہمایوں کا لشکر قلعہ کے اندر تھا۔ قلعہ کے فتح ہوتے ہی گوشہ گوشہ میں بہادر شاہ کی تلاش ہونے لگی۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بڑی تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ چور دروازہ سے نکل کر احمد آباد کی جانب بھاگا ہے۔ شہنشاہ نے فوراً تعاقب شروع کر دیا۔ لیکن احمد آباد پہونچ کر معلوم ہوا کہ شہنشاہی لشکر کے شہر میں داخل ہوتے ہی کھمبے کی طرف بھاگا ہے۔ اب ہمایوں نے صرف تھوڑے سے جانبازوں کو منتخب کر لیا اور باقی لشکر کو وہیں چھوڑ دیا اور کھمبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن جب کھمبے پہونچا تو معلوم ہوا کہ شہنشاہ کے داخل ہوتے ہی وہ بندر دیپ کی طرف بھاگ گیا۔ ہمایوں دانت پیس کر رہ گیا کیونکہ بیچ میں سمندر حائل تھا جس کو عبور کرنا ناممکن تھا۔ مجبوراً چمپانیر

واپس آیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ مرزا عسکری اور یادگار ناصر مرزا دونوں مل کر آگرہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور شیر خاں نے بہار اور بنگال میں بڑی طاقت پکڑ لی ہے اور اس کی طاقت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمایوں نے وہاں سے فوراً آگرہ کی طرف کوچ کر دیا۔

(۸)

واقعات بد سے بدتر ہوتے گئے اور متعدد مقامات پر شکست، ناکامی، اور مایوسی کے بعد ہمایوں کو ہندوستان کا شاہی تخت چھوڑ کر جلاوطن ہونا پڑا۔ لیکن باوجود ان تمام مصائب کے ہمایوں اپنے دل میں ایک اطمینان اور مسرت کی ٹھنڈک محسوس کرتا تھا کیونکہ ایک بلند تخیل کے لئے اُس کو تخت سے ہاتھ دھونا پڑا تھا ——— ایسا بلند تخیل جس کی قیمت ہندوستان کے شاہی تخت سے بہت زیادہ تھی۔ مدتیں گزر گئیں، زمانہ ہو گیا مگر ہمایوں کا نام اب بھی عزت، احترام اور محبت سے لیا جاتا ہے۔

شبلی ابراہیمی ام۔اے

"ایثار"

مختار اور ہاشم اس وقت سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے جب انھیں اس کا احساس بھی نہ تھا کہ محبت کیا چیز ہے، بچپن کی محبت اگرچہ اپنے اندر وہ طوفانی شورشیں نہیں رکھتی جو شباب میں نظر آتی ہیں لیکن اس کا معصومانہ انداز اور پاک جذبہ فرشتوں کے تبسم کی ابدی لذت اور دائمی مسرت رکھتا ہے، وہ ایک قوت تھی جو نہایت غیر محسوس انداز میں لیکن مسلسل ایک مقدس ارادہ کی طرح اُن کے سینوں میں پرورش پا رہی تھی۔ اگرچہ دونوں کی افتاد طبیعت میں کچھ فرق تھا دونوں کے خیالات میں جا بجا اختلاف تھا لیکن دوستی اور محبت کی نیرنگیاں ان سب پر بالا تھیں، ہر اختلاف صرف اپنی ذات تک محدود تھا اور ہر ذاتی نقطۂ نظر اس کی منفرد ہستی تک اثر رکھتا تھا، محبت کی بارگاہ میں پہونچکر ہر تفریق مٹ جاتی تھی، مختصر یہ کہ دونوں میں بیحد محبت تھی اور ان کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے لوگ آپس کی گفتگو میں دونوں کا نام بھی ساتھ ہی لیا کرتے تھے۔

ایک زمانہ گزرا اور دونوں کے بچپن نے کروٹ لی، شباب اپنی تمام ہیجانی کیفیتوں کے ساتھ آگیا، جوانی کی کیف آور گھڑیاں انبساط کے ساتھ افسردگی اور وارفتہ سری بھی لائیں، حسن و عشق کے معنی سمجھ میں آنے لگے اور دونوں احساسات کی اُس منزل پر پہونچ گئے جہاں پر خاموشی سے غم شگفتہ کی آرزو کی جاتی ہے اور ہر زیر نقاب چہرہ کو عریاں دیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے، ذہنیت کی یہ عجیب و غریب تبدیلی جس قدر زیادہ قوی ہوگی اُسی قدر سختی کے ساتھ زندگی کی منازل قطع ہونگی شراب میں جتنی زیادہ تلخی ہوگی خمار اُسی قدر زیادہ کرب و اضطراب پیدا کرے گا، متین اور سنجیدہ انسان بھی شباب کے ان کہربائی جھٹکوں کی تاب نہیں لا سکتے، جس میں ہر جمیل شے اپنی طرف کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر حسین جلوہ دعوت نظر دیتا ہے۔

تو ہاشم اور مختار اب جوان تھے اور حیات کے اُس نقطہ پر تھے جہاں سارے وجود پر ایک بیخودی سی چھائی رہتی ہے۔ محمد آباد (جہاں ان کا گھر تھا) کے قریب ہی غوث پور نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، ہاشم کا باپ وہاں کا زمیندار تھا، گاؤں آبادی کے لحاظ سے تو نہایت مختصر تھا لیکن شادابی میں اپنی آپ ہی مثال تھا، ہر فصل میں کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آتے تھے، باغیچوں میں پارک کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ آب و ہوا کے لحاظ سے دیہات کو شہر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے، غوث پور کی سادگی فطرت کے کارنامے کی بہترین مثال تھی، وہاں کی قدرتی کسی انسان کے ہاتھ کی مرہون منت

نہ تھی...... گاؤں سے ملا ہوا اوسر تھا اور کچھ بنجر زمین تھی جس میں غوث پور کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے چوپایوں کے ساتھ سارا دن گزار دیتی تھیں، قریب ہی ایک چھچلا تالاب تھا —— جو برسات میں شکاریوں کی امیدوں کا مرکز بنا رہتا تھا، ہاشم کو شکار سے ایک خاص دلچسپی تھی۔ یوں تو وہ ہر کھیل کا شیدا تھا لیکن شکار میں اُس کا شوق جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا

گرمیوں کی تعطیل ختم ہونے کے قریب تھی، بارش شروع ہو چکی تھی، گاؤں سے اطلاع آئی کہ تالاب میں بطخیں وغیرہ آنے لگی ہیں —— ٹھیک دوپہر کا وقت تھا جب ہاشم بندوق اور نثار کو ساتھ لیکر غوث پور روانہ ہو گیا، راستہ بھر شیریں فرہاد کے قصہ پر بحث ہوتی رہی، ہاشم کا خیال تھا کہ فرہاد کو اُسی وقت مایوس ہو کر اپنا کام تمام کر لینا چاہئے تھا جب خسرو کی رقیبانہ چشمک شروع ہوئی تھی کیونکہ ایک بادشاہ کے مقابلہ میں ایک معمولی پیشہ ور انسان کو کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی، لیکن نثار کا نظریۂ محبت اس سے بالکل جداگانہ تھا، وہ خیال کرتا تھا کہ محبت ایک غیر فانی قوت ہے جو پیدا ہونے کے بعد مٹ نہیں سکتی ہے، ممکن ہے کہ اُس کا محبوب اس سے چھین لیا جائے لیکن محبت پھر بھی باقی رہ جانے کی چیز ہے فرہاد کو کبھی اس قدر جلد مایوس نہ ہونا چاہئے تھا ...... بحث کا یہ سلسلہ اس وقت تک قایم رہا جب تک تالاب نظر نہ آیا کیونکہ اس کے بعد ہاشم نے فوراً موضوع گفتگو تبدیل کر دیا اور اس کی نگاہیں چڑیوں کی جستجو میں سطح آب پر گردش کرنے لگیں، بہت تلاش کے بعد بھی کوئی شکار نہ ملا دونوں ناکام غوث پور کے ایک باغ میں آئے کہ دوپہر کی گرمی سے پناہ لیں۔ انھیں گھاس پر لیٹے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ پیچھے سے دو لڑکیوں کے ہنسنے اور ہنسی کے ضبط کر لینے کی آواز آئی، نثار اور ہاشم اُٹھ بیٹھے، لڑکیوں نے ہاشم کو پہچانا کہ وہ ان کے زمیندار کا لڑکا ہے، دونوں نے سر جھکا لیا اور کوئی ایک منٹ بعد تیزی سے گاؤں کی طرف چلدیں۔

ہاشم نے لڑکیوں کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا لیکن پہچان گیا، رضیہ اور سائرہ ایک غریب گھر سے تعلق رکھتی تھیں، اُن کی اور اُن کی اعزہ کی گزر اوقات دن بھر ہر طرح محنت کرنے کے بعد ہوتی تھی، مشقت اُٹھانے کی وجہ سے اُن کے چہروں میں خون ہر وقت دوڑتا ہوا نظر آتا تھا، اُن کی اداؤں میں فطرت اپنے سادہ رنگ میں جلوہ نما تھی، تصنع کا شائبہ تک نہ تھا لیکن اُن کی سادگی ہی میں وہ انداز پنہاں تھے جو نہایت غیر محسوس طریقہ پر دل میں گھر کرتے جاتے تھے۔ کس قدر حیرت افزا بات ہے کہ ایک تیر افگن کے ہاتھ میں تیر و کمان موجود ہوں اور وہ ان کا استعمال نہ جانتا ہو ...... لیکن یہاں یہی عالم تھا۔ رضیہ کی پہلی ہی نگاہ میں ہاشم کو سرشار اور نثار کو بیخود بنا چکی تھی لیکن خود اُسے اس کا کوئی احساس نہ تھا کہ اُس نے کائنات میں کونسی نئی بات پیدا کر دی۔

حسن و جمال کے لحاظ سے رضیہ اپنے گاؤں میں اور قرب و جوار میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی اس کے صبیح چہرہ سے جوانی کی شراب چھلکی پڑتی تھی، اُس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک نئی رمق تھی یا تو وہ غربت کے احساس سے تھی یا دن بھر کی

محنت و مشقت کا نتیجہ لیکن اُس نے آنکھوں کی چمک اس قدر بڑھا دی تھی کہ دیکھنے والا انھیں عرصہ تک دیکھ نہ سکتا تھا، شباب کے لحاظ سے وہ ایک پھول تھی جو ابھی ابھی کھلا ہو۔ لیکن چونکہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی اس لئے ابھی اُس کی شادی وغیرہ کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا، ہندوستان میں ہر شخص وہیں شادی بیاہ کرنا چاہتا ہے جہاں حُسن بھی دولت کے ساتھ ہو۔

نثار اور ہاشم دونوں خاموش پڑے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا موضوع تخیل رضیہ کی ہستی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے احساسات سے بے خبر تھا، شام ہونے کو آئی اور آفتاب اتنا جھک گیا کہ باغ میں دھوپ آگئی، درختوں پر پرندوں کی آواز خوشگوار معلوم ہونے لگی، اس وقت ہاشم اُٹھ بیٹھا۔

"نثار کیا سو گئے؟" ہاشم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، نثار جیسے ایک شیریں خواب سے چونکا دیا گیا گھبرا کر اُٹھ بیٹھا

"نہیں سو تو نہیں رہا تھا ...... لیکن ہاشم کل کہاں رہتے ہو؟"

"کیوں؟ چلو ایک دفعہ پھر تالاب دیکھتے ہوئے گھر واپس چلیں" —— ہاشم نے کہا۔ "لیکن ہاشم اب ...... ہاں جلد چلنا چاہئے" نثار نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا —— دونوں چلنے ہی کو تھے کہ رضیہ ٹوکری لئے ہوئے لکڑیاں جمع کرتی ہوئی نظر آئی، وہ سیدھی اسی باغ کی طرف آرہی تھی، بغیر کسی ارادہ اور گفتگو کے دونوں پھر ٹھہر گئے، ایک قوت مجہول تھی جس نے اُن کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی اور اُن کی زبانیں بند کر دیں، رضیہ باغ میں آگئی، اس کی رفتار میں شہزادیوں کا سا استغنا اور دلکشی پائی جاتی تھی، قریب پہونچتے ہی ہاشم سے کچھ ایسا ظاہر ہوا تھا کہ وہ خود بھی دونوں کی قدر کرتی ہو۔ بات کرتے کرتے اس نے کچھ اور کہتی ہوئی ایک طرف چلدی۔ "ابھی یہیں گھر کا سب کام کرنا ہے" —— تھوڑی دور تک ہاشم اور نثار نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اس کے بعد ایک دوسرے پر نظر ڈالی دونوں کے چہروں کا رنگ اُڑا ہوا تھا، نثار نے وضع دخل کے طور پر کہا۔

"ہاشم تم پریشان نظر آرہے ہو"

"اور تمہارا چہرہ بھی مجھے بے رونق نظر آرہا ہے" —— ہاشم نے جواب دیا۔ اب دونوں نے سمجھا کہ ان کی زندگی میں کوئی انقلاب رونما ہونے والا ہے، اُن کے سکون میں فرق آنے والا ہے، اُن کے خیالات کوئی نئی کروٹ لینا چاہتے ہیں تالاب تک گئے لیکن شام زیادہ ہو گئی تھی اس لئے فوراً واپس ہو گئے۔ راستہ میں رضیہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، گویا فرہاد و شیریں کا واقعہ دوسرے الفاظ میں دہرایا جا رہا تھا۔

"دیکھو ہاشم قدرت کا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دل آویز پھول دامن کوہسار میں کھلتا ہے اور مرجھا جاتا ہے۔ اس کی بہار دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا ...... رضیہ کو تو وہاں پیدا ہونا چاہئے تھا جہاں اہل نظر اسکی پرستش کرتے اور ......"

زبانِ بے زبانی

(روسی افسانہ نگار ...... کے تتبع میں)

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی!

نہ جانے کتنی مدت سے تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں۔ برقرار اور بے قرار! بے زبان اور نغمہ زن! یاد نہیں کتنی مرتبہ کڑکڑاتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کہر کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں میں نے آسمان کی طرف اُٹھائی ہیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسم گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے میں لاغر اندام ہو رہا ہوں۔ میرے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے بے پردہ ہو گیا ہوں۔ میری پتیاں گر گئی ہیں۔ سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں — لیکن بہار! اس کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل ہی میں ایک ایسی کشش ہے کہ میری ان بے حرکت رگوں میں نئی زندگی کی بجلی دوڑنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندوہگیں پشیمانی خون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے۔

بہار! یہ لفظ کتنا سوگوار ہے، اور کتنا جاں فزا — جب حدِ نظر تک راتوں رات لاتعداد کنول کھل جاتے تھے اور میں اپنے آپ کو پھولوں کے ایک ناپید اکنار سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہانِ رنگ و بو میں سونے کی شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس شان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی حلاوت رہ گئی ہے۔ پیمانۂ دل مسرت اور احسان سے چھلکنے لگتا تھا۔ لیکن احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ مسرت اس روحانی سوز کو دبا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے ساز پر ہمیشہ درد کے ترانے الاپا کرتا ہے۔ حسن و جمال کی اس جولانگاہ میں بڑھاپا اپنی وزدیدہ نگاہیں ڈال کر یکایک مسکرا دیتا تھا اور میرے سکون و اطمینان کو ایک کھٹک اُڑائے جاتی تھی۔

تخیل تمناؤں کے آغوش میں پروان چڑھتا ہے۔ جب بڑھاپے کا خیال مجھے بے چین کرتا تو میں ایک جہانِ نو کی بنا ڈالتا — ایسا جہان جس میں برگد کی شاخوں میں بھی پھول لگتے ہیں، رنگا رنگ کے پھول، جن سے ٹہنیاں دلھن بن جائیں۔ ایک شاخ میں یاسمین، دوسری میں گلاب، تیسری میں صنوبر — پستی سے لے کر بلندی تک میں گل بداماں ہوتا! آہ تصور کتنا روح پرور تھا؟ لیکن مجھ کو ان داستانوں میں کیا رکھا ہے۔ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور یہ "امر بیل" لامحدود اور لازوال — مچلتی اور لپکتی ہوئی یہ "امر بیل" اب مجھ پر محیط ہو چکی ہے۔ میں عظیم الشان اور پُر وقار ہوں لیکن

میری عظمت اور شوکت ہی نے مجھے اس "چنچل" "البیلی بیل" کے آگے بے بس کر دیا ہے۔ ایک دن یہ ننھی اور حقیر بیل میرے قدموں سے لپٹی رہتی تھی لیکن آج اس نے میرے جسم کو زنجیروں سے کس دیا ہے اور میری مغرور گردن کو خم کرنا چاہتی ہے۔ اس کی گرفت کتنی جاں گداز ہے — کتنی روح فرسا ہے اور دردناک! تمنا کی طرح لا دوا اور فراق کی طرح یاس انگیز جو میرے ناتواں جسم کو بھینچ کر اس کی تازگی اور شگفتگی سلب کر لینا چاہتی ہے۔ اور میں — حرماں نصیب اور بدبخت "میں" ماضی کی یاد میں اشکبار اور مستقبل سے خوف زدہ ہیں" — اس بے حقیقت بیل کی خواہش کے آگے مائل بہ خود سپردگی نظر آتا ہوں۔

تاہم لگا ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بیل کے مس میں کوئی مقناطیسی کشش ہے۔ جس طرح کسی باکمال کے رباب کی جھنکار خفتہ اور مردہ راگوں کو زندہ کر دیتی ہے، جس طرح موت کی ہچکیاں بھرتے ہوئے بھی سرِ بہار کی رنگینیوں سے دوچار ہو کر دم بھر کے لئے جوان ہو جاتا ہے جس طرح کسی رہزن عقل و ہوش کے شانوں پر سر رکھ کر زاہد خود فریب کی پسلیاں پھڑکنے لگتی ہیں بالکل اسی طرح میرے تمام جسم میں، میری ٹہنیوں میں اور میری پتیوں میں، دل کی ایک ایک دھڑکن اور نبض کی ایک ایک حرکت میں اس ایک ولولہ بے دلی اور ایک دھندلی سی تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت دفعتاً میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری ٹہنیوں میں اتنی ہی ایک ہوتی جتنی اس "امر بیل" میں ہے تو میں اس کی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیتا اور اسکے بوسہ کو پوری زندگی کی درازی عطا کرتا۔ لیکن الٰہی! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا کہ میں محبت حاصل کر سکتا ہوں واپس نہیں کر سکتا۔ دامِ عشق میں گرفتار نہیں کر سکتا۔ بے ...... کے گیت سمجھ سکتا ہوں گا نہیں سکتا۔

جب بادۂ عشق میں سرشار ہو کر جذباتِ دل کو عالم آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یکایک مجھے اپنی بے حسی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ارمانوں کے ہجوم پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے۔ میری بے تابی کا صرف ایک ثبوت ہے — پتیوں کی خاموش جنبش! ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوزِ نہانی کی سرگم ہے۔ اُف اتنا تند و توانا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں۔

بہار، نسیم، گل و بلبل، آہ و زاری — رنگین خوابوں کا ایک میلہ! لیکن زندگی کی پت جھڑ میں بہار کی آن محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی۔ اب تو میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں جہاں غنچے نہیں چٹخے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی ایسی کہ ان میں کیف و سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک دکھائی ہے۔ اب بھی میرے اردگرد بہاران میں زمین گل فروش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرطِ انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے میرا دل بھی بھر آتا ہے۔ لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ دریائے حسن کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لنگوٹ ...... کرتا ہوں گویا ستاروں سے معروفِ گفتگو ہوں۔ میں خط سے میں اُٹھ آیا اس میں ...... کی آرزو نہیں کرتا ...... تو جھات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہو تی ہے جس کا تخیل میرے ناسوروں کو ہرا بھرا رکھتا ہے — ...... بیل

فنا پر حاوی اور ابد و بقا کی ندیم ہے۔ جب میں زمین کے دامن میں لپٹ جاؤں گا تو شاید وہ میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی۔ ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج اُبھرا تھا اور میں جوان تھا۔ میرے سڈول جسم میں مسرت کی اُمنگیں موجزن تھیں اور روح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا۔ میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج نے سر نکالا۔ اس کی زرد کونپلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس و ناکام مُرجھانے لگیں۔ ہاں اس وقت اسے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے بچے کو گود میں لیکر باپ کو ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس کی بابت دل میں یہی جذبہ پیدا کرتی رہیں۔ لیکن چشم بد دور، رفتہ رفتہ وہ ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی اور اب اسے چھونے کے بعد وہ معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس میں ایک ایسا عجیب بانکپن پیدا ہو گیا جو میری آزادی پر پھندے ڈالنے لگا۔ جب کبھی کچھ سوچنا چاہتا تو اس کی یاد آتی گو کہ اس یاد میں حیا بھی تھی اور تمنا بھی۔ غرض کہ کے ساتھ ابھر مرمٹنے کی آرزو بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ۔ آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہونچ چکا ہوں ان دنوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصویرِ حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، تمنا و اطمینان سے لبریز تھی۔

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سیندور اور چندن ملا کرتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سیندور کی ایک گہری لکیر کھینچ دیتیں۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی دوشیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے سیمیں بازوؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے خاکی تنے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبیں کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی شاید اس سے اس کے قلبِ حزیں کو کچھ قرار ہو جاتا تھا۔

دُنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حسینانِ عالم اس بیل کی صورت دامِ بلا میں گرفتار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھ پر ان کے ناز و نیاز کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بدبخت میرے دامن کو تھام کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتی "دیوتا میری مُراد کب بر آئے گی" تو میں بھی پسیج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلا کر کچھ کہنا چاہتا۔ لیکن خبر نہیں کہ میرے اشاروں کو وہ سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل و ثمر برگد نہ ہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا۔ کم از کم اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حُسن کی وہ مورت مجھے چھوتی تو مُرجھائے ہوئے پھول پھر کھل جاتے اور اس کے قدموں پر اشکبار برس کر گویا میرا پیغام پہونچا دیتے ——— لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی۔

تاہم ان کی قربت میرے جسم میں تھرتھری پیدا نہ کر سکتی تھی۔ میں از سر تا پا کانپنے نہ لگتا تھا۔ لیکن کبھی جب کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی کونپلوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ جناب باری سے دل ہی دل میں فریاد کرتا اس اُمید پر کہ وہ روح کی آواز کو پہچانتا ہے "یارب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب و الم نصیب ہو" وہ بیچاری مجھے دیوتا مان کر پھولوں کی نذر چڑھا جاتی اور راستے میں بددعا دیتا۔

محبت کے نشہ میں میں مدہوش تھا جس کو عقل و خرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبت؟ کاش میں جانتا ہوتا! کاش میں جانتا ہوتا!!

لیکن کیا سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا؟ گو کہ یہ بیل آج میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا مس میرے لئے کتنا ولولہ انگیز ہے۔ محبت آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکسِ رُخ دیکھتا ہے اور ایک بار چور چور ہو جانے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آسکے گی؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑ جاتا ہے۔ عشق وار پر وار سہتا ہے، پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اُف نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خوددار اور غیور ہوتا ہے جو صرف ایک جھڑکی شمعِ زندگی کو گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں اتنا دخل حاصل کر چکی ہے۔ لیکن اس کشش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ پگلی عشق کا پرتو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس۔

داستانِ محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اُٹھتی ہے۔ محبت سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ سب تشنۂ تکمیل رہیں اور اس کا سزاوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ زمانے نے مجھے اس "امر بیل" سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان الھڑ نادانوں سے انصاف نہیں کیا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے ——— ایسا حق جو ناقابلِ بیان ہے ——— محروم کر دئے گئے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لینے لگتی ہے تو آرزو ہوتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا۔ ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی اپنی پرچھائیں کو تاکتے تاکتے میں یوں بوڑھا نہ ہو جاتا۔ میری زندگی بھی رواں، دواں اور جوان ہوتی تاکہ محبت کا اظہار کر سکتا اور اس طرح بے زبان و بیقرار نہ ہوتا!

لیکن کیا قلبِ انسانی میرے جذبات کا احساس نہیں کر سکتا؟ کیا انسان کی محبت اتنی مختلف ہے؟ کیا اسکی فریاد کی کوئی لے ہے؟ کیا اس کے نالوں میں کوئی نے ہے؟ کیا میرے جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ گہری سانس کافی نہیں جو طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی دُنیا میں بھی محبت کا پھول اندھیرے میں کھلتا اور مرجھاتا نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی محبت کی انتہا یہ نہیں ہے کہ گفتگو کے لئے الفاظ ناکافی ہوں اور صرف سانسوں کا اُتار چڑھاؤ جہانِ معنی میں ارتعاش پیدا کر سکے؟ کیا ان میں بھی تمنا کے بعد پشیمانی اور فریاد کے بعد شرمساری پیدا نہیں ہوتی؟ ندی کی طرح انسان ہمیشہ گردش میں ہے اور ہم پہاڑ کی طرح اچل ہیں۔ لیکن ہم اس سے کہیں زیادہ عمر دراز اور مستقل ہیں۔ انسان کی محبت ایک شمع ہے جو بجھنے کے لئے روشن ہوتی ہے۔ ہماری محبت کی مثال جگنو سے دی جا سکتی ہے جو تا عمر جلتا ہے اور بعد از مرگ بھی روشن رہتا ہے۔

ایک زمانہ گزرا، ان دنوں مجھے اس "امر بیل" کی ناز برداری سے فرصت نہ تھی۔ اول اول اس کے بوسوں میں مجھے ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی اور اس نئے جذبہ کے اسباب و اثرات معلوم کرنے میں میں اتنا محو تھا کہ گرد و پیش سے

قطعاً بے نیاز ہو گیا تھا سہوے بھٹکے اپنے ماحول پر ایک آدھ نگاہ غلط انداز ڈال دیا کرتا تھا۔ میں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں وہ روز پیش آتا تھا اور اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی میں بے خبر تھا۔ تاہم نادانستہ طور پر یہ حادثہ مجھ پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ اسے میں آج تک نہ بھول سکا۔

جو بُت میری قدم بوسی کر رہا تھا، اس کی پوجا کے لئے صدہا عورتیں آتی تھیں۔ روز کوئی پرانی پجارن غائب ہو جاتی اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی نئی حسن کی دیوی آجاتی تھی۔ یہ نئی نویلی شرم کے بارے دبی جاتی تھی۔ نرگسی آنکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں اور رُخِ پُرنور تار تار نقاب کے اندر بھی عرق عرق ہو جاتا تھا ——— مجھے بے جان سمجھ کر وہ کبھی میرے جسم کا سہارا لیتی اور کبھی اپنے ناخنوں سے میرے تنے کو کُریدا کرتی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا اور میں گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتا کہ مُبادا وہ سہم نہ جائیں۔ ایک لمحہ کے بعد نقاب ان کے رُخِ روشن کا پردہ دار بن جاتا، پھولوں کے ہار ان کے بیدار جذبات کو تھپکیاں دیتے اور چھاگل کے گھونگرو ان پیروں کو چوم کر رقص کرنے لگتے تھے۔

ان مہوشوں میں سے ایک کا وتیرہ سب سے جدا تھا۔ نگاہیں سمیٹے سب سے چھپ کر وہ میرے پاس آتی اور سجدہ کر کے فوراً چلی جاتی تھی ——— اس خوف سے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ زیبائش سے وہ اتنا ہی دور رہتی جتنا کہ چاند۔ نہ اس کی جبیں پر "ٹیکا" ہوتا نہ پیروں میں چھاگل۔ اس کی سادگی سفید ساری سے یوں چھن چھن کر نکلتی تھی جیسے بنت البحر نے نہنگ آسا موجوں سے سر نکالا ہو یا دوشیزۂ صبح سفید بادلوں میں تیر رہی ہو۔ اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ کبھی وہ صبح میں آتی کبھی دوپہر میں اور کبھی دونوں وقت ملے۔ جب وہ شام کو آتی تو اسی "امربیل" کو تھام کر میری گھنی چھاؤں میں بیٹھ جاتی جب تک سورج شب کے محل میں آرام کرنے نہ چلا جاتا وہ اپنی پُر حسرت نگاہوں سے اس معتزل ناتمام کو تاکا کرتی۔ ہوائی ہوئی پگڈنڈی کی خاک شفق کے پرتو سے لالۂ گل بن جاتی جیسے خونِ تمنا کی سرخی ابھر آئی ہو۔

ماضی ناکامیوں کا آماجگاہ اور مستقبل امیدوں کا آئینہ ہے۔ ماضی افسردگی کے قلم سے اس کے چہرہ پر ناکام آرزوؤں کے افسانے لکھا کرتا۔ جب اس کے سینہ سے گہری سانسیں نکلتیں تو میرے پتے بھی ضبط نہ کر سکتے اور پیہم چیخ اُٹھتے تھے۔ کبھی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور نہ اس نے کوئی دُعا مانگی۔ ہاں گاہے گاہے وہیں بیٹھ کر وہ کچھ گنگناتی ضرور تھی لیکن ان نغموں کو میں نہ سمجھ سکتا تھا۔

پہلے تو میری توجہ اس کی طرف منعطف ہی نہیں ہوئی لیکن شام کے سناٹے میں جب وہ عموماً ادھر گزرنے لگی تو میری دلچسپی بھی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ سورج کے ڈھلتے ہی میں بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگتا اور اس کے آنے میں جتنی تاخیر ہوتی ہولِ دل اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ خلافِ معمول ایک روز وہ نہ آئی تو میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ دامنِ مغرب میں سورج نے منہ چھپا لیا، لیلائے شب نے نقاب سے سر نکالا، ستاروں کی انجمن منعقد ہوئی، چاند کی کرنوں نے اپنا ساز چھیڑا۔

کہکشاں نے آسمان پر کلیاں بکھیر دیں ——— پھر بھی وہ نہ آئی!

دو دن، تین دن، سیکڑوں ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن وہ نہ آئی یہاں تک کہ میں نے اس کے انتظار سے منہ موڑا اور اپنے منتشر جذبات کا مخزن اسی باوفا "امربیل" کو بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اسے بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ آگئی ——— ایک ہیبت ناک خواب کی طرح، وہ دن بھی یاد رہے گا گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی تھی۔ بادِ تند کے جھکولے کھا کھا کر "امربیل" تھرتھرا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے کس پہلو میں جگہ دوں۔ یکایک دیکھا کہ اسی خاک آلود راستہ پر وہ تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن وہ بدل چکی تھی۔ وہ جمالِ جہاں آرا بوئے گل کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ چہرہ پر اتنی جھریاں تھیں گویا عمرِ رفتہ نے اپنی آستینوں کو چبا ہو۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹ سوکھ کر ڈھلک گئے تھے۔ جب میں نے دونوں تصویروں کا مقابلہ کیا تو وحشت سی ہونے لگی۔

الٰہی! حسن کو فنا ہے تو عشق کو لازوال کیوں بنایا؟ قریب آکر نہ اس نے ہاتھ باندھے نہ سر جھکایا اور نہ اس بیل کا سہارا لیا۔ ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑی اور زار زار رونے لگی۔ آہ! میں اس کے گیت سننے کا آرزو مند تھا۔ آنسوؤں کی زبان کو میں کیا سمجھ سکتا۔

میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک ساری باندھے ہوئے ہے۔ جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے پیر خون میں رنگے ہوئے جسم تا زمیں خاک آلودہ: روتے روتے وہ کہنے لگی "دیوتا؟ سب نے مجھے ٹھکرا دیا۔ انسانوں کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی۔ میں نے بے وفائی کی، احسان فراموشی کی ——— کس اُمید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دُنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دُنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں جگہ دو گے۔ جانتے ہو! اپنے کاندھوں پر کیسے گناہِ عظیم کا بار لے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد طیار نہیں۔ دیوتا! کیا تم میرے گناہوں کو در گزر کرو گے؟"

اس کی فریاد میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاش کہ شبنم کے چند قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اُسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا۔

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کئی گھنٹے گزر گئے اور وہ اسی حال میں پڑی رہی۔ بعد ازاں اس کا جسم یکبارگی لرزا اور پھر اینٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بُڑبُڑانے لگی۔ "کیا عورتوں کو بھی درحقیقت خدا ہی نے پیدا کیا تھا؟ اور بچہ کو؟ ——— اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اُٹھائے گا۔ خدا رحیم و کریم ہے ——— شاید مردوں کے لئے۔ لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟

خدا، جنت، روح، دُنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے ——— آہ میرا بچہ! میرا بچہ!!"

آسمان پر ستاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جگمگاتا رہ گیا۔ نسیمِ صبح کی خنکی تیز تر ہو گئی۔ شب کی سیاہی

اور بھی گہری ہو گئی۔ اسی عالم سکوت میں یکایک ایک روح فرسا چیخ اس کے سینے سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی ساری کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی — ایک ہچکی اور ایک چیخ —— کتاب زندگی کی یہ تفسیر تھی وہ مر چکی تھی۔

جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے، بازو میں پھٹی ہوئی ساری پڑی تھی جس پر ایک بچے کی خون آلود لاش رکھی ہوئی تھی۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا اور آس پاس کی مٹی پر ایک سرخ ترجم گئی تھی۔

جذبۂ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقانیت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب و غریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے میرا قیاس غلط ہو ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میرے تخیل کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ وہ پاپ ہے جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شقی القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے سینچی گئی ہیں جنھیں انسانیت نے محبت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں بے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشات نفسانی پر؟ وہ عورت بے گناہ تھی۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا۔ وہ مرد کی تاپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اسے مجرم کیوں قرار دیا گیا؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچے نے کیا نقصان پہونچایا تھا؟

انسان در اصل کس سے محبت کرتا ہے —— اپنی خودی سے یا معشوق سے؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں! جو بھی ہو انسانیت کے دعوائے محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں درندگی مسکرا رہی ہے۔

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت ایک گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکایک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی —— اتنی طولانی زندگی یونہی برباد ہو رہی ہے

اس امر بیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پنہاں ہے۔ ایک درد ہے میٹھا میٹھا، ایک ٹیس ہے دلنواز، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود بربادی کا یہ احساس، زندگی کی یہ تمنا کسی تصور پر مر مٹنے کی یہ آرزو کسی دوسرے خیال کو دلنشین ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو قدرت کی لامحدودیت میں گم کر دوں، کبھی یہ سوچوں کہ زندگی لاحاصل اور بے معنی ہے، ایک مرتبہ از سر نو شباب پرور اور تازہ دم ہو جاؤں۔ مگر کجا پیر زال سال برگد کا ایک "ٹھونٹھ" اور کجا قدرت کا اٹل قانون! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں، چلنا چاہتا ہوں لیکن پیر نہیں۔ آہ! میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں، ایسی محبت جو ہمیشہ حیات تازہ بخشے اور کبھی نہ مرجھائے۔ لیکن میرا جمود مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے اور عشق کی بارگاہ پر جبیں سائی کا موقع نہیں دیتا۔ یا تو میں اظہار محبت ہی سے قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مہر سکوت

لگا دیتی ہے۔

میرے ذہن میں کسی کی یاد کا دھندلا سا خیال رہ گیا ہے۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے۔ صرف ایک نقش ہے وہ بھی ناکام آرزوؤں کی راکھ میں دبا ہوا۔ جس طرح کہر میں شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی شبنم کی بوندیں دکھلائی پڑتی ہیں اسی طرح وہ یاد جذبات کے دبیز پردہ میں ہے اس کا ایک نقش باقی ہے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کی ہمہ گیری اور وسعت سے اسکا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یہ یاد نہیں آتا۔

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جب نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا۔

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شاید لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ اب نہ وہ بت خرسندہ پرستش ہوتا نہ میرا چبوترہ سجدہ گاہ قرار پاتا۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گزرتا تو سہمی ہوئی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے پاس سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہو کر میری طرف پتھر پھینکتے اور بھوت بھوت کا شور مچاتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت بھی اتنی ہی ناپائدار ہوا کرتی ہے جتنی اس کی محبت؟ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگ آستاں اس گاؤں کا سنگ جبیں بنا ہوا تھا۔ میں تنا ہی عالم بعد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دکھ درد کا مداوا مانگتے تھے گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کشا تھا۔ حالانکہ میں ان کے آلام کا سد باب نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔ میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ جیسے ہی اس دکھیاری نے میرے پاس آ کر اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کر لیا تو گویا میری ساری وقعت بھی اس کے خون میں دھل گئی۔

کیا ان تمناؤں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بو نہ تھی؟ اس روز پتہ چلا کہ انسانیت کو در اصل کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ لیکن اس احساس نے بھی مجھے بخس اور ناپاک بنا دیا ہے۔ جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے۔ اب جب میں اس عالمگیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے!

عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ محبت روشنی ہے، عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے۔ محبت امید ہے، عبادت ناامیدی میں امید کی تلاش ہے۔ محبت دریا کی پر سکون روانی ہے، عبادت تلاطم خیز سمندر میں ساحل کی تلاش ہے۔ میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے۔ میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے۔

خزاں یہ کہتی تھی میں خوشی بہاراں ہوں

رفتہ رفتہ جنون وحشت کا وہ دور گزر گیا اور میں از سر نو جوان ہونے لگا۔ میری کونپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کی ادائیں آنے لگی۔ میرے برگشتہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے

الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تک ہر شے موسیقیت کے نشہ میں متوالی ہو گئی ہے۔

شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔ اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملتے دیکھا تھا، آج یہ کلنک کا ٹیکہ بھی مٹ گیا۔ عزت کا ستون ایک لمحہ میں مسمار ہو گیا تھا دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا۔ اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف و خطر میرے قریب آنے لگے۔ گو کہ وہ میری پوجا نہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لاپروائی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو کہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ یا تو یہ تغافل تھا یا غرورِ حسن بہرکیف میں خوش ہوتا تھا کہ خستگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انھیں کچھ دیر سکون تو پہنچا سکا۔ اور ننھی ننھی لڑکیاں بھی میرے ارد گرد ناچنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقصِ شرر تھی اور بس! آہ میرے ٹوٹے ہوئے مندر کی تعمیر دوسری تو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہو گئی ہو اور لوگ اس سے سرائے کا کام لینے لگے ہوں۔

قسمت نے پھر پلٹا کھایا، جب مشرق کی وادیوں سے دوشیزۂ صبح آنکھیں ملتے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پپیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں۔ نسیمِ صبح کی چال آرائیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرطِ انبساط میں لرزنے لگتے۔ کنول کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی۔ جب ساری دنیا ایک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو "وہ" آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں مینڈکی مانند کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں جب آفتاب کی گستاخ کرنوں کے بوسے اس کے رخساروں کو لالہ زار بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آکر کھڑی ہوتی۔ اس کی سج دھج بھی نرالی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے۔ یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا نرگسی اور نارنگی لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں۔ اور اللہ رے دیدہ دلیری! اس کی نگاہیں کبھی جھکتی نہ تھیں ہمیشہ سامنے کی طرف تاکتیں۔ ان میں جھجک کا نام نہ تھا ان میں ایک برقِ تجلی پنہاں تھی جو دیدارِ عام کی دعوت دے رہی تھی۔ شوخی اور جادو کی لا انتہا بجلیاں جو کیٹ آور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری پابندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو۔

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی چولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لبریز ہے میں سوچنے لگتا ایسی کونسی بات ہو سکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور دلنواز ہو اکثر وہ ادھر آتی اور گھنٹوں عالمِ تخیل میں مسرت کے طلسم گوندھا کرتی اور مجھے کبھی اس خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا۔

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا۔ حیف جس جھوٹے دیوتا کی عبادت میں نے عمر گزار دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اسی کی پجارن تھی۔ دریائے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی کیا در حقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا کیا وہ تمناؤں اور حسرتوں کے بھنور سے نکل چکی تھی اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک روز اسی راستہ سے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا، اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے ——— اس نے پجارن کی

آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دئے تھے اور وہ مسکرا رہی تھی ——— آہ وہ مسکراہٹ!

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کر کے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں۔ انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا اندازِ تکلم بھی بھول جاتا ہے۔ وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے پہلے آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنھیں ہم بے جان نہیں سمجھ سکتے۔ آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھک جاتی ہیں کاش کہ میں پانسا ہوتا کاش کہ میں جانتا ہوتا! ——— ایک عرصہ تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی نوجوان پہلے آ جاتا۔ اور زیرِ لب کچھ گنگنایا کرتا۔ گو میں اس کی آواز سن سکتا تھا لیکن اس کی خود فراموشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹہلنے لگتی اور کبھی کبھی اس سے بھیگا ہوا ایک آدھ تنکا اٹھا کر اپنے دانتوں کو کریدنے لگتی۔

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔ وہ نور کے تڑکے آئی اور دوپہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں اس خلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔ عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تمکنت کی ضد تھی کہ ان کی بات رہے۔ آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس "امر بیل" کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی دوپہر تک وہ بیٹھی رہی ——— لیکن وہ نہ آیا۔

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہو گئی۔ اب انتظار تھا اضطراب کا نام نہ تھا۔ انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی جاتے جاتے وہ کہنے لگی ——— مجھ سے یا اس "امر بیل" سے اپنے آپ سے یا کسی نامعلوم آدمی سے یہ میں کہہ نہیں سکتا۔

وہ کہنے لگی "ٹھیک ہوا۔ اس محبت کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اگر فرضِ منصبی کو بھلا کر راحت کی جستجو ہی محبت کا ماحصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو نہ ابھار کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے۔ اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔ محبت شدنی کی گود میں پھولتی پھلتی ہو ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی" وہ اٹھی اور چلی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرہ سے اوجھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے بیشتر مشاہدات بھی ختم ہو گئے سالہا سال جس سرابِ صحرا کی جستجو میں میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا "ورنہ ہماری محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی" جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشو و نما پاتا ہے روشنی آتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے۔ عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنۂ تکمیل رہ گئی ——— لیکن اس سے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ ادا کر دے گا۔

میں دیکھتا ہوں کہ دُنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازع ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقا کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی، شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری طاقت تخریبی ہے۔ طوفان میں درختوں کو توڑ کر، برق بلا سے خرمن کو جلا کر، آگ اور خون میں بربادی کے نشان چھوڑ کر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے۔ گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی ہے۔ شاید محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے۔

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دُنیا میں اکیلا ہوں۔ نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا۔ میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں غمگسار اور ہمدم کہاں ہیں ممکن ہے کہ پہاڑ کو بھی کسی سہارے کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمنا دل کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا۔ تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے۔ میرے چاروں طرف قدرت ارتقا کی بلندیوں پر ہمدردی اور محبت کی سیڑھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تنہا بے چارگی کی حالت میں کھڑا یہ تماشا دیکھا کرتا ہوں۔

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میری تمام خواہشیں پوری ہوئیں۔ کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا۔ لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے۔ صد ہا بار دُنیا کو بہار کی رنگینیوں میں سرشار دیکھا ہے۔ ہزاروں آدمیوں نے میری قدمبوسی کی ہے اور بے شمار نازنینوں نے مجھے اپنا راز داں بنایا ہے۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ اس "امر بیل" کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی، برسات کی سحر پروری، خزاں کی گرمی اور سرما کی تندی کا لطف بیک وقت نصیب ہوا ہے۔ اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آزادی کی مسرت حاصل کی ہے۔ صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ٹھوکے دیا کرتی ہے ———— وہ یہ کہ ———— میں بے زبان رہ گیا!
میری تمنا ایک معنی بے لفظ ہو کر رہ گئی۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دُنیا بے زبان ہے۔

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں۔ جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم نطق رکھا۔ مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دُنیا کی "زبان بے زبانی" کا ایک خاموش تماشائی ہوں۔

اختر حسین (رائے پوری)

گئو ہتیا

(۱)

راجی نے اُس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس میں کوئی حرکت نہ تھی۔ اس کی ناک کے سامنے ہاتھ کی پشت رکھی۔ سانس بند تھی۔ اس نے اسے جھنجوڑا۔ لیکن اس میں جنبش تک نہ ہوئی۔ بچھڑا مر چکا تھا۔ اور راجی گئو ہتیا کا پاپی۔

جب تک ہمارے دل میں امید کی کوئی رمق باقی رہتی ہے۔ اس وقت تک ہمیں خطرہ کا پورا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن جس وقت ہر طرف سے آس ٹوٹ جائے تو معمولی خطرہ بھی بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت رسی بھی سانپ نظر آنے لگتی ہے۔ جب تک راجی کا خیال تھا کہ بچھڑا مرا نہیں یونہی اس کی لاٹھی کی چوٹ سے بے ہوش ہو گیا تو اسے اپنے فعل کی اہمیت پر سوچنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اب جو اسے یقین ہو گیا کہ بچھڑا واقعی مر چکا ہے تو اس کا سر چکرانے لگا۔ میں گئو ہتیا کا مجرم ہوں اور اس پاپ کا پرائشچت، مجھے سارے تیرتھوں پر ایک ایک گھر سے بھیک اور گھر والوں سے اپنے پاپ کے لئے کشما مانگنا پڑے گی۔ پنچایت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میری غیر حاضری میں کھیتی باڑی کا کون خیال رکھیگا۔ اور بوڑھی ماں کا کون نگراں ہوگا۔ وہ تو کلپ کلپ کر مر جائے گی۔ اور گوری! کیا اس کے والدین اب اس کی شادی مجھ سے کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ ایک گئو ہتیا کا پاپی ہے اور اگر وہ تیار ہو بھی تو کیا وہ تیرتھ یاترا سے میری واپسی تک انتظار کریں گے۔ ہائے میں کہیں کا نہ رہا۔ مجھے کیا معلوم تھا، بچھڑا مر جائے گا، یونہی ہلکی سی چھڑی ماری تھی وہ اس کے سر ہی پر لگ گئی۔ غلطی میری ہی تھی، میں نے اسے مارا ہی کیوں، اگر اس نے منہ کھیت میں ڈال بھی لئے تھے، تو میرا کون سا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ کھیتی اب کے بہت اچھی ہے اور اس کے چر جانے سے کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے بچھڑا مر چکا ہے اور مجھے پرائشچت کرنا ہی پڑے گا۔

سارے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ رام جی نے بچھڑا مار ڈالا ہے جس نے سُنا دانتوں تلے اُنگلی دبالی۔

"رام رام! ہندو کا پوت اور ایسا پاپ"
"یہ سب کلجگ کے کھیل ہیں جی! کہیں پہلے بھی ایسا ہوا تھا"
"ہم تو اس گھر کا پانی نہیں پئیں گے اب"
"تو اس بے چارے نے جان بوجھ کر تھوڑی ایسا کیا۔ اتفاق سے چھڑی ایسی جگہ پڑ گئی کہ بچھڑا مر گیا۔"
غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ شام کو راجی کے گھر میں گاؤں کی پنچایت ہوئی۔ فیصلہ ہوا، رام جی نے جو پاپ کیا ہے اس کا

پراشچت یہی ہے کہ راجی منہ پر کپڑا ڈال کر سارے تیرتھوں کا اشنان کرے اور جہاں جائے وہاں گھر گھر بھیک مانگے اور گھر والوں سے اپنا پاپ بتا کر کشما مانگے۔

فیصلہ اٹل تھا اور اسے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔

(۲)

راجی کی بوڑھی ماں کا حال بے حال تھا، دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر تھی، راجی اس کا اکلوتا بیٹا تھا وہ دو برس کا تھا کہ اس کے باپ نے کال دیوتا کا سواگت کیا۔ بیچاری نے بڑی مشکل سے اسے پالا تھا۔ مرغی اپنے بچوں کو ادھر ادھر لئے پھرتی ہے اور چوکنی رہتی ہے کہ کہیں کوئی چیل جھپٹ نہ لے جائے، بلی کتا حملہ نہ کردے۔ راجی کی ماں کی حالت اس مرغی سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ آپ بیوہ، بچہ معصوم، رشتہ داروں نے ہمدردی اور سر پہ ہاتھ رکھنا درکنار یہ چاہا کہ جو کچھ گھر میں ہے اس پر ہاتھ صاف کریں، انھوں نے کوشش کی کہ نوجوان بیوہ کو تنگ کریں تاکہ وہ کہیں اور چلی جائے اور خود کھیتی باڑی پر قبضہ جمالیں مگر اس ستی نے اپنے مرحوم خاوند کی نشانی کو کلیجے سے لگایا اور گھر سے باہر قدم نہ رکھا۔ اسے امید تھی کہ رام جی جوان ہوگا تو سارے دلدّر دور ہو جائیں گے وہ تو ایشور نے گاؤں کے مکھیا کے دل میں خیال ڈال دی کہ جب اس نے سنا کہ اس کے رشتہ دار بیچاری بیوہ کو تنگ کر رہے ہیں تو اس نے انھیں بلا کر ایک ڈانٹ بتائی اس کے بعد ہر فصل کے موقعہ پر وہ اپنے سامنے پیداوار کا حصہ اس کے گھر پہنچواتا، تاکہ انھیں بے ایمانی کرنے کا موقعہ نہ ملے۔

دو برس کی جان کا پالنا آسان کام نہیں اس کے سر پہ سیسیوں پہاڑ گر پڑے لیکن مستقبل اسے ہمیشہ درخشاں نظر آتا تھا میرا راجی جوان ہوگا، چاند سی بہو بیاہ کر لائے گا، اس کے گھر بچے ہوں گے۔ دھوپ میں بیٹھ کر میں انھیں کھلایا کروں گی، گھر کا سارا کام کاج خود کروں گی، بہو رانی کو کچھ نہیں کرنے دوں گی جب تک جیوں گی، رام جی اور اس کی بہو کو کوئی کشٹ نہیں ہونے دوں گی، انھیں خیالات میں اٹھارہ برس بیت گئے۔

رام جی اب جوان تھا، خوبصورت تھا، محنتی، ہنس مکھ، شرمیلا جس کسی سے ملتا آنکھ نیچی کر لیتا، اس کی منگنی ہو چکی تھی، گوری گاؤں کے سنار کی لڑکی تھی، دونوں کی چاند سورج کی جوڑی تھی، شادی کی تاریخ کے لئے بات چیت ہو رہی تھی اور اب یہ حادثہ! سارا بنا بنایا گھروندہ خاک میں مل گیا۔ انسان کی ہستی بھی کیا ہستی ہے، ساری عمر کا کمایا ہوا ایک جھونکے، آگ کی ایک چنگاری، پانی کے ایک ریلے سے تباہ ہو جاتا ہے۔

(۳)

رام جی نے منہ پر کپڑا ڈالا، پہلے اپنے گھر سے بھیک مانگی، جب اس کی ماں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی جھولی میں آٹا ڈالا تو دونوں کی چیخیں نکل گئیں جب وہ گوری کے گھر گیا تو ہاتھ اس کی جھولی کی طرف بڑھ رہا تھا اور آنکھیں اسے ایک سندیسہ دے رہی تھیں، پریم کا سندیسہ، امید اور صبر کا پیغام، راجی نے خیال کیا، اگر میں ان آنکھوں کی زبان ٹھیک سمجھ رہا ہوں، تو میں اب بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔

(۴)

گوری روزانہ راجی کی بوڑھی ماں کے پاس آ بیٹھتی، وہ راجی کے بچپن کی باتیں کرتی، تو گوری اسے بتاتی کہ کیسے رام جی اسے تنگ کیا کرتا تھا، اس کی گڑیا کے کپڑے پھاڑ دیتا اور اس کے گھروندے توڑ دیا کرتا تھا، دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں راجی کا کوئی خط نہ آیا کہ کیسا ہے اور کہاں ہے، رام جانے پردیس میں اس پر کیا بیتی۔

(۵)

گوری اب پندرہ برس کی تھی، گاؤں کی لڑکیاں پندرہ برس کی عمر میں کافی جوان ہو جاتی ہیں، کھلی ہوا میں رہنا، گھر گرہستی کا سارا کام کاج کرنا۔ پاکیزہ خیالات، سادہ زندگی انھیں تندرست اور حسین بنا دیتی ہے، اول اول گوری کے والدین کا خیال تھا کہ راجی سال بھر میں واپس لوٹ آئے گا اسی سے لڑکی کی شادی کردیں گے، لیکن اب اسے گئے سال سے اوپر ہو گیا تھا اور اس کی طرف سے دو انگل کاغذ کا پرزہ تک نہیں آیا تھا کہ اس کا کیا حال ہے کہاں ہے، کب واپس پہونچے گا وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے، لڑکی جوان تھی اور برادری میں بدنامی کا خطرہ تھا، انھوں نے ساتھ کے گاؤں میں ایک بر ڈھونڈ لیا اور شگن بھیج دیا، پندرہ دن میں برات آئے گی اور گوری ——— راجی کی منگیتر گوری ——— دوسرے کی بیاہتا ہو جائے گی۔

گوری حسب معمول آج بھی راجی کے گھر گئی، دیر تک دونوں میٹھی باتیں کرتی رہیں، موسم، کھیتی، پنڈت جی کی گائے، چودھری کی لڑکی کا گونا، دنیا بھر کے قصے ہوئے لیکن مطلب کی بات کسی کی زبان پر نہ آئی، گوری کی ہونے والی شادی کی خبر سب کو معلوم تھی، بڑھیا نے بھی سنا تھا وہ امید کر رہی تھی کہ گوری خود ذکر کرے گی گوری خاموش رہی کہ حیا مانع تھی، اسے خیال تھا کہ بڑھیا ذکر چھیڑے گی دونوں اپنی جگہ قائم رہیں، اور دل کی بات دل ہی میں رہی، آخر گوری گھر جانے کے لئے کھڑی ہوئی، اس نے پرنام کیا، وہ دروازے سے باہر نکلنے ہی کو تھی کہ بڑھیا نے کہا:۔

”میں کہوں! رام جی کا خط آیا ہے“

گوری ٹھٹک گئی اور واپس چلی آئی۔

”خط آیا ہے ۔۔ کب؟“

”آج صبح آیا“

”تو کیا لکھا ہے؟ کب آئیں گے؟“

”ہردوار میں ہے، لکھتا ہے پندرہ دن تک گھر پہونچوں گا، لیکن تمھیں اب کیا، آئے یا نہ آئے“

انسانی فطرت بڑی عفو پسند ہے لیکن کبھی کبھی اسے دوسروں کو دکھ دیکر بڑا مزہ آتا ہے، وہ چوکے دینے سے لطف لیتی ہے، بڑھیا کو آج تک یقین تھا کہ گوری میری بہو ہے، اس کے رام جی کی ہونے والی بیوی ہے، لیکن جس وقت سے اس نے سنا تھا کہ گوری کا رشتہ اور جگہ پختہ ہو گیا ہے اور پندرہ دن میں وہ کسی اور کے گھر کی زینت ہوگی، اس کے سینہ میں غصہ اور انتقام کی

آگ بھڑک رہی تھی، لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی، البتہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب گوری کی شکل نہیں دیکھوں گی لیکن جس وقت گوری اس کے گھر پہونچی تو پہلی نظر میں اسے معلوم ہو گیا کہ گوری بھی اس نئے رشتہ سے خوش نہیں وہ بھی اُداس اور غمگین ہے، عورت دوسری عورت کا راز جلد معلوم کر لیتی ہے وہ ایک نگاہ میں بھانپ جاتی ہے کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے جب بڑھیا نے گوری کو دیکھا تو اس کا دل نرم پڑ گیا، اسے گوری سے ہمدردی پیدا ہو گئی وہ چاہتی تھی گوری بات چھیڑے تو اس کا دل بڑھاؤں لیکن جب گوری آخر تک خاموش رہی تو اسے شک ہوا کہیں میری نگاہ نے دھوکا تو نہیں کھایا، گوری دل میں اس نئی جگہ پر خوش ہے، ہر روز رام جی کی باتیں کیا کرتی تھی آخر آج کیوں خاموش رہی ہے، ضرور اس کے دل میں چور ہے، یہی وجہ تھی کہ اس نے چلتے چلتے گوری کے دل میں چٹکی لی اور کہہ ہی دیا:

''تمھیں اب کیا، وہ آئے یا نہ آئے''

گوری کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، وہ ماں باپ کے سامنے فطری حیا کی وجہ سے آہ تک نہ کر سکتی تھی۔ وہ رام جی کی ماں کے پاس آئی تھی کہ یہاں اسے ہمدردی کی توقع تھی، خلاف امید اسے یہاں بھی طعنے سننا پڑے۔ اس کا دل بیٹھ گیا، آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی، جب تھوڑی دیر بعد رونے سے دل ہلکا ہوا، تو بولی:۔

''تو آپ کا خیال ہے کہ میں اس شادی سے خوش ہوں، کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں ماں باپ کے منھ پر کہہ دوں، میں اس جگہ شادی نہیں کروں گی، میری شادی ہو چکی ہے، ہندو عورت کی شادی ایک بار ہوتی ہے، میں نے جب سے ہوش سنبھالا اس دن سے اپنا پتی چن چکی ہوں، لیکن میں کروں ؟ ماں باپ کو کیسے کہوں ؟ اور اگر کہوں بھی تو کون سنیگا۔''

عورت اگر جھوٹ موٹ بھی رو دے تو پتھر سے پتھر دل موم ہو جاتا ہے، گوری کا رونا تو دل سے تھا اور دیکھنے والی ایک عورت تھی، بڑھیا کا دل پسیج گیا، اس نے گوری کو اپنی آغوش میں لے لیا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پیشانی چومی، ستم زدہ انسان دوسرے کی تکلیف کو اور زیادہ محسوس کرتا ہے، وہی بڑھیا جو تھوڑی دیر پہلے گوری کو طعنہ دینے میں خوشی محسوس کر رہی تھی اب اپنے فعل پر نادم تھی، اسے گوری کے آنسوؤں میں خلوص کی جھلک نظر آئی، اس نے گوری کے دل کی گہرائیوں میں رام جی کی مورتی دیکھی اسنے سوچا سچ تو کہتی ہے، ماں باپ سے کیسے کہدے میں شادی نہیں کرتی، ہندو گھرانے کی لڑکی، اور اپنی شادی کے متعلق کچھ کہے دھرتی نہ پھٹ جائے، آکاش نہ ٹوٹ پڑے۔

''ماں ! ہردوار کو گاڑی کس وقت جاتی ہے ؟''

''رات نو بجے ! لیکن تم کیوں پوچھتی ہو''

گوری نے کوئی جواب نہ دیا، اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

(۷)

گوری گھر پہونچی، دیر سے اس کی تلاش ہو رہی تھی، داخل ہوتے ہی اس کی ماں نے اسے بلایا، اور ڈانٹ کر کہا:۔

''دیکھو گوری ! اب گھر سے باہر نہ جایا کرو۔''

گوری ماں پر ایک نگاہ ڈال کر اندر چلی گئی، اس کی شادی پندرہ دن میں ہونے والی تھی، ابتدائی رسمیں شروع ہو گئی تھیں جن کے بعد لڑکی کا گھر سے نکلنا رواج کے خلاف ہے، گوری پر یہ پابندی بھی اسی وجہ سے تھی۔

اب گوری کے دن رات گھر کی چار دیواری میں گزرنے لگے، اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا، ہر وقت رام جی کی یاد ستاتی وہ سوچتی، وہ امید بھرے دل سے گھر لوٹ آئے گا وہ خیال کر رہا ہوگا، گوری میرے انتظار میں ہے، اس کے دل پر کیا گزرے گی جب اسے معلوم ہوگا کہ میں ایک اور کی ہو چکی ہوں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میں رام جی کی ہوں، کس کی طاقت ہے کہ مجھے اس سے جدا کر سکے، میں اس سے منھ نہیں موڑ سکتی، اسی خیال میں وقت گزرتا گیا اور آخر وہ دن بھی آ پہونچا جس کی اگلی صبح کو اس کی شادی تھی یہ فیصلہ کن دن تھا، اسے آج اپنی زندگی کے متعلق فیصلہ کر لینا چاہئے وہ سوچی جا کر ماں سے کہہ دوں، میں شادی نہیں کروں گی، میں دل میں دھارن کر چکی ہوں کہ رام جی میرا پتی ہے۔ ہندو عورت ایک پتی کرتی ہے، لیکن وہ ایسا کہنے کی جرأت اپنے آپ میں نہ پاتی تھی لیکن وہ اس بات پر بھی تلی ہوئی تھی کہ رام جی کو چھوڑ کر کسی اور سے کبھی شادی نہ کرے گی پھر خیال آیا خودکشی کر لوں، ساری کا پھندا گلے میں ڈال کر کھینچ لوں، کوئیں میں کود جاؤں، چاقو سے گلا کاٹ دوں، لیکن یہ ساری باتیں جسمانی درد و تکلیف سے خالی نہ تھیں، خیال آتے ہی اس کا دل کانپ اٹھتا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔

یکایک اس کے دل میں خیال آیا یہاں سے بھاگ چلوں وہ ہردوار میں ہیں، گاڑی کا وقت مجھے معلوم ہی ہے۔ نو بجے رات۔ بس سب کی آنکھ بچا کر یہاں سے نکل جاؤں اور ہردوار کے لئے ٹکٹ خرید لوں، جس وقت ہمیں کسی مصیبت سے بچاؤ کی کوئی ایسی صورت معلوم نہ ہو جو خطرہ سے بالکل خالی ہے تو جس طریقہ سے کم از کم خطرہ ہو ہم اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، جزئیات تک ہماری نگاہ نہیں جاتی۔

(۸)

گوری گاڑی میں بیٹھی تھی، وہ رام جی کے دھیان میں مگن تھی۔ اسے خیال تھا، اسٹیشن پر اترتے ہی وہ سیدھی اس کے پاس چلی جائے گی اور اسے سارا حال کہہ سنائے گی۔

لیکن جب وہ اگلی صبح کو ہردوار اسٹیشن پر اتری تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے یوں آنے میں سخت غلطی کی، بھلا اس اجنبی جگہ اور خلقت کے سمندر میں رام جی کو کہاں تلاش کرے وہ دوسرے لوگوں کے پیچھے پیچھے اسٹیشن کے باہر نکل آئی اور ایک طرف چل دی سارا دن چلتے چلتے تھک گئی اس نے گزشتہ رات سے کچھ نہیں کھایا تھا، دن بھر چلتی رہی تھی، اس لئے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن جب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی کھانے کی دوکان کی تلاش کرتی۔ دریا سامنے تھا وہ کنارے پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اب کہاں جاؤں۔

(۹)

ایک ٹیلے پر ایک نوجوان، مضبوط، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، داڑھی منڈی ہوئی۔ غریبانہ گرد آلود تہمد لباس پہنے بیٹھا ہے

اس کے چہرے سے صحت کے آثار نمایاں ہیں، آنکھوں میں ایک خاص چمک ہے - جس میں ولولہ و مسرت سے سوا تخیل کا پہلو ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے دنیا کے نشیب و فراز کا بہت کافی تجربہ حاصل کر لیا ہے - بعض اوقات مصائب ہمیں اتنی عقل و فراست کا مالک بنا دیتے ہیں، جو دوسری حالت میں عیش و عشرت کی ایک طویل زندگی میں بھی حاصل نہیں ہو سکتے یہ نوجوان رام جی تھا۔

وہ پنچایت کے حکم کی تعمیل میں سارے تیرتھوں پر گیا۔ اسے گھر سے نکلے اب ڈیڑھ برس ہونے کو آیا تھا اس نے پرانشچت کی ساری شرطیں پوری کر لی تھیں جہاں بھی وہ گیا گوری اس کے ساتھ تھی۔ مندروں میں، دریا کے کناروں پر، پہاڑوں کی کھوؤں میں گوری کی مورتی اس کے من کے مندر میں اس کے ساتھ ساتھ رہی، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے وہ اس مورتی کی پوجا کرتا رہا۔ اس ڈیڑھ برس میں اس پر بڑی بڑی کٹھن گھڑیاں آئیں - پردیس کا معاملہ اس پر اس کی ناتجربہ کاری، دکھ درد انسان کے ساتھ ہے - اجنبی جگہ میں کون کسی کو پوچھتا ہے - اور جن مقامات پر وہ تھا وہاں تو اور سے زیادہ ظلمت کا دور دورہ تھا - دوستوں سے زیادہ دشمن ملتے تھے کئی بار دامنِ صبر اس کے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گیا - ایک آدھ بار تو تنگ آ کے اس نے اپنی زندگی تک کو ختم کر لینے کا ارادہ بھی کیا - لیکن اس کے تصور میں تو وہ آخری نگاہ تھی جو چلتے وقت گوری نے اس پر ڈالی تھی - وہ امید اور حوصلہ سے بھری ہوئی نگاہ - اسی نگاہ کے سہارے وہ اتنے دن جیتا رہا تھا۔

وہ اس ٹیلے پر بیٹھا اپنی زندگی کے ماضی و مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا اس نے دیکھا دو چھوٹے چھوٹے بچے — ایک لڑکا ایک لڑکی — ریت میں کھیل رہے ہیں، وہ اپنے پاؤں کے گرد ریت جمع کر کے گھروندے بناتے ہیں۔ میرا گھر اچھا ہے۔ وہ کہتی ہے نہیں میرا اچھا ہے، دونوں جھگڑنے لگتے ہیں، آخر لڑکا اٹھتا ہے اور پاؤں کی ایک ٹھوکر سے اس کا بنا بنایا گھر گرا دیتا ہے۔ لڑکی رونے لگتی ہے۔ لڑکا فوراً اسے منانے لگ جاتا ہے تھوڑی دیر میں دونوں پہلے کی طرح ہنسی خوشی کھیلنے لگتے ہیں۔

آہ! کیا اچھے تھے وہ بچپن کے دن جب گوری اور میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

گھر کا صحن مرد اور عورتوں سے بھرا ہے، کچھ ادھیڑ اور بڑی بوڑھیاں گا رہی ہیں۔ کچھ جوان مست شباب دوشیزائیں اور مانگ بھری دلہنیں ایک دوسرے کو چھیڑ رہی ہیں، کوئی چہل کرتی ہے، کوئی دوسری کے چٹکی لیتی ہے۔ اتنے میں پنڈت جی آ جاتے ہیں دیجی کے ماتھے پر کیسر کا ٹیکا لگتا ہے۔ ہاتھوں میں مولی کا کنگنا باندھتے ہیں، منہ میں چھوہارا دیا جاتا ہے یہ رام جی کی منگنی کی رسم ادا ہو رہی ہے، گوری کا شگن آیا ہے۔

آہ! کیسے رنگین و دلکش وہ دن رات تھے، کیا کیا امیدیں تھیں جو میں مستقبل سے رکھتا تھا۔

ایک بچھڑا پڑا ہے بے حس و حرکت، خاموش لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ نہیں اٹھتا - مر گیا ہے، شام کو گھر میں پنچایت ہوتی ہے - مردوں کے سب کے چہرے سنجیدہ، آنکھیں ڈراؤنی، لب پر ہنسی چھوڑ مسکراہٹ تک کا نشان نہیں - کتنی مختلف ہے اگلی چپ چاپ منگنی والے دن کی چہل پہل سے - رام جی سامنے آتا ہے - سب مل کر فیصلہ کرتے ہیں کہ رام جی نے گئو ہتیا کی ہے اسے

پرانشچت کرنا پڑے گا۔

اُف کتنا سخت فیصلہ تھا ساری آرزوؤں پر اوس پڑ گئی - بستا گھر اجڑ گیا۔

ایک نوجوان گاؤں میں بھیک مانگ رہا ہے - ایک دروازے پر کھڑا ہے - ایک نوجوان لڑکی نکلتی ہے - دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں - دونوں آنکھوں آنکھوں میں ایک داستان سنا دیتے ہیں - لڑکی ایک نگاہ اس پر ڈالتی ہے - ایک طویل امید افزا نگاہ - جس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں -

آہ! وہ مدبھری آنکھیں -

ایک ایک کر کے یہ سارے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے گزر گئے، جیسے پردۂ تصویر پر ایک سین کے بعد دوسرا سین گزرتا ہے، لیکن یہ تو گزری ہوئی باتیں تھیں - اب آگے کیا کرنا چاہئے - جب تک وہ گھر سے دور تھا، اسے یقین تھا کہ گوری میرا انتظار کر رہی ہے، اس کے والدین میرے گھر پہنچنے تک اسے کسی اور جگہ نہیں بیاہیں گے - اس یقین نے اس کی زندگی میں دلچسپی کا سامان پیدا کئے رکھا - لیکن جوں جوں وہ گھر کے نزدیک آ رہا تھا یہ یقین کمزور ہو رہا تھا اسے ڈر تھا کہ گوری کی شادی کر دی گئی ہوگی - آخر انھیں کیا پڑی تھی کہ اتنی مدت تک لڑکی کو بٹھائے رکھتے اور اگر بفرضِ محال وہ اب تک کنواری بھی ہو تو کیا وہ اسے مجھ سے بیاہنے پر طیار ہو جائیں گے - میری کھیتی مالیہ کی عدم ادائگی کی وجہ سے ضبط ہو چکی ہوگی زمین میں کچھ بویا جائے یا نہ بویا جائے سرکار کا مالیہ ضرور ادا کرنا پڑتا ہے - میری غیر حاضری میں کس نے ادا کیا ہوگا - گوری کا باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک مفلس قلاش کے ہاتھ میں کیوں دینے لگا - اس کا دل ٹوٹ گیا - اس خیال نے اسے تھکا دیا - اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہیں زمین پر لیٹ گیا -

(۱۰)

جب اسے ہوش آیا تو سورج ڈوب چکا تھا، اندھیرا چاروں طرف چھایا جا رہا تھا - ہوا بند تھی -

وہ اٹھا - آج اس نے سندھیا نہیں کی تھی، اس نے سندھیا سے پہلے اشنان کرنے کا فیصلہ کیا اور دریا کی طرف چل پڑا -

راستہ میں بہت کم لوگ اسے ملے - اکا دکا آدمی دریا سے واپس آتا ہوا ملا - "رام رام" "بھائی رام رام" کی آوازوں میں وہ دریا کی طرف بڑھتا گیا - وہ دریا کے اوپر کی طرف چلا گیا - تاکہ اطمینان سے غسل کر سکے - آخر وہ ایک جگہ رک گیا - ابھی اس نے کپڑے نہیں اتارے تھے کہ اسے ایک تیز سی آواز سنائی دی، اس کے کان کھڑے ہو گئے، چند لمحے بعد دوسری چیخ کی آواز آئی، پہلی سے زیادہ دلدوز اور دردناک، وہ آواز کی سمت بھاگا، تھوڑی دور جانے پر اس نے ایک عجیب نظارہ دیکھا، ایک نوجوان لڑکی چند بدمعاشوں کے درمیان کھڑی ہے، کوئی اس کی ساری کھینچتا ہے، کوئی مذاق کرتا ہے، کوئی مسکراتا ہے، لیکن جب اس نے روتی ہوئی لڑکی کا چہرہ دیکھا تو اس نے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کیا، گوری اور یہاں ہر دوار میں بالکل اکیلی آخر یہ کیا ماجرا ہے -

(۱۱)

گوری وہیں کنارے پر بیٹھی بیٹھی غش کھا گئی، یوں تو کتنے ہی دن سے اس کا دماغ طرح طرح کے خیالات کے طوفان کی

جولانگاہ بنا ہوا تھا، لیکن گزشتہ چوبیس گھنٹے کے واقعات نے اس سے سوچنے کی قوت بالکل سلب کر لی تھی اب وہ اس جسمانی اور ذہنی کوفت کا زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، خوش قسمتی سے بے ہوشی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ اپنی حالت کی نزاکت پر سوچنے اور خوف زدہ ہونے سے بچ گئی۔

جس وقت وہ اپنے آپے میں آئی اندھیرا ہو چکا تھا، اس نے آنکھ کھولی اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا جی چاہتا تھا بس یونہی پڑی رہے، مگر فوراً اسے احساس ہوا کہ میں اکیلی دریا کے کنارے پڑی ہوں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی آخر وہ اٹھی اور کسی محفوظ مقام پر پہونچنے کے لئے ایک طرف چل دی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں جیسے کوئی نشہ میں چلتا ہے۔

اسے اپنے گرد و پیش کا حال اس وقت معلوم ہوا جب اس نے تین چار مردوں کو اپنے بالکل قریب کھنکارتے اور ہنستے سنا، وہ ایک سنسان جگہ میں تھی اور یہ مرد اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے، اس کا دل کانپ اٹھا۔

بدمعاشوں نے اسے کنارے پر سے اٹھتے دیکھا تھا پہلے تو انھیں خیال ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد ہے لیکن جب تھوڑی دیر بعد انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اکیلی ہے تو ان کا حوصلہ بڑھا۔ تقریباً اسے ہر مقام پر اس قماش کے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی، وہ بھولے بھٹکے مسافروں اور عورتوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جہاں موقعہ پایا لوٹ لیا یا اٹھا کر لے گئے۔

وہ اس انتظار میں تھے کہ گوری کسی سنسان مقام پر پہونچ لے تو دست درازی کریں۔ اسی لئے وہ خاموش اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے، جونہی وہ آبادی سے دور نکل گئی۔ جہاں کسی کے پہونچنے کا احتمال کم تھا۔ انھوں نے بلند آواز سے باتیں کرنا شروع کیں، گوری نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔

(۱۲)

"ایں! گوری"

"کون؟ تم"

ایک لمحے میں دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں تھے، بدمعاشوں نے کھسکنے ہی میں عافیت دیکھی۔ جب دونوں سے حیرت کا غلبہ دور ہوا۔ تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"لیکن تمھیں گھر سے اکیلی نکلنے کی جرأت کیونکر ہوئی"

"تو کیا میں اپنا پتی برت دھرم بھنگ کر لیتی"۔

مالک رام ایم۔ اے، ایل ایل بی

چوری

پنڈت راما شنکر چوبے موضع دھرم پور میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اونچی ذات کے برہمن تھے اور مندر کے پجاری ہونے کے سبب مذہباً ان کا احترام ہر ہندو پر فرض تھا۔ بیچارے دیہاتی اس فرض کی ادائی میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے لیکن اگر کوئی سہواً مہاراج کے پاؤں پڑنا بھول جاتا تو مہاراج اس کو سخت تنبیہ فرماتے۔ مہاراج گاؤں میں زمینداری کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ مندر میں جتنی جائدادیں وقف تھیں ان پر وہ بلا شرکت غیرے متصرف تھے۔ جس وقت مہاراج گاڑھے کی مرزئی اوڑ گاڑھے کی دھوتی پہنکر گاؤں میں سے گزرتے ہوئے ندی پر اشنان کے لئے جاتے تو بستی میں ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پنڈت جی گاؤں میں سے گزریں اور راستہ میں کوئی اپنے دروازہ پر پلنگ بچھا کر بیٹھا رہے۔ بچے بچے آکر مہاراج کے گوڑ لاگتا، اور مہاراج سب کو آشیرباد دیتے ہوئے کھڑاؤں کھٹکھٹاتے ندی پر چلے جاتے، ندی میں جا کر اشنان کرتے وقت گھنٹوں سورج نرائن کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے اور ان کے نام پر جل چڑھاتے۔ وہاں سے واپس آکر مندر میں دیوی جی کی پوجا شروع کرتے گھنٹوں کی ٹن ٹن اور سنکھ کی آواز سنکر بستی کے لڑکوں کی ایک جماعت وہاں آجاتی اور مہاراج سب کو پرشادی دیتے۔

مہاراج سود کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ رام چرن حلوائی۔ سورج مل بزاز۔ رام ٹہلا پاسی سبھی ان کے مقروض تھے دیہات کا جاہل طبقہ روپیوں کے لین دین میں کسی باضابطہ کارروائی کا عادی نہ تھا۔ مہاراج کے پاس ایک بہی تھی جس میں وہ شرح سود کی جتنی مقدار چاہتے لکھ دیتے۔ لیکن واجب الادا رقم زبانی طے پاتی اور مہاراج اکثر اسی پر اکتفا بھی کرتے۔ بہی سے کام اس وقت لیا جاتا جب کسی شکار کو وہ تاکتے یا جب کسی بد نصیب سے وہ ناخوش ہو جاتے۔ کسی دیہاتی کی مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف چوں و چرا کرسکے۔ اس کی قسمت کا فیصلہ خود مہاراج کے رحم و کرم پر منحصر ہوتا۔ جس سے اور جب کبھی وہ چاہتے اپنا انتقام لیتے اور اس طرح لیتے کہ اس غریب کے پاس ایک ٹھیکرا تک باقی نہ رہتا۔

(۲)

دھرم پور گنگا کے کنارے بہت قدیم آبادی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب سرزمین ہند ترقی کے معراج کمال پر پہونچی ہوئی تھی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں رام نے جنم اور دنیا کو اخلاق و وفاداری کا سبق دے گئے، یہیں پیدا ہوئے اور دنیا کو محبت کا ایسا جام پلا گئے جس کی سرشاری قیامت تک فنا نہیں ہو سکتی۔ یہیں گوتم بدھ نے دنیا کی بے ثباتی پر مہر دوام ثبت کی اسی زمانہ کی یادگار دھرم پور بھی ہے۔ مشہور ہے کہ یہاں کے مندر میں اس کمان کا ایک ٹکڑا آج بھی محفوظ ہے جسے

تو ذکر رام جی، سیتا جی کو بیاہ لائے تھے۔

دھرم پور کی رونق بیشتر منحصر تھی انھیں قدیم روایات پر۔ سال کے مختلف حصوں میں جاتریوں کا گروہ یہاں پہونچتا اور دوکانداروں کو ان کی ذات سے آمدنی کا ایک ذریعہ ہاتھ آجاتا۔ یہاں کا بازار مختصر تھا۔ اس میں چند دوکانیں حلوائیوں کی تھیں۔ ایک دو دوکان کپڑے کی کچھ بنیے تھے اور ایک تمباکو کی دوکان۔

پھاگن کا مہینہ ہندوستان میں دیہاتیوں کے لئے اس درجہ روح افزا مہینہ ہے کہ اس کی دوسری مثال دنیا میں نظر نہیں آتی۔ ان کی معصوم مسرتیں حقیقتاً ایک ایسا جذبہ مسرور و بہیت اپنے اندر پنہاں رکھتی ہیں جو شہریوں کو بڑے سے بڑے جشن میں بھی میسر نہیں۔ سال کا یہ مہینہ وہ ایسی خود فراموشیوں میں بسر کردیتے ہیں جس کی شادمانیوں کو "سرمایۂ حیات" ہی کہہ کر ظاہر کرسکتے ہیں۔ ہر شخص عبیر اور گلال میں سر سے پاؤں تک لپٹا نظر آتا ہے۔ گاؤں کی معصوم عورتیں ایک دوسرے سے چہلیں کرتی گزر جاتی ہیں۔ بوڑی بوڑھی سے زندگی اور جوانی ٹپکتی ہے۔ راستہ میں اگر کوئی مرد مل جاتا تو اس کی دعوت بھی رنگ سے کی جاتی ہے۔ پنگھٹ پر غیر معمولی ہنگامہ ہوتا ہے ایک دوسرے کی پکڑ دھکڑ۔ رنگ وعبیر میں ایک دوسرے کو لت پت کردینا کچھ ایسے مناظر ہیں کہ چار طرف آگ لگا دیتے ہیں۔

ہولی ختم ہوچکی تھی لیکن ابھی چہروں سے اس کے نشانات محو نہیں ہوسکے تھے۔ دوسری صبح کارو حلوائی اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا ناریل پی رہا تھا اور بیچو کہار، رامو گلوار اور امرت گوالا ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے۔

بیچو :- (آستین سے انگلیاں مار کر چہرہ اُڑاتے ہوئے) بھائی کارو ہولی ختم ہوگئی۔ ہم لوگوں کی دلچسپی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ ایشور جانے پھر وہ دن دیکھنا نصیب ہو کہ نہیں۔

کارو :- (ناریل پر ایک نگاہ کر) ہاں بھائی! بات تو سچ ہے رام ہی جانے...... لیکن یار اب کے سمے بڑا جشن رہا۔

رامو :- (ٹھنڈی سانس لیکر) میں اب بوڑھا ہوا۔ پھر یہ تہوار کہاں اور میں کہاں۔ لیکن یار بیچو! سچ تو یہ ہے کہ اب کے کارو کی بدولت سب کچھ ہوا۔ سچ کہنا کارو یہ سب نئے نئے گانے تم نے کہاں سے سیکھے؟

کارو :- (اپنی سیاہ گڑ کی جلیبیوں سے مکھیاں اُڑاتے ہوئے) بیچو! یہ کیا کہتے ہو! تم سے زیادہ بوڑھے لوگ ابھی بیٹھے ہوئے ہیں---- گیت سیکھنے کہاں جاؤں گا خود ہی جوڑ جاڑ لیتا ہوں۔ سال بھر جب محنت کرتا ہوں تب کہیں جاکر دو چار گیت بنا پاتا ہوں۔ کیا بتاؤں مجھے ایشور کے بھجن میں کیسا مزہ آتا ہے۔ تم جانتے ہو رامو! پرہلاد جی اسی ایشور بھگتی کے بدولت انسان سے دیوتا بن گئے۔ انہی کی یاد میں ہم لوگ یہ ہولی کا تہوار مناتے ہیں۔

یہ لوگ باتوں میں مشغول تھے کہ مہاراج رما شنکر ندی سے اشنان کرکے اسی طرف آئے اور کارو حلوائی کی دوکان پر آکر کھڑے ہوگئے۔ مہاراج کی صورت دیکھ کر کارو جلدی سے ناریل علٰحدہ رکھ کر کھڑا ہوگیا اور ہاتھ جوڑ کر مہاراج کو "پاؤں لاگن" کیا۔ مہاراج نے آشیرباد دی۔

کارو :- (اسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے) کدھر کرپا کی مہاراج! کہئے کیا حکم ہے؟

مہاراج :- کارو تم تو جانتے ہو میں بے ضرورت تو کہیں جاتا نہیں۔ میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں یہ مکان کس کا ہے؟

کارو :- بجرنگ ساہوکار کا سرکار! جس کو مرے ہوئے دو برس ہوچکے۔

مہاراج :- ہاں مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ کب مرا۔ لیکن تم جانتے ہو یا نہیں یہ مکان وہ مندر میں وقف کرگیا ہے۔

کارو :- ہاں مہاراج! مجھے کیا سارے گاؤں کو معلوم ہے۔

مہاراج :- تو پھر تمھیں دو برس کا کرایہ ادا کرنا چاہئے۔

کارو :- لیکن سرکار! آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ یہ مکان وقف کرنے سے پہلے میں ٹھیکہ پر لے چکا تھا۔ میں نے اس کے بدلے پانچ سو روپے نقد دئے ہیں۔ یہی شرط تھی کہ جب تک سب روپے ادا نہ ہو جائیں مجھے کرایہ نہیں دینا پڑے گا۔

مہاراج :- میں شرط وغیرہ کچھ نہیں جانتا۔ مندر کی تمام چیزوں کی حفاظت مجھے کرنی ہے۔ میں تم سے کرایہ چاہتا ہوں۔

کارو :- اور میرے روپے کا کیا ہوگا سرکار!

مہاراج :- میں کیا جانوں۔ وقف کے کاغذ میں تو کہیں اس کا تذکرہ ہے نہیں۔

کارو :- سرکار! میرے پاس تو رجسٹری کا کاغذ موجود ہے۔ مہاراج! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ میری عمر بھر کی کمائی وہی پانچسو روپے تھے میرے بال بچے بھوکوں مرجائیں گے۔ میں کرایہ کہاں سے ادا کرسکتا ہوں۔

پنڈت رما شنکر کی مغرور طبیعت کب گوارا کرسکتی تھی کہ ایک غریب حلوائی ان کے ظلم کا تذکرہ زبان پر لائے۔ شعلے کی طرح بھڑک اُٹھے۔ غصے سے آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ کڑک کر بولے :- "کارو اب تیری یہ مجال ہوگئی کہ ایک برہمن کو ظالم کہے۔ تیری گستاخی کا مزہ تجھے معلوم ہوگا"

کارو :- ایشور مجھے ناس کریں اگر دل میں گستاخی کا خیال بھی گزرا ہو (پاؤں پر گر کر) مہاراج! صرف روپیوں کا عذر ہے۔ اگر آج سرکار کی طرف سے مل جائے تو کرایہ دینے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔

"اچھا دیکھا جائے گا" کہکر مہاراج رخصت ہوئے۔

کارو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مہاراج کے غصہ کا انجام کیا ہوگا۔ تمام عمر میں کسی طرح خون کو پانی کرکر کے فاقے کرکر کے سختیاں سہہ سہہ کے اس نے اتنی رقم جمع کی تھی تب کہیں جاکر اسے کرایہ سے نجات ملی تھی اور اب اس قابل ہوا تھا کہ روکھا سوکھا دونوں وقت کھا سکے۔ یکایک اپنی پوری دولت کو، زندگی بھر کی کمائی کو اس طرح برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر اسے خفقان ہونے لگا۔ اور اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو شاید رو پیٹ کر صبر کرلیتا مگر سب سے زیادہ جو چیز اسے خوفزدہ کررہی تھی وہ یہ تھی کہ اب اس کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ ایک غریب کو، ایک مزدور کو، ایک فاقہ کش، ایک مصیبت زدہ انسان کو اس دنیا میں اتنا حق بھی نہیں پہونچتا کہ وہ اپنے جائز حق کے چھینے جانے پر زبان بھی ہلا سکے۔ شوخی نہیں، گستاخی نہیں، مقابلہ نہیں، محض

انتہا وہ بھی رحم وکرم کی لطف وعنایت کی، ایک صدائے احتجاج وہ بھی ظلم وتعدی کے خلاف، لوٹ مار کے خلاف، اپنے حق کے غصب کئے جانے کے خلاف۔ فطرت کا قانون امیر غریب سب کے لئے ایک ہے۔ سب کو ایک طرح ننگا اور تہی دست پیدا کرتی اور ایک ہی طرح خاک میں ملاکر رکھدیتی ہے۔ پھر انسان کی یہ جھوٹی آشنامیاں کس غرور پر؟ کیا صرف اس لئے کہ ایک کا باپ مرنے کے بعد زر وسیم کا کچھ انبار چھوڑ گیا اور دوسرے کو چاندی کے چھچے سے دودھ پینا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن دنیا ان کی طرف کیوں توجہ کرے اسے غریبوں سے کیا توقع ہوسکتی ہے۔ اگر انسان ہونے کی حیثیت سے، اقتضاء قدرت کے لحاظ سے، غریبوں کے جذبات واحساسات کا بھی خیال کیا جائے تو سرمایہ داروں کی غلامی کون کرے۔ ان کے حرص وآز کے آدم خور عفریت کسے اپنی غذا بنائیں۔ ان کے یہ فلک بوس محلوں کی تعمیر کیونکر ممکن ہو جب تک غریبوں کی ہڈیوں کے چونے ان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے میسر نہ آسکیں۔ غریب کی بے دست وپائی۔ مجبوری وبیچارگی کچھ ایسی چیزیں نہ تھیں جن کی بناء پر اسے انسانیت کے تمام حقوق سے محروم کردیا جاتا۔ لیکن شیطنت خود غرضی اور نفس پرستی ایک طبقہ میں فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ایسی صورت میں تو شاید قدرت کے زبردست ہاتھ بھی غربا کی دستگیری میں بیکار ثابت ہوں۔

کارو اپنی اس نئی مصیبت پر غور کرتا ہوا گھنٹوں دوکان پر خاموش وساکت بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس کے ساتھ یہ الفاظ اس کی زبان سے نکل جاتے کہ ایشور یہ میرے کس پاپ کی سزا ہے۔ کیا زندگی بھر کے لئے کشٹ بھوگنا ہی قسمت میں لکھا ہو۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوجاتا کہ کیا پاپ ہے تو اس کی پرائشچت کرتا۔ پھر جب اس کا جی کسی طرح نہ لگا تو دوکان بند کرکے گھر چلا گیا۔ بیوی جسے وہ پیار سے پرگتی کہا کرتا تھا اس کی بے وقت آمد سے متعجب ہوئی اور چہرہ پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر اس کا رنگ بھی فق ہوگیا۔ اس کی لڑکی کیسری محلہ سے آگ لیکر واپس آئی، باپ کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوکر پوچھنے لگی:-

"کیوں پتاجی آج اتنے سویرے کیوں آگئے۔ بہت سست بھی معلوم ہوتے ہیں، کیا بات ہے؟"

لڑکی کے سوال پر کارو کی حالت اور زیادہ المناک ہوگئی...... زخم کو نشتر سے چھیڑ دیا گیا تھا، آبلہ کو ٹھیس لگ گئی تھی، دل ودماغ جل رہے تھے...... آنکھوں نے اس آگ پر پانی ڈالنا چاہا کامیابی ہوئی لیکن بہت دیر کے بعد۔ بیوی اور بیٹی کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آتا تھا۔ وہ بھی کھڑی رو رہی تھیں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ بالآخر کارو کو جب سکون ہوا تو......؟ سب کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

کارو:- پرگتی! اب تو مجھے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ گھربار چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔

پرگتی:- آخر جائیں کہاں، اپنا پرایا کوئی بھی تو نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک برہمن کا سراپ ہمیں کہیں نہیں چھوڑیگا

کارو سراپ کے نام سے تھرا گیا۔ ہاتھ پاؤں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد سنبھلا اور بولا:- "نہیں پرگتی! میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ ایشور پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ ایسے سراپوں سے کیا ہوتا اور پھر مہاراج ہمیں کیوں سراپ دینے لگے ان کی مرضی کے مطابق تو گھر چھوڑ بھی دوں گا۔

پرگتی:- پھر یہیں کیوں نہ رہیں۔ یہاں جنم بھومی ہے۔ پرائی جگہ میں ہم ایسے غریبوں کو کون پوچھے گا؟

کارو:- یہاں رہنے کی کیا صورت ہے سوال صرف روپے کا نہیں جو میں نے بجرنگ ساہو کو مکان کے لئے دیا تھا۔ یہاں تو مجھ سے میری زندگی چھینی جارہی ہے، میری شرافت، میری عزت سب کچھ خطرہ میں ہے۔ اگر محض دوکان سے علٰحدہ ہوجاؤں تو دو برس کا کرایہ کہاں سے ادا کروں اور نہ دینے کی صورت میں معلوم نہیں کیا کیا سزا بھگتنی پڑے۔

پرگتی:- نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود جاکر مہاراج سے کہوں گی گڑگڑاؤں گی، معافی مانگوں گی۔ آخر انسان ہیں رحم کریں گے۔

(۳)

شام ہونے کو ہے آسمان پر رنگ ونور کے امتزاج کی وہ کیفیت نمایاں ہے گویا فطرت اہل دنیا کو مسرت وشادکامی کی دعوت دے رہی ہے۔ آفتاب نے کائنات پر سونے کی بارش کررکھی ہے۔ شاید اسے بھی معلوم ہے کہ دنیا میں صرف زر وسیم کے انبار ہی سے مسرت حاصل ہوسکتی ہے۔

رات ابھی شروع ہوئی ہے۔ مہاراج راماشنکر ابھی ابھی سندھیا ختم کرکے بیٹھے ہیں کہ لالہ سورج مل آئے اور پرنام کرکے بیٹھ گئے مہاراج نے انھیں اپنے پاس کمبل پر جگہ دی۔

لالہ سورج مل دھرم پور کے سب سے بڑے دوکاندار تھے۔ لیکن اقتصادی اعتبار سے ان کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ ہمیشہ مہاراج راماشنکر کے قرضدار ہی رہتے اور یہی سبب تھا کہ وہ مہاراج کے سب سے بڑے آلۂ کار تھے۔ لالہ جی کی بزازے کی دوکان تھی جو کارو حلوائی کی دوکان کے برابر واقع تھی۔

مہاراج:- لالہ جی افسوس ہے آپ نے اب تک کچھ نہیں کیا....... اتنی مدت گزر گئی۔

لالہ جی:- کیسی باتیں ہیں مہاراج! آپ کا حکم اور میں پورا نہ کروں۔ سارا انتظام ٹھیک ہوگیا ہے۔ اتنی دیر تو قصداً کی گئی ایسا نہ ہو لوگوں کو بدگمانی پیدا ہوجائے۔

مہاراج:- آپ بھی بڑے بزدل ہیں۔ شہر سے نامارواڑی۔ کوئی بدگمانی کرکے میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ مجھے ان باتوں کی کب پروا ہوئی ہے، اچھا خیر، مگر اب دیر نہ ہونا چاہئے۔

لالہ جی:- ایشور نے چاہا تو کل ہی مہاراج!

گفتگو یہاں تک پہونچی تھی کہ ایک عورت میلی ساڑھی پہنے آئی اور دروازہ کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

مہاراج:- بندھو! ارے بندھو! دیکھ تو کون آیا ہے؟

بندھو:- سرکار، کارو حلوائی کی جنانہ (بیوی) ہے۔

مہاراج:- پوچھ، اس وقت کہاں آئی ہے؟

ابھی بندھو نے کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ پرگتی مہاراج کے چرنوں پر گر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔ آنسو جاری تھے، ہچکیوں سے

وہ اچھی طرح بولنے پر قادر بھی نہ تھی۔

پربھی :۔ مہاراج ...... دیا کیجئے ...... آپ بر... ہمن ...... ہیں اور ...... وہ آپ کے ...... داس - ان سے ...

باپ مہاراج ...... اُن کو ...... کشٹ سے بچا لیجئے۔

مہاراج :۔ میں نے کیا کیا ہے؟ میں تم سے مندر کا حق مانگتا ہوں اور جب تک یہ نہیں ملیگا نہ باقی معافی مانگنے سے کیا کام چل سکتا ہے۔ دیوی جی کی چیز میں کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ لالہ سورج مل! تم ہی انصاف کرو میں کیا غلط کہتا ہوں!

لالہ جی :۔ بہت صحیح ہے مہاراج۔

پربھی :۔ لیکن مہاراج ...... میں اس سے انکار تو نہیں کرتی۔ ٹھیکے کے روپئے بھی تو واجب ہیں۔ اور اگر ہم لوگ اس سے محروم کر دئے گئے تو پھر کہاں نے کا ٹھکانا ہی ہم لوگوں کے لئے باقی نہ رہے گا۔

مہاراج :۔ آج پھر کرٹ مرد سے الگ ... آئی ہے۔ مرد اپنا کیا تو عورت بحث کرنے آئی ہے۔ میں فضول بکواس نہیں سننا چاہتا۔ تم لوگ دیوی جی کا حق ہضم کرنا چاہتے ہو۔ مجھے اس سے کیا وہ خود تم سے وصول کر لیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ (غضب) تم لوگوں کو خاک کر دے۔

پربھی :۔ مہاراج سر اپنے نہیں۔ میں آپ سے دیا کی التجا کرنے آئی ہوں۔ غریب ہوں زندگی کا بردان مانگتی ہوں۔ عزت و آبرو کی بھیک مانگتی ہوں۔ کرپا کیجئے مہاراج! میں سب کچھ کروں گی جو آپ کی آگیا ہوگی لیکن اتنی پر اتنا ستم نہ کیجئے۔ غریب ہوں بھوکوں مر جاؤں گی۔ مکان چھوڑنے کو تیار ہوں لیکن سر اپنے نہیں۔

مہاراج :۔ مکان چھوڑ دوگی اور کرایہ کون ادا کرے گا۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔

پربھی :۔ پیسہ پیسہ کو تو محتاج ہوں کرایہ کی رقم کہاں سے دے سکتی ہوں۔ آتی دیا کیجئے مہاراج!

مہاراج :۔ بس میں فضول بکنا نہیں چاہتا۔ مجھے پاٹھ کرنے دو میں کب تک تمہارے ساتھ سر کھپاتا رہوں گا۔

آخرکار پربھی اداس ہوکر مکان لوٹ آئی۔

(۴)

صبح کا وقت ہے آفتاب نکل آیا ہے۔ بازار کی دوکانیں کھلنی شروع ہو گئی ہیں لالہ سورج مل اپنی دوکان میں داخل ہوئے اور یکبارگی چیخ پکار شروع کر دی۔ دوکان میں نقب زنی ہو گئی تھی دوکان کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو سو روپئے نقد اور کچھ کپڑے چور اٹھا لے گئے۔ چور دوکان میں پشت کی دیوار کاٹ کر داخل ہوئے تھے۔ دوکان کے سامان کے بعد ایک کوٹھری تھی جو گودام کا کام دیتی تھی۔ دوکان کی پشت پر کھنڈر زمین تھی۔ چوروں نے اسی طرف سے کوٹھری کی دیوار کاٹ دی تھی۔ ہنگامہ سن کر گاؤں کے لوگ ٹوٹ پڑے مشورہ کے بعد پولیس کی چوکی میں خبر دی گئی۔ تھوڑی دیر میں پولیس سب انسپکٹر دو کانسٹبل کو لیکر موقعہ پر آ گئے۔ تحقیقات شروع ہو گئی۔ لالہ سورج مل نے بتایا کہ کارو حلوائی کی دوکان پر گاؤں کے چند بدمعاش جمع ہوکر گپیں لڑایا کرتے ہیں، ممکن ہے یہ انہی لوگوں کا فعل ہو۔ پولیس کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ ادھر ادھر تلاشیاں ہونے لگیں۔ کارو حلوائی کا مکان بھی اس

زد میں آ گیا۔ تلاشی لینے پر ایک صندوقچہ ٹوٹا ہوا اس کے کھنڈر میں پایا گیا جسے سورج مل نے پہچانا کہ یہ وہی صندوقچہ ہے جس میں روپے رکھے گئے تھے۔ گھر کا ایک ایک کونہ چھان ڈالا گیا لیکن کوئی دوسری شے برآمد نہ ہو سکی ہاں ایک جوڑ چاندی کے کنگن ملے جسے سورج مل نے کہا کل ہی کلدیپ سنگھ نے اس کے یہاں رہن رکھے تھے اور یہ بھی اسی بکس میں پڑے ہوئے تھے۔ کارو کا بیان تھا کہ کئی برس ہوئے یہ کنگن اس کی پربھی کو اس کے ماں باپ نے دئے تھے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت وہ پیش نہیں کر سکتا تھا۔ کارو کی سسرال میں اب کوئی نہ تھا سب مر چکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں بنے اور کس وزن کے تھے۔ کپڑے اور روپیوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ سب انسپکٹر نے دونوں کے بیانات قلمبند کئے۔ کارو مجرم تھا۔ پولیس نے حراست میں لے لیا۔

کارو کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ دیوانوں کی طرح سب کا منہ تک رہا تھا۔ آنسو خشک تھے اور اب اس میں یہ بھی صلاحیت نہ تھی کہ اپنی برأت میں ایک لفظ بھی کہہ سکے۔ پربھی اور کیسری پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ سب انسپکٹر کے سامنے ہزاروں منتیں کیں، خوشامد کی لیکن قانونی شکنجے سے کسی طرح نجات ممکن نہ ہو سکی گاؤں کے تمام لوگ کارو کی ایمانداری سے واقف تھے۔ وہ حیرت میں تھے کہ کیا ایک کارو پر شیطان کیونکر سوار ہو گیا۔ یقین کرنے کو ان کا جی ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ حرکت کارو کی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ دیکھ رہے تھے بکس کارو کے مکان سے نکلا تھا۔ آنکھوں کو کس طرح جھٹلا دیتے۔ جرم ثابت ہو چکا تھا اور کارو سب کی نظروں میں ذلیل ہوکر رہ گیا تھا۔

تھانہ پہونچکر ضروری کاغذات مرتب ہوئے تھانیدار نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کوئی ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ امرت گرنے نے اس کی ضمانت دی اور رہائی دلا کر مکان واپس لے آیا۔

شام کے وقت رامو کا نمرو، بیجو کمہار اور امرت سب کارو کے مکان پر جمع ہوئے۔ امرت نے کہا:۔ "کارو زیادہ فکر نہ کرو۔ اس کا فایدہ کچھ نہیں۔ تمہاری بے گناہی کا ہم سب کو یقین ہے۔ لیکن یہ ہوا کیونکر؟ لالہ سورج مل سے تم سے کہاں کا بیر تھا کہ اس کا بدلہ لیا۔

کارو :۔ کیا کہوں اپنی قسمت کے سوا کس کو دوش دے سکتا ہوں۔ یہ پہلے جنم کا پاپ ہے جس کے بدلے اس جنم میں نرکھ میں جل رہا ہوں۔

بیجو :۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کرودھی نے تم پر یہ جال بچھایا ہے۔

کارو :۔ میرا اس گاؤں میں کوئی دشمن نہیں پھر کس کو الزام دوں؟

رامو :۔ یار ایسے جو کچھ کہو۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے۔ بیجو ذرا ادھر ادھر دیکھ لو کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس روز جو مہاراج داشنکر سے تم سے باتیں ہوئی تھیں اس پر وہ بے طرح بگڑ گئے تھے۔ میں اسی روز ڈر گیا تھا کہ کہیں تم سے وہ بدلہ نہ لیں۔ وہ ہمیشہ اپنے دشمن کو اسی طرح تباہ کراتے ہیں۔ دیکھا نہیں ہزارا تھا لال کا گھر تک بکوا دیا۔ گوپی چمار کو کس طرح جوتا بیچارے ہرتھ کو گھر سے چھوڑ دینا پڑا اب وہ کوکر داس پور میں رہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی کارو کا چہرہ زرد ہو گیا اور گہرے سوچ میں پڑ گیا

پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا:-

کارو:- برہمن اور استا کر دھتی۔ کل پرتیجی وہاں گئی تھی۔ اچھا یاد آیا اس نے آکر کہا تھا کہ لالہ سورج مل اور مہاراج آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اب تو مجھے بھی شبہ ہوتا ہے۔ لیکن رامو! میرے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے۔ میری مٹی تو پلید ہو چکی۔ میں منھ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔

(۵)

کارو نے چوری کی تھی یہ صرف قانونی جرم نہ تھا۔ سماجی جرم بھی تھا۔ پنچ کے سامنے اسے جواب دینا تھا، اور اگر اس کا عذر قبول نہ ہوا تو پھر اپنی ذات والوں کے سامنے بھی اسے سزا بھگتنی پڑے گی۔

رام چرن حلوائی نے ساری باتیں پنچ کے سردار سے جا لگائیں اور مقررہ تاریخ میں سب کے سب جمع ہو گئے۔

انسان کی فطرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس میں انتہائی لچک کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ عاجز و بیکس انسان مصائب برداشت کرتا ہے، تکلیفیں اُٹھاتا ہے اور اپنی بیچارگی پر روتا ہے۔ یہی مصائب یہی اذیتیں جب حد سے گزر جاتی ہیں تو اس میں بغاوت اور سرکشی کا جذبہ رونما ہوتا ہے۔ پھر اس کی شدت اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مخالف قوت کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ فطرت اور خدا سے بھی برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ کارو عاجز تھا، بیکس تھا، غریب تھا اور مصائب کا شکار۔ لیکن راماشنکر اور لالہ سورج مل نے اسے انتہائی ذلت و رسوائی میں مبتلا کر دیا تھا، اب زیادہ برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ پوری قوت سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ دولت تو خیر تھی ہی نہیں، عزت و آبرو جو بچ رہی تھی اسے بھی لوٹا جا رہا تھا۔ پھر وہ کس لئے ان کی پروا کرتا۔ پنچ کے سامنے جو اس نے بیان دیا وہ گاؤں والوں کے لئے جس درجہ بھی تعجب خیز ہو۔ لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ حریف سے اب پوری طرح جنگ کے لئے آمادہ تھا۔ اس نے کہا:- "مجھے سزا بھگتنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن میں ایشور کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ یہ سب میرے دشمن کی کارروائی ہے۔ میں نے مہاراج سے روپیوں کا عذر کیا تھا۔ انھیں یہ گوارا نہ ہوا۔ اس پر بھی مکان چھوڑنے کو تیار تھا۔ لیکن وہ مجھ سے دو برس کا کرایہ بھی طلب کرتے ہیں۔ آپ لوگ انصاف کیجئے ایک محتاج جو کھانے کو ترستا ہو، اتنی رقم کہاں سے دے سکتا ہے۔ انھوں نے لالہ جی سے کہکر یہ انتظام کرایا اور مجھے دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے چھوڑا۔ ایشور ان کا بھلا کرے" یہ کہتے کہتے کارو رونے لگا۔ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "آپ لوگ جھوٹ سمجھیں گے لیکن ایشور جانتا ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ کل بھی میرے پاس آئے اور کہہ رہے تھے کہ اب بھی بچنا چاہتے ہو تو کرایہ کی رقم ادا کر دو۔ میں کہاں سے دے سکتا ہوں۔ میں نے جا کر کہہ دیا اب دوسرے جنم میں لیجئے گا۔ مہاراج! اب میں حاضر ہوں آپ لوگ جو سزا چاہے دیجئے۔" پنچوں نے کارو کا بیان سنا۔ ہر شخص متاثر ہوا۔ رام چرن حلوائی نے کہا "ان فضول باتوں سے کیا حاصل ہے۔ جرم ثابت ہے اس کی سزا کارو کو بھگتنی پڑے گی۔" پنچ کے سردار نے کہا:- "ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ کارو نے سچ مچ جرم کیا ہے۔ ممکن ہے حقیقتاً بے قصور ہو۔ سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم لوگ کارو کے مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار کریں اس کے بعد ہم لوگ صحیح نتیجہ پر پہونچ سکیں گے۔" یہ بات سب لوگوں کو پسند آئی اور پنچ کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا۔

(۶)

مقدمہ کے دوران میں غریب کارو کو کئی بار کچہری دوڑنا پڑا۔ اس کے پاس روپے نہ تھے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل کرتا۔ پرتیجی کے پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے زیور تھے انھیں فروخت کر دیا اور بابو کرشنا پرشاد وکیل کی خدمات حاضر ہو کر اپنے دکھ کی ساری داستان سنائی۔ انھیں کچھ ترس آ گیا اور بہت تھوڑی فیس لیکر کام کرنے کو راضی ہو گئے ـــ دوران مقدمہ میں سورج مل بھی طلب کیا گیا اور جب کئی دوسرے کنگنوں کے ساتھ ملا کر مسروقہ کنگن رکھ دئے گئے اور اس سے شناخت کے لئے کہا گیا تو وہ بالکل ناکام رہا۔ وہ صحیح وزن بھی نہ بتا سکا۔ بابو کرشنا پرشاد نے جرح میں وہ داستان بھی چھیڑ دی کہ کس طرح پنڈت راماشنکر زبردستی کارو کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور دو برس کا کرایہ بھی وصول کرنا چاہتے ہیں۔ لالہ سورج مل سے یہ بھی اقرار کرا لیا کہ پنڈت راماشنکر سے برابر روپیوں کا لین دین اور دوستانہ ہے۔ تمام کارروائی سازشی قرار دی۔ لیکن قانونی ثبوت نہ ہونے کے سبب سے پنڈت راماشنکر پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ پھر بھی انھیں تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر وہ کسی قسم کی سختی مکان کے متعلق کارو پر کریں گے تو سخت سزا کے مستوجب قرار دئے جائیں گے۔ ساتھ ہی کارو حلوائی کو لالہ سورج مل کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ چلانے کا حکم دیا گیا۔

فیصلہ کی خبر بجلی کی طرح گاؤں میں پہونچ گئی اور ساری بستی میں پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص کو اس مقدمہ سے خاص تعلق تھا۔ ہر گھر میں خوشی پھیل گئی۔ لیکن پنڈت راماشنکر اور لالہ جی کے لئے تو قیامت ہو گئی۔ بچہ بچہ کہہ رہا تھا کہ غریب کو ستایا گیا ـــ ایشور ان کے پاپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا ـــ کارو کے گھر میں عید ہو گئی۔ کیسری جلدی جلدی درگا استھان جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ آج وہاں گھی کے دئے جلائے گی اور مہاویر جی پر مٹھائی چڑھائے گی۔ اسی چہل پہل میں نصف شب گزر گئی۔ پرتیجی اور کیسری خوشی سے دیوانی ہو رہی تھیں۔ آج انھیں نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ دروازہ پر کسی کے پکارنے کی آواز آئی کارو اٹھ کر باہر گیا دیکھا تو مہاراج اور لالہ سورج مل کھڑے ہیں۔ مہاراج کہنے لگے "کارو! دیکھو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہم لوگوں کو آخر اسی بستی میں رہنا ہے۔ لالہ جی تم سے کشما مانگنے آئے ہیں تمہارے نقصان کے عوض یہ دو سو روپے دیتے ہیں۔ اسے قبول کرو اور اب مقدمہ چلانے سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔ انھیں معاف کر دو۔"

مصیبت زدہ دل دوسروں کی تکلیفیں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا قلب دوسروں کی اذیتیں دیکھ کر کڑھتا ہے اور اپنی مصیبت کا نقشہ اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ کارو کا دل بہت زیادہ دردمند واقع ہوا تھا۔ اسے اپنے آلام یاد آ گئے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ کہنے لگا:-

"مہاراج! آپ کس سے کہہ رہے ہیں۔ اپنے ایک داس سے، برہمنوں کے سیوک سے، میری نظر میں آپ کی وہی عزت ہے۔ مجھے کب گوارا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ایک بھائی کو دکھ پہونچاؤں۔ مجھے روپیوں کی ضرورت نہیں۔ ہرگز آپ کے حکم کے خلاف نہ کروں گا۔"

الیاس اسلام پوری

بنارس کی بیوہ

تجرد کی زندگی پر امن ہو تو ہو لیکن پُر کیف کبھی نہیں ہوتی۔ ابتدا میں بیوی بچوں کا جنجال بُرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں یہی چیزیں سرمایۂ نشاط بن جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی انسان اپنے آپ کو ہر سمت سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ اُس کی آزادیاں اُس سے چھین لی جاتی ہیں۔ اُس کے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ اُس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ تمام تکلیفیں اپنے اندر ایک خاص لذت بھی رکھتی ہیں اور سچ پوچھئے تو زندگی نام ہی "کشمکشِ حیات" کا ہے اگر یہ نہ ہو تو زندگی، زندگی نہیں، موت ہے۔ تجرد کی زندگی بسر کرنے والے دوسروں کی نظر میں خواہ کتنے ہی سرور و شاداں نظر آتے ہوں لیکن خود انھیں سے پوچھئے کہ اُن کی زندگی کتنی بے کیف بسر ہوتی ہے۔ شروع میں تجرد کی زندگی گزارنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو کم لیکن بعد میں اُن کی زندگی ایسی تلخ ہوجاتی ہے کہ وہ زندگی کے نام ہی سے گھبرانے لگتے ہیں۔ جمود و تعطل کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ امن و سکون جس کے حصول کے لئے خدا معلوم کتنی روحیں بے چین و مضطرب ہیں کیا اُن کا کوئی مفہوم بھی ہے؟ آفتاب کا طلوع و غروب کتنا پُر کیف ہوتا ہے۔ شب ماہ کی خنک راتیں کس قدر نشاط انگیز ہوتی ہیں۔ چڑیوں کا ترنم کس طرح روح کی گہرائیوں کو متاثر کرتا ہے۔ دریا کی روانی کیسی حیات پرور ہوتی ہے۔ لیکن فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ یہی چیزیں اگر دوامی شکل اختیار کرلیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو تو پھر ان میں کوئی کشش باقی نہ رہے۔ یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے۔ اسے امن و سکون کی دُنیا میسر آئے۔ دنیاوی کلفتوں سے اُسے دو چار نہ ہونا پڑے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض افراد تجرد کی زندگی کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن بہت جلد انھیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اُن کا فیصلہ قوانینِ قدرت کے خلاف ہے اور جس موہوم شئے کی انھیں تلاش و جستجو ہے، وہ چیز اُن سے بہت دور ہے۔

یہی چیز تھی جس نے بالآخر سرت چندر کو ازدواجی زندگی میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ تعلیمی مشاغل کے دوران ہی میں انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ تجرد کی زندگی گزاریں گے۔ اب انھیں ریلوے میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ پورے اطمینان اور کافی لطف کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ایسا شخص سوسائٹی میں بھی مقبول ہوتا ہے۔ دوستوں کی کمی نہ تھی۔ شام ہوئی۔ یہ دفتر سے لوٹے اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی۔ دس، ساڑھے دس بجے تک ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔ کیسا اطمینان کتنی فارغ البالی اور کس قدر امن و سکون کی زندگی تھی۔ پورے دس سال

اسی طرح گزر گئے۔ لیکن اب سرت چندر کے لئے اس زندگی میں کوئی لطف نہ تھا۔ وہی صبح، وہی شام، وہی دفتر، وہی دوستوں کا جمگھٹا، وہی بے سروپا باتیں، وہی بزمِ نشاط، وہی کیف و سرور۔ اُن کی زندگی تلخ تھی۔ دوستوں سے انھیں کلفت ہونے لگی۔ لوگ انھیں بداخلاق کہنے لگے۔ لیکن سرت چندر کی زندگی اب انقلابی صورت اختیار کر رہی تھی۔ فطرت سے جنگ اب اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اُن کا "آخری اور قطعی فیصلہ" اب متزلزل ہوچکا تھا۔ انھیں اب اس کا اچھی طرح احساس ہوگیا تھا کہ زندگی اُس وقت تک زندگی نہیں ہے جب تک انسان ازدواجی زندگی میں قدم نہ رکھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملازمت میں آنے کے کامل دس سال کے بعد انھوں نے بنگال کے ایک غیر معروف گاؤں میں اپنی شادی کرلی۔

(۲)

مالتی شکل و صورت کے لحاظ سے کوئی خوبصورت لڑکی تو نہ تھی۔ لیکن اُسے بدصورت بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اُس کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی۔ اُس کا رنگ سانولا نہیں بلکہ سیاہی مایل تھا۔ لیکن اُس کے چہرہ میں ایک کشش تھی، بلا کی کشش۔ وہ ایک پیکرِ معصوم تھی۔ دُنیا کی آلودگیوں سے یکسر بے خبر۔ اُس کے ذہن میں گناہ و معصیت کا کوئی تخیل بھی نہ تھا یہ ثمرہ تھا دیہات کی سادہ معاشرت کا۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اپنے شوہر کو خوش رکھے۔ اُس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھے سرت چندر کو اب معلوم ہوا کہ مالتی کی ایک محبت بھری نظر اُس کی گزشتہ زندگی کی تمام مسرتوں سے کہیں زیادہ پُر کیف ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی تھی وہ یہ کہ کامل دس سال کی مجرد زندگی نے سرت چندر کو بعض ایسی باتوں کا بھی عادی بنا دیا تھا کہ جن کا ترک کرنا اب محال نظر آتا تھا۔ اور یہ اُن کی زندگی کا ایک بہت ہی پُردرد افسانہ تھا۔ مالتی بھی اسے دیکھتی لیکن وہ غریب اس معاملہ میں بالکل بے بس تھی۔ سرت چندر کی تنخواہ کا ایک تہائی حصہ ہر روز ہمراہ کلکٹر کمپنی کے نذر ہوجایا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس کمزوری کو محسوس کرتے تھے انھیں اس کا بھی پورا احساس تھا کہ مالتی اُن کی اس روش کو پسند نہیں کرتی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ مالتی کو خوش رکھیں اور اُس کے جذبات کو پامال نہ ہونے دیں۔ لیکن شام کو جب تھکے ماندے وہ دفتر سے واپس ہوتے تو دن کا یہ تمام قول و قرار آیندہ کل کے لئے ملتوی ہوجاتا۔

۳

داناپور اسٹیشن کے بالکل ہی قریب سرت چندر نے ایک کرایہ کا مکان لے لیا تھا۔ مکان چھوٹا تھا لیکن پختہ اور صاف۔ کل دو آدمی تھے۔ ایک سرت چندر، دوسرے مالتی۔ یہ بڑی دقت تھی۔ سرت چندر باہر کے آدمی، تمام دن انھیں اپنے مال گودام سے کہاں فرصت تھی۔ مالتی کی تنہائی کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے ایک بڑھی ملازمہ کی خدمت حاصل کرلی تھی جسے ایک روپیہ زاید وہ صرف اس بات کے لئے دیتے تھے کہ وہ تمام دن گھر میں موجود رہے۔ مالتی کے لئے سوائے "بھجوا کی مائی" کے (وہ اسی نام سے پکاری جاتی تھی) کوئی دوسرا رفیق نہ تھا۔ "بھجوا کی مائی" بنگلہ زبان سے قطعی ناواقف تھی اور مالتی کو ہندوستانی زبان میں گفتگو کرنے کی بہت ہی کم مہارت تھی۔ اس لئے مالتی کے بھجوا کی مائی کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر

تھا۔ مالتی کے لئے تمام دن کی تنہائی ناقابل برداشت تھی۔

(۴)

جاڑے کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا۔ کوئی تین بجے ہوں گے۔ مالتی کمرہ میں بیٹھی بیٹھی اُکتا گئی تھی۔ وہ سائبان میں آئی۔ بجوا کی مائی اپنی عادت کے بموجب کمبل میں لپٹی خراٹے لے رہی تھی۔ مالتی نے آپ ہی آپ کہا۔ ”اس کے سونے کی بھی کوئی حد ہو۔ خدا معلوم اس کی نیند کو کیا ہو گیا ہے۔“

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی — ”بابوجی .... اے جی بابوجی۔“

مالتی لپک کر دروازہ کے قریب گئی۔ ایک نووارد عورت دروازہ پر کھڑی تھی جس کا سامان قُلی لئے تھا اور قلی آواز دے رہا تھا — مالتی دوڑ کر سائبان میں آئی اور اُس نے بجوا کی مائی کو زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار وہ اُٹھی باہر گئی اور نووارد کو لئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

نووارد ادھیڑ عمر کی ایک بنگالی عورت تھی اور ملبوس سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ بیوہ ہے۔

اُس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی نے خیال کیا کہ شاید وہ اُس کے شوہر کی کوئی عزیز ہو۔ لیکن پھر کسی کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع تو نہ تھی۔ مالتی سوچتی رہی اور اس بات کا بھی فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ اُسے پرنام کرے یا نہ کرے۔

”یہ سرت بابو کا مکان ہے؟“ نووارد نے دریافت کیا۔

”ہاں“

”تم اُن کی بیوی ہو؟“

مالتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور اُس سے پوچھا۔ ”آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟“

”میں بنارس سے آ رہی ہوں۔“ نووارد عورت نے کہا ”میں اپنے وطن جا رہی تھی۔ لیکن میرا ٹکٹ کہیں گم ہو گیا اور ریلوے کے ملازموں نے مجھے یہیں اُتار دیا۔ اب مجھے یہاں سے دوسرا ٹکٹ خریدنا ہو گا۔ اُس گاڑی سے میں جا نہیں سکتی تھی اور دوسری گاڑی شب کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے اتنی دیر میں کیا کرتی۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں نزدیک ہی ایک بنگالی خاندان ہے اور میں وقت گزارنے کے لئے یہاں چلی آئی۔ میرا آنا تمھارے لئے کوئی تکلیف کا باعث تو نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں“ مالتی نے خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا۔ ”مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ یہاں تشریف لائیں — بیٹھیے۔“

مالتی کے اشارہ پر بجوا کی مائی نے زمین پر دری بچھا دی۔ مالتی نے بجوا کی مائی کو فوراً ایک روپیہ دیا اور کہا کہ جلد بازار سے جا کر ناشتہ کی چیزیں لے آئے۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے“ نووارد عورت نے کہا ”میرے پاس ٹوکری میں پھل موجود ہیں لیکن اگر تمھیں زحمت نہ ہو تو مجھے تھوڑا چاول کھلا دو۔ میں نے کل شام سے چاول نہیں کھایا ہے۔“

”ٹھیک ٹھیک، میں تو بالکل ہی بھول گئی“ مالتی نے لجاجت کے ساتھ کہا۔ ”دائی فوراً آگ جلاؤ جلدی کرو۔“

ملازمہ نے مالتی کو روپیہ واپس دیا اور باورچی خانہ میں جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

نووارد اور مالتی دونوں دری پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔

”تمھارا نام کیا ہے بیٹی؟“ نووارد نے پوچھا۔

”مالتی“

”تمھاری دادھیال کہاں ہے؟“

”اُتر پاڑہ“

”تمھارے ماں باپ زندہ ہیں؟“

”میرے باپ تو میرے پیدا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال کر گئے۔ اور ابھی میں بالکل کمسن ہی تھی کہ ماں بھی مر گئیں۔“ یہ کہتی ہوئی مالتی خود باورچی خانہ میں چلی گئی۔ بجوا کی مائی ابھی آہستہ آہستہ چیزوں کو ادھر سے اُدھر رکھ رہی تھی۔ مالتی نے اُسے اس کی سستی پر ملامت کی اور خود ہی جلد جلد کاموں کو انجام دینے لگی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد مالتی اپنے مہمان کے لئے کھانا پکا رہی تھی اور نووارد اُس کے بغل میں بیٹھی اُس سے باتیں کر رہی تھی۔

”تمھاری شادی کب ہوئی“ بنارس کی بیوہ نے دریافت کیا۔

”اسی بیساکھ کے مہینہ میں“

”صرف! تم یہاں کب سے ہو؟“

”تقریباً دو ماہ سے“

”تمھارے شوہر دفتر کب جاتے ہیں؟“

شوہر کا نام سُن کر مالتی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔

”نو بجے صبح کو“ اُس نے شرم سے نظر کو نیچی کرتے ہوئے کہا۔

”چھ بجے اور کبھی سات بجے بھی“

(۵)

سرت چندر آج خلاف معمول دفتر سے کچھ سویرے لوٹے۔ مالتی نے مسکراتے ہوئے اُن کا خیر مقدم کیا ”آج بہت سویرے آئے“ سرت چندر مسکرائے۔ بولے۔ ”میں نے خیال کیا کہ تم تنہا گھبراتی ہو گی اور اس لئے میں نے جلدی کی۔“ مالتی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ بولی ”لیکن آج میں تنہا نہیں ہوں۔ سوچو کون آیا ہے؟“

سرت چندر نے تعجب سے پوچھا۔ ”کون ہے“

"ایک بنارس کی بیوہ خاتون۔ بنارس سے وہ اپنے مکان جا رہی تھیں کہ راستہ میں اُن کا ٹکٹ کہیں گم ہوگیا اور ریلوے والوں نے انھیں یہیں اُتار دیا"

"بنارس سے آرہی ہیں وہ؟ تنہا ہیں یا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ اُن کی عمر کیا ہوگی؟"

"تنہا ہیں، اُن کی عمر ۴۰۔۔۔ ۵۰ کے لگ بھگ ہوگی"

سرت چندر کو مالتی کے تخمینہ پر ہنسی آگئی۔ "تمھیں چالیس پچاس میں اُس وقت تک فرق نہ معلوم ہوگا جب تک تم خود چالیس کی نہ ہو جاؤ" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ جس کی عمر سو سال کی ہے، اُس کے نزدیک چالیس اور پچاس میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن جس کی عمر چالیس سال کی ہے اگر اُسے پچاس سال کا کہا جائے تو یہ اُس کی کھلی ہوئی توہین ہے"

لیکن سرت چندر کی ہنسی دیر پا نہ تھی۔ انھوں نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"اس جگہ تو بنگالی خاندان کئی ایک ہیں۔ وہ خاص کر یہیں کیوں تشریف لائیں"

"تمھیں کوئی عذر ہے؟" مالتی کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔

"یقیناً — کیا وہ حسین بھی ہیں؟"

مالتی کو سرت چندر کا یہ سوال ناگوار گزرا۔ اُس نے منھ بناتے ہوئے کہا "تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"کیوں نہیں؟ مجھے بہت شبہ ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسی عورت ہیں۔ بنارس سے آرہی ہیں اور پھر بالکل تنہا"

مالتی اپنے شوہر کے مفہوم کو سمجھ گئی۔ بولی۔ "نہیں نہیں تمھارا خیال غلط ہے۔ وہ ایک شریف عورت ہیں"

"جیسے تم جانتی ہی ہو" سرت چندر نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "اور وہ جائیں گی کب؟"

"میں نے نہیں پوچھا"

"دوسری گاڑی رات کو ساڑھے بارہ بجے جاتی ہے"

"لیکن وہ رات کو اکیلی جائیں گی کیسے؟"

"تمھیں اس کی کیا فکر ہے؟ میں خود اسٹیشن پر جا کر انھیں سوار کرا دوں گا۔ جس قدر جلد وہ یہاں سے جائیں اُسی قدر بہتر ہے"

مالتی بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ سرت چندر نے مالتی کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا۔

"لیکن تم آخر ملول کیوں ہوئی جاتی ہو؟"

"بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی واپسی کی نسبت کچھ کہا نہیں۔ پھر میں کس طرح انھیں گھر سے نکال دوں"

سرت چندر بولے "تم اگر دقت محسوس کرتی ہو تو میں خود اس کا انتظام کروں گا۔ اُن کا یہاں زیادہ قیام مناسب نہیں ہے" یہ کہکر سرت چندر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ شغل کا سامان موجود تھا۔ تھوڑی دیر میں سرت چندر بالکل دوسرے تھے۔ دن کی تمام کلفتیں دور ہو چکی تھیں۔ مالتی سے اب وہ انتہائی خوش طبعی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

اسی دوران میں بنارس کی خاتون باہر سے آئیں اور کمرہ کے دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئیں۔ سرت چندر جلدی سے باہر آئے اور انھوں نے بہت ہی مودبانہ طریقہ سے خاتون کو "پرنام" کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی" بنارس کی بیوہ چپ رہیں سرت چندر پھر لجاجت کے ساتھ بولے "آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"آج کل میں بنارس میں رہتی ہوں"

"آپ کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں اپنے وطن واپس جا رہی تھی۔ لیکن راستہ میں میرا ٹکٹ کہیں کھو گیا"

"ہاں، ہاں" سرت چندر نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے سُنا ہے۔ آپ بالکل اطمینان سے رہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جس گاڑی سے آپ آئی ہیں کل اُسی گاڑی سے آپ جائیں تو زیادہ بہتر ہے"

"تمھارا بہت شکریہ۔ لیکن ایک گاڑی رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی تو روانہ ہوتی ہے"

"جاتی تو ہے۔ لیکن جانے کی آخر جلدی کیا ہے۔ سردی سخت ہے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوگی۔ رات کی گاڑی سے جانا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ اور پھر میں آپ کو جانے کب دیتا ہوں" اور یہ کہکر انھوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

سرت چندر شال اوڑھ کر دوستوں سے ملنے گئے۔ شب کو وہ واپس ہوئے تو رات کافی ہو چکی تھی، نشہ میں مخمور تھے۔ مالتی نے پوچھا "اتنی دیر کیوں ہوئی؟" انھوں نے مالتی کے ایک چٹکی لی۔ بولے۔ "آج بہت ہی اچھی خبر ہے؟"

"کیا؟" مالتی نے جواب کا انتظار کرتے ہوئے کہا۔

"میرا تبادلہ تاری گھاٹ ہوگیا"

"اور تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہوا؟"

"ہاں"

مالتی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

سرت چندر بولے:۔ "تین چار دن میں ہم لوگوں کو وہاں چلا جانا ہوگا"

(۴)

صبح کو سرت چندر اُٹھے تو بنارس کی بیوہ موجود نہیں۔ انھوں نے مالتی کو پکارا اور پوچھا:۔ "یہ رات کی گاڑی سے گئی نہیں؟"

"عجب آدمی ہو۔ وہ تو جانے کے لئے طیار ہی تھیں۔ تمھیں نے تو زبردستی اُنھیں روکا۔"

"ہاں؟" سرت چندر نے آزردہ ہو کر کہا:۔ "اچھا، میں دوپہر کے وقت خلاصی بھیج دوں گا تاکہ وہ انھیں اسٹیشن پہونچا دے۔ اور ہاں دیکھو۔ برتنوں سے ذرا ہوشیار رہنا۔"

مالتی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے صرف اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شوہر کے اس شبہ کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔

ناشتہ کے بعد مالتی اور بنارس کی بیوہ دھوپ میں دری بچھائے گفتگو میں منہمک تھیں۔ زمانے کے بعد مالتی کو ایسی صحبت میسر آئی تھی۔ بھجوا کی مائی سے ہندوستانی میں گفتگو کرتے کرتے وہ عاجز ہو گئی تھی۔

دو بج چکے تھے، خلاصی کا انتظار تھا۔ بنارس کی بیوہ نے اپنی چیزوں کو یکجا کر لیا تھا اور جانے کے لئے طیار تھیں۔

ڈھائی بج گئے۔ خلاصی نہ آیا۔ مالتی نے کہا "فرض کیجئے اگر آج آپ نہ جائیں اور دو ایک دن یہاں اور قیام کریں تو کوئی مضایقہ ہے؟ آپ کے آجانے سے میری طبیعت بہت بہل گئی ہے۔ تنہائی میرے لئے مصیبت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتی بعض وقت میری طبیعت تو ایسی چاہتی ہے کہ زور زور سے رونے لگوں۔"

بنارس کی بیوہ نے کچھ تامل کے بعد کہا: "مجھے تو کوئی عذر نہیں۔ لیکن تمھارے شوہر کو شاید میرا زیادہ قیام پسند نہ آئے۔"

"نہیں نہیں" مالتی نے جواب دیا ہر چند اُسے اس کا پورا احساس تھا کہ اُن کا شبہ بالکل ہی ٹھیک ہے۔

اُس نے سوچنا شروع کیا "وہ تو تمام دن دفتر میں رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ شام کو دوست احباب کے ہاں بھی اُن کا جانا ضرور۔ اُن کی طبیعت تو ہر وقت بہلتی رہتی ہے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ میں تمام دن کیسے کاٹتی ہوں اب تو تنہائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بھجوا کی مائی کمبخت تمام دن پڑی سوتی رہتی ہے۔ اس کا رہنا نہ رہنا، دونوں میرے لئے مساوی ہے۔ اتفاق سے یہ آگئی ہیں۔ دو چار دن انھیں میں ضرور ٹھہراؤں گی۔ بگڑیں، چاہے کچھ کریں۔ میں اُن سے صاف صاف کہدوں گی کہ تمھیں میری خوشی کا کچھ بھی خیال نہیں......."

مالتی سوچتی رہی۔ اُسے سرت چندر سے بڑی محبت تھی۔ لیکن اس وقت وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا خیال کر رہی تھی حقیقت یہ ہے کہ مالتی کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی اس تنہائی سے اکتا جاتی۔ ایک دو دن کی یہ مصیبت نہ تھی۔ صبح سے شام تک نہ کسی سے بات چیت، نہ ہنسنا نہ بولنا۔ شام کو سرت چندر آئے بھی تو ناشتہ پانی کرنے کے بعد ٹہلنے چلے گئے۔ اب مالتی دس گیارہ بجے رات تک شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ مالتی کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔

تین بج گئے خلاصی نہ آیا۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ گاڑی کے جانے کی آواز دیر تک کانوں میں آتی رہی۔ مالتی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے اسوقت کتنا سکون تھا۔ مہمان سے اب وہ خوش خوش باتیں کر رہی تھی۔

شام کے وقت مالتی نے سرت چندر کے لئے بازار سے ناشتہ منگانا چاہا۔ بنارس کی بیوہ نے کہا۔ "تم یہ تمام چیزیں بازار سے کیوں منگاتی ہو۔ خود ہی گھر پر کیوں نہیں بنا لیتیں۔"

مالتی نے کہا:۔ "کون یہ جھگڑا کرے۔"

"جھگڑا کیا ہے؟" بیوہ عورت نے کہا۔ "اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو یہ تمام چیزیں خود ہی پکا لیا کرتی۔"

مالتی خاموش رہی۔ عورت نے کہا: "آؤ آج ہم تم مل کر پکائیں۔ دیکھو گھر کی چیز کتنی اچھی اور پھر کس قدر کم دام میں طیار ہوتی ہے۔"

(۵)

سرت چندر آج دفتر سے کچھ دیر میں واپس ہوئے۔ جب اُن کی نظر بنارس کی بیوہ پر پڑی، تو وہ چلا اُٹھے۔ مجھ سے کیا بھول ہوئی۔ بالکل ہی خیال نہ رہا کہ مجھے گاڑی کے وقت خلاصی کو بھیجنا ہے۔ "مجھے آپ سے حد درجہ شرمندگی ہے۔" انھوں نے بنارس کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بہرحال جیسے آپ نے دو دن یہاں تکلیف کی ہے ایک دن ہم لوگوں کے خیال سے اور سہی مجھے کل کام پر جانا نہیں ہے۔ میں خود ہی کل آپ کو گاڑی میں سوار کرا دوں گا۔"

وہ کمرہ میں گئے۔ مالتی نے دیکھا کہ اُن کے منھ سے شراب کی بہت زیادہ بو آرہی ہے۔ اس سے نہ رہا گیا بولی۔ "تمھاری حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ تاری گھاٹ میں جب تم زیادہ کماؤ گے تو اور اپنی حالت خراب کرلو گے۔"

سرت چندر نے لاپرواہی کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ "پاگل ہوئی ہو۔ وہاں کیا کوئی کلفز کیپنی ہے۔ تاری گھاٹ، شہر سے باہر ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ وہاں یہ چیزیں کہاں میسر۔ وہاں پہونچتے ہی میں اشنان کروں گا اور پھر 'یکلم' چھوڑ دوں گا۔"

"یکلم" کے لفظ پر انھوں نے کافی زور دیا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"کل دفتر جاؤ گے؟" مالتی نے پوچھا۔

"نہیں۔ آج میں نے تمام کام ختم کر دئے اور کام سمجھا بھی دیا۔ پرسوں میں نے اپنی ترقی کی خوشی میں اپنے دوستوں کو چاء پر مدعو کیا ہے اور کل مجھے اس کے متعلق تمام انتظامات کرنے ہیں۔"

اس کے بعد سرت چندر کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ آج خلافِ معمول، دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزیں موجود تھیں۔ انھوں نے مالتی سے پوچھا "آج یہ چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟" مالتی نے بتایا۔ سرت چندر بولے "میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے۔ اگر یہ پرسوں تک یہاں ٹھہر جائیں تو ہم لوگوں کو دعوت کے انتظام میں بہت زیادہ سہولت ہو۔"

"لیکن تم خود اُن سے کہو تو بہتر ہے" مالتی نے مسرت کے ساتھ کہا۔

"لیکن اس حالت میں، میں اُن کے پاس جاؤں کیسے؟"

"بیوقوف!" مالتی نے کسی قدر ملامت آمیز لہجہ میں کہا "کیا تم نے دفتر سے آتے ہی اُن سے گفتگو نہیں کی ہے؟"

"ہاں؟" سرت چندر نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں یاد آیا۔ بولے "ہاں ہاں۔ ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے اُن سے باتیں کی تھیں۔"

مالتی نے شوہر کا پیام' بنارس کی بیوہ تک پہونچا دیا اور اُنھوں نے بخوشی اسے منظور بھی کرلیا۔"

(۸)

اتوار کا دن تھا۔ سرت چندر آج ہی تاری گھاٹ روانہ ہونے والے تھے۔ بنارس کی بیوہ نے مالتی سے کہا" میں نے اپنی رائے بدل دی ہے۔ اب میرا خیال بنگال جانے کا نہیں ہے۔ میں بنارس ہی واپس جاؤں گی۔"

مالتی بولی۔ "تو پھر کیا اچھا ہوتا کہ آپ ہم لوگوں کے ساتھ ہی چلتیں اور دو ایک دن تاری گھاٹ میں بھی قیام کرتیں ——
تاری گھاٹ' بنارس سے تین چار اسٹیشن تو ہی ہے۔"

اسی دوران میں سرت چندر باہر سے آئے اور بازار کا حساب صاف کرنے کے لئے اُنھوں نے مالتی سے تیس روپے طلب کئے۔

"تیس روپے ؟" مالتی نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن روپے ہیں کہاں ؟"

"کل ہی میں نے تمھیں اسّی روپے لاکر دئے ہیں۔ کیا وہ سب خرچ ہوگئے ؟"

"دیکھتی ہوں" مالتی بولی "لیکن دعوت ہی کے لئے تم نے یکمشت مجھ سے پچاس روپے لئے تھے۔ اور پھر کل شام کو دوستوں کے لئے شراب منگانے کو تم نے کئی بار باہر سے روپے منگائے" یہ کہتی ہوئی مالتی گئی اور اس نے اپنے بکس کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کُل دو روپے چودہ آنے باقی ہیں۔

سرت چندر مضمحل ہوگئے۔ "اب میں کیا کروں ؟" اُنھوں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی اس کے ذمہ دار ہو" مالتی نے تھوڑے سکوت کے بعد کہا "میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری یہ عادت تمھیں ایک دن تباہ و برباد کر کے چھوڑے گی۔ تمھیں کل کا خیال بالکل ہی نہیں رہتا۔ روپیہ کو کس قدر بے پرواہی سے خرچ کرتے ہو۔"

سرت چندر نے مالتی کے وعظ و پند پر کوئی توجہ نہ کی اور یہ کہتے ہوئے باہر جانے لگے کہ دیکھو کہیں سے انتظام کرتا ہوں۔

بنارس کی بیوہ یہ تمام باتیں باہر سے سُن رہی تھیں۔ اُنھوں نے مالتی کو کنارے لیجا کر کہا۔ "تمھارے شوہر کو مجھ سے روپے لینے میں کچھ تامل ہوگا۔ چونکہ اب میں مکان نہیں جا رہی ہوں اس لئے اسوقت مجھے روپے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

مالتی نے سرت چندر سے جا کر کہا۔ لیکن وہ بولے "نہیں ایسا کیونکر ممکن ہے اُن سے کس طرح قرض لے سکتے ہیں"

بنارس کی بیوہ خود ہی نزدیک آگئیں۔ بولیں "تمھیں مجھ سے قرض لینے میں کیا تامل ہے ؟"

سرت چندر تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے "آپ کی بہت مہربانی ہے۔ لیکن اگر آپ ہم لوگوں کے ساتھ تاری گھاٹ چلیں تو میں پانچ چھ دن میں آپ کے روپے ادا کردوں گا۔"

"کیوں ؟ روپے ادا کرنے کی اتنی جلدی کیا ہے۔ جب تمھارے پاس روپے ہوں مجھے واپس دینا۔ اس وقت تمھیں کتنے کی ضرورت ہے ؟ صرف تیس کی ؟ میرے پاس روپے موجود ہیں۔ اگر زیادہ کی بھی ضرورت ہو تو مجھ سے لے سکتے ہو۔ آخر تم سوچتے کیا ہو ؟ اس میں زحمت کیا ہے ؟"

"جی ہاں' تیس روپے میں کام چل جائے گا۔ لیکن آپ کی بہت نوازش ہے"

بنارس کی بیوہ نے اپنا بکس کھول کر دس دس روپے کے تین نوٹ سرت چندر کے حوالے کئے۔

اُسی دن رات کی گاڑی سے سرت چندر تاری گھاٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔ بنارس کی بیوہ ساتھ تھیں۔ بھجوا کی ماں کو سرت چندر اپنے ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ تاہم اُس نے چلتے وقت کافی واویلا مچایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو اس جدائی کا بڑا قلق ہے کہ اس کا اثر کبھی زائل ہی نہیں ہوسکتا۔

مالتی چاہتی تھی کہ بنارس کی بیوہ کسی صورت تاری گھاٹ میں بھی دو چار دن قیام کرے۔ وہ اُن سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی تھی۔ اُس نے گاڑی میں بھی اُن سے بہت اصرار کیا لیکن اُنھوں نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ صبح کے وقت سرت چندر کو دلدار نگر میں دوسری گاڑی بدلنی ہوتی تھی۔ وہاں اُنھوں نے بنارس کی بیوہ کو الوداع کہا۔

(۹)

صبح ہوتے ہی یہ لوگ تاری گھاٹ پہونچ گئے۔ یہاں ریلوے کا کوارٹر تھا۔ وہیں ان لوگوں نے قیام کیا۔ چیزوں کو قرینہ سے رکھنے کے بعد سرت چندر اپنے نئے رفیقوں سے ملنے باہر چلے گئے۔

مالتی نے غسل کرنے کے لئے ایک صندوق کھول کر اپنے لئے ایک ساری نکالنی چاہی۔ یہ وہ صندوق تھا جس میں وہ عموماً اپنے زیور کا چھوٹا بکس رکھا کرتی تھی۔ لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب اُس نے دیکھا کہ زیور کا بکس صندوق میں موجود نہیں ہے۔ اُس نے آپ ہی آپ کہا۔ "یقیناً کسی دوسرے صندوق میں ہوگا" اور یہ کہکر وہ ایک ایک صندوق کو کھول کھول کر دیکھنے لگی لیکن بکس کسی میں موجود نہ تھا۔

"نہیں نہیں' یہ کہیں ضرور ہوگا" مالتی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر اس نے ایک ایک صندوق کا جائزہ لیا۔
لیکن بکس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

بالآخر زمین پر وہ بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد سرت چندر واپس ہوئے تو انھوں نے مالتی کو اس حال میں دیکھ کر پوچھا "کیا ہے ؟"

مالتی نے ہچکی لے لے کر تمام واقعات سرت چندر سے دُہرائے۔ سرت چندر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ انتہائی غم و افسوس کے تحت وہ ایک کُرسی پر گر پڑے اور پوچھا۔

"تم نے تمام سامان دیکھ لیا ہے ؟"

"ہاں"

"سب سے اخیر مرتبہ تم نے بکس کو کب دیکھا تھا ؟"

"مجھے یاد ہے' میں نے کل دانا پور میں اسے بڑے صندوق میں رکھا تھا"

"تمھیں یاد ہے، تم نے کوئی چیز نکالنے کے لئے صندوق کو گاڑی میں کھولا بھی تھا؟"

"ہاں - ایک مرتبہ - مجھے بہت سردی معلوم ہو رہی تھی تو شال نکالنے کے لئے میں نے ایکبار کھولا تھا"

"ہو سکتا ہے کہ تم نے بکس کو باہر نکالا ہو اور پھر رکھنا بھول گئی ہو"

"نہیں" مالتی نے تیقن کے ساتھ کہا۔ "شال تو اوپر ہی تھی۔ میں دوسری چیزوں کو کیوں الٹ پلٹ کرتی"

"اس کے بعد تم نے کنجی کہاں رکھی؟"

"کنجی کو میں اپنے کمربند میں باندھ لیا تھا"

"اور پھر تم اس کے بعد سو گئیں"

"ہاں" مالتی نے اپنے شوہر کے چہرہ پر خاموش نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا" سرت چندر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے، "یہ اسی اجنبی عورت کا کام ہے"

مالتی نے اس کی تردید نہ کی۔ خاموش رہی۔ سرت چندر پھر بولے۔ "جب تم سو گئی ہوگی تو اس نے آہستہ سے کنجی تمھارے کمربند سے کھول لی ہوگی۔ تم نام جانتی ہو؟"

"نہیں - میں ان سے ان کا نام کیونکر پوچھتی - وہ تو مجھ سے عمر میں بہت کافی بڑی تھیں"

"وہ، بنارس میں رہتی کہاں ہیں؟"

"کسی مٹھ میں"

"کسی مٹھ میں؟ وہاں تو سیکڑوں مٹھ ہیں"

اب سرت چندر برہم ہو چلے تھے۔ بولے، "میں نے تمھیں پہلے ہی تنبیہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں پر اعتماد و یقین نہ کرنا چاہیے۔ یہ بنارس کی عصمت فروش عورتیں، ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں" سرت چندر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بولے:- "اس نے تیس روپے سے اچھا سودا کیا"

"لیکن مجھے یقین نہیں آتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیا ہوگا۔ ممکن ہے میں نے خود ہی دانا پور میں اسے چھوڑ دیا ہو" مالتی نے قدرے یقین کے لہجہ میں کہا۔

لیکن سرت چندر نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ "تمھیں دنیا کا بہت کم تجربہ ہے۔ تم کیا جانو کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے سرت چندر پولیس کو اطلاع دینے کے لئے باہر چلے گئے۔

(۱۰)

پندرہ دن گزر گئے۔ زیوروں کا غم دن بدن کم ہوتا گیا۔ اب پھر سرت چندر اور مالتی خوشی کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ سرت چندر کا موجودہ کام کافی نفع بخش تھا۔ اس نے ان لوگوں کے غم کو غلط کر دیا تھا۔

خبر پاتے ہی ولدار نگر کے جمعدار اسی دن تاری گھاٹ پہونچ گئے تھے۔ انھوں نے سرت چندر کا بیان قلمبند کر لیا تھا اور زیوروں کی ایک مکمل فہرست بھی مانگ لی تھی۔ لیکن اب تک پولیس کی طرف سے کوئی خبر نہ آئی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سرت چندر دفتر گئے ہوئے تھے۔ مالتی دن کا کھانا کھا رہی تھی کہ دلدار نگر سے گاڑی آئی۔ مالتی کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی تو وہ دوڑ کر کھڑکی میں چلی جاتی اور اسٹیشن کی چہل پہل کو غور سے دیکھا کرتی۔ گاڑی کے آنے پر پلیٹ فارم پر کیسی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مالتی کو یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اسے غور سے دیکھتی اور بہت لطف حاصل کرتی۔

اس وقت بھی وہ کھانا چھوڑ کر دریچہ کی طرف دوڑ گئی۔ بالکل غیر متوقع منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ بنارس کی بیوہ گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئیں۔ قلی ان کا سامان اتارنے لگا۔ مالتی نے دیکھا کہ انھوں نے قلی سے کچھ دریافت کیا اور قلی نے اسکے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

مالتی کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چند لمحوں میں چوری کے الزام میں ماخوذ ہونے والی ہے۔ وہ دوڑ کر واپس ہوئی۔ بچے ہوئے کھانے کو اس نے جلد ہی جلدی علحدہ رکھا اور اپنے آپ کو سنبھالنے لگی۔ اس کی حالت غیر ہوئی جاتی تھی خیالات کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ خدا کرے انھیں اس کی واقفیت نہ ہوئی ہو کہ میرے شوہر نے ان پر چوری کا شبہ کیا ہے۔ کتنے معصوم جذبات کے ساتھ وہ خدا سے دعائیں کر رہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مالتی اب تک بنارس کی بیوہ کو اس معاملہ میں قطعی بے گناہ سمجھتی تھی۔ اور اب تو اسے یقین کامل ہو گیا کہ یہ ان کا کام نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر انھیں آنے کی یہاں دوبارہ جرأت کیسے ہوتی۔

چند لمحوں کے بعد بنارس کی بیوہ مالتی کے سامنے تھیں۔ مالتی نے انھیں "پرنام" کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ تشریف لائیں" بیوہ نے مالتی کے سر پر محبت کا ہاتھ دھرا اور آہستہ آہستہ دعائیں دیں۔ مالتی نے چاہا کہ کھانے کا انتظام کرے لیکن بیوہ نے روکا اور کہا۔ "نہیں اس کی زحمت نہ کرو۔ آج ایکادسی ہے اور میں برت سے ہوں۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ مالتی نے دیکھا کہ اس کے مہمان کا چہرہ بالکل اترا ہوا ہے۔ شگفتگی نام کو بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دماغ پر کوئی بوجھل چیز رکھی ہے اور وہ حد درجہ ملول اور افسردہ ہے مالتی نے کہا۔ "کیوں، آج آپ کچھ ملول نظر آتی ہیں"

"تمھیں تو اس کی وجہ جاننی چاہیے" بیوہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیسے؟" مالتی کی زبان سے نکلا اور وہ جواب کا لرزتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔

"تمھیں شبہ ہے کہ میں نے تمھارے زیور چرائے۔ تم نے پولیس کو میرے پیچھے دوڑایا اور پھر تم مجھ سے دریافت کرتی ہو کہ میں کیوں ملول نظر آتی ہوں"

مالتی کی زبان تھوڑی دیر کے لئے گنگ ہو گئی۔ انتہائی شرم و ندامت کے لہجہ میں صرف اتنا کہہ سکی کہ "آپ کو یقین ہے کہ میں نے

ایک لمحہ کے لئے بھی ایسا شبہ اپنے دل میں پیدا کیا ہوگا؟"

"لیکن تمھارے شوہر نے تو ایسا کیا" بنارس کی بیوہ نے ذرا تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

ماتنی معذرت کے ساتھ پھر بولی:- "انھیں یقین نہ تھا کہ پولیس آپ کو تلاش کر سکے گی۔ آج ہی صبح کو وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بنارس میں بے شمار مٹھ ہیں اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ کسی گمنام ہستی کو ان تمام مٹھوں میں سے تلاش کیا جا سکے۔"

"لیکن پولیس نے بہرحال مجھے تلاش کر ہی لیا اور انھوں نے مجھے اس قدر پریشانیوں میں مبتلا کیا کہ بالآخر مجھے دو سو روپے دیکر ان سے اپنی جان چھڑانی پڑی۔ یہ تم لوگوں سے دوستی کا انجام ہے۔ مجھے سخت افسوس ہے۔"

تھوڑی دیر تک کامل خاموشی رہی۔ پھر بنارس کی عورت نے کہا "تمھارے شوہر واپس کب ہوتے ہیں؟"

"رات گئے"

آسمان پر ابر آنے شروع ہوئے۔ آفتاب بادلوں میں چھپ گیا۔ بنارس کی بیوہ نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بارش کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیوں؟" ماتنی نے پوچھا۔

"مجھے آج ہی جانا ہے"

"آج ہی!" ماتنی نے طفلانہ سادگی سے پوچھا "کیوں؟ جلدی کیا ہے؟"

بیوہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکا تبسم آیا اور انھوں نے کہا:- "بیوقوف لڑکی۔ تیرے شوہر مجھے ڈاکو تصور کرتے ہیں اور تو چاہتی ہے کہ تیرے ہاں اور ٹھہروں۔ نہیں مجھے آج ہی ڈھائی بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔ میرے مٹھ کی بہت سی عورتیں جاترا کے لئے جا رہی ہیں اور مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔"

"آپ وہاں کیا زیادہ دنوں تک رہیں گی؟" ماتنی نے پوچھا

"کیوں پوچھتی ہو؟" بیوہ نے آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خیال کرتی ہو کہ پھر ہم تم مل سکیں گے؟"

بیوہ کا دل بھرا آتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں غم و الم کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد عورت نے کہا

"میری بچی کیا تو مجھے خوش کرنا چاہتی ہے؟"

"ہاں" ماتنی نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"میرے پاس یہاں کچھ زیور ہیں۔ کیا تم انھیں میری خواہش سے پہن سکتی ہو" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے ایک صندوق کو کھول کر ایک اعلیٰ درجہ کا بکس نکالا۔ بکس بہت خوشنما تھا۔ انھوں نے بکس کا ایک بٹن دبا دیا جس سے اس کا ڈھکنا خود بخود کھل گیا۔ سونے کے زیور ہیرے یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھروں سے مرصع۔ ماتنی کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

عورت نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "یہ چیزیں میں اپنی طرف سے تمھیں دے رہی ہوں" تھوڑی دیر کے لئے ماتنی ششدر اور مبہوت

ہو کر رہ گئی۔ پھر اس نے کہا: آپ مجھے معاف فرمائیں میں ان چیزوں کو نہیں قبول کر سکتی۔"

"کیوں نہیں" عورت نے شکایت کے لہجہ میں پوچھا۔

"کیوں؟ میں یہ تمام چیزیں آپ سے کیوں لوں۔ یہ تو بہت ہی قیمتی ہیں"

"لیکن میں تو اپنی خوشی سے یہ چیزیں تمھیں دے رہی ہوں۔"

"ہو۔ لیکن مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں انھیں لوں، نہیں، میں نہیں لوں گی۔"

آسمان بہت زیادہ ابر آلود ہو گیا تھا۔ طوفان کے بھی علامات نظر آ رہے تھے۔ دن کی روشنی تقریباً مفقود ہو چلی تھی۔

عورت نے دھیمی آواز میں لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا۔ "فرض کرو کہ تمھیں اس کا حق حاصل ہے۔"

"مجھے اس کا حق حاصل ہے؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" ماتنی نے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پوچھا

بیوہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولیں "ہاں میں تم سے کہوں گی۔ اور اسی لئے آج میں تمھارے پاس آئی بھی ہوں"

ماتنی کا دل کسی غیر متوقع خطرہ سے دھڑکنے لگا۔ اس نے عورت کی طرف مضطربانہ نگاہ ڈالی۔

"کیا واقعی تمھاری ماں مر چکی ہے؟" عورت نے پوچھا۔

"لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں؟" ماتنی نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں جواب دیا۔

"تو پھر تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ہی تمھاری بدقسمت ماں ہوں" لیکن اتنا کہکر وہ ضبط نہ کر سکی اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ماتنی کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بالکل غیر شعوری طور پر وہ اپنی ماں سے علیحدہ ہٹ کر کھڑی ہو گئی اس کے دماغ میں ایک بہیک واقعہ کی یاد تازہ ہوئی جو آج سے چند ماہ پہلے پیش آیا تھا۔ داتا پور آنے سے پہلے وہ اپنی دادھیال میں تھی۔ ایک دن شب کے وقت وہ سو رہی تھی اور بغل ہی میں اس کی چچی اور ایک ضعیفہ جس کا نام کشودھا تھا اور جسے ماتنی "دادی دادی" کہکر پکارتی تھی سوتی تھیں۔ شب کے وقت کشودھا اس کی چچی سے کوئی رازدارانہ گفتگو کر رہی تھی۔ لیکن ماتنی کی نیند ٹوٹ چکی تھی اور کشودھا کو اس کی خبر نہ تھی کہ ماتنی جاگ رہی ہے۔ کشودھا ابھی ایک طویل تیرتھ سے واپس آئی تھی۔ ماتنی نے جو کچھ سنا اس سے ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا کہ ماتنی کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اسے بالکل پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کی ماں جسے آج تک وہ مردہ سمجھ رہی تھی دراصل مری نہیں ہے اور کشودھا سے اتفاقیہ طور پر اس کی ماں سے ایک تیرتھ میں ملاقات ہو گئی تھی۔ سب سے عظیم صدمہ جو ماتنی کو ہوا وہ یہ جان کر ہوا کہ جس ہستی کی مقدس یاد وہ اپنے دل میں آج تک تازہ رکھتی آ رہی تھی وہ دنیا کی نظروں میں ایک "بدچلن عورت" ہے۔ ماتنی کو جیسی روحانی تکلیف اس رات کو ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ "اور یہ عورت جو اس کے سامنے کھڑی ہے وہ اسکی وہی ماں ہے!"

اس کی ماں اب تک زار و قطار رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی ایک بارش تھی جو کسی طرح نہ رکتی تھی۔ انھوں نے اپنی طبیعت

...روکتے ہوئے پوچھا۔ کیا میرے داماد کو بھی اس کی خبر ہے؟"

"نہیں۔ اُنھیں نہیں معلوم"

"تمھیں اس واقعہ کی اطلاع کب ہوئی"

"شادی کے بعد"

"مکشودھا چچی سے سُنا ہوگا؟"

"ہاں"

"مجھے بھی انھیں سے معلوم ہوا کہ تمھاری شادی اب ہو چکی ہے۔ اور تمھارے شوہر داناپور میں مال بابو ہیں۔ اُنھوں نے ...رے یہ بھی کہا تھا کہ تم آسوں کے مہینہ داناپور جاؤگی"

مالتی نے اپنی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:۔ "تو یہ محض اتفاقیہ طور پر آپ داناپور نہیں آئی تھیں لیکن ...پ آئیں کیوں؟" مالتی کے لہجہ میں اب ذرا سختی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ بھی وہ ایسے مجرم کے ساتھ ہمدردی نہیں کرسکتی۔

غریب ماں پر پھر رقت طاری ہوئی اور اُس نے اُسی عالم میں رُک رُک کر کہا:۔ "کیا کوئی اپنی اولاد کو بھی بھول سکتا ہے" ...لیکن اتنا کہتے کہتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔

اب مالتی کو بھی رونا آرہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک نو وارد عورت سے وہ کیونکر پہلی ہی ملاقات ...یں اس درجہ مانوس ہوگئی تھی۔ لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ محض خون کی کشش تھی، کوئی اور بات نہ تھی۔

"تو آپ نے اپنے کو کیوں ظاہر کیا؟" مالتی نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے خود نہیں معلوم۔ لیکن میں اپنے آپ کو روک نہ سکی"

مالتی یہ کہنے ہی کو تھی کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس راز کو مجھ پر ظاہر کر دیا ورنہ میں اپنی ماں کو کیسے پہچانتی" ...لیکن فوراً ہی دل کی آواز نے اُسے پکارا "کیا سوچتی ہے؟ ایسی ناپاک ماں۔ بہتر تھا کہ اس کی کبھی صورت بھی نہ دیکھی جاتی"

مالتی کی آنکھیں چمک اُٹھیں، بالکل اسی طرح جیسے پاگلوں کی آنکھیں بعض وقت چمکنے لگتی ہیں۔ وہ تلخ خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

گاڑی کا وقت قریب آگیا تھا۔ قلی، جیسا کہ پہلے طے پا چکا تھا، سامان لینے کے لئے آیا۔

"آپ ان جواہرات کو لیتی جائیں۔ میں اُنھیں نہیں پہن سکتی" مالتی نے کہا۔

بیوہ نے مالتی کے چہرہ پر نگاہ ڈالی۔ اُس نے معلوم کیا کہ اسوقت اس کے دماغ میں کس نوع کی باتیں چکر لگا رہی ہیں۔

"جیسا کہ تم خیال کرتی ہو، وہ بات نہیں ہے۔ تم ان چیزوں کو بلا تامل استعمال کرسکتی ہو۔ اگر ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی تو میں انھیں تمھیں دینے کے بجائے دریا میں پھینک دیتی۔ اپنی زندگی کے صرف ایک گناہ کی پاداش میں، میں نے بہ تمام

اذیتیں جھیلی ہیں اور کامل چودہ سال میں نے اس کا کفارہ ادا کیا ہے۔ یہ جواہرات میری سیاہ کاری کا نتیجہ نہیں ہیں میرے باپ ایک دولتمند آدمی تھے اور اُنھوں نے شادی کے وقت مجھے یہ چیزیں دی تھیں"۔

"لیکن پھر بھی میں شوہر سے دریافت کئے بغیر انھیں نہیں استعمال کرسکتی"۔

"ہاں۔ تم اُن سے پوچھ لو۔ اگر بالفرض وہ تمھیں اس کی اجازت نہ دیں تو تم ان چیزوں کو فروخت کر کے کسی مندر میں اس کے روپئے دیدینا"

ماں جانے لگی۔

مالتی کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ خون کے جوش سے وہ بالآخر مجبور ہوگئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے ماں کے قدموں کو پکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسی عالم میں اس کی زبان سے صرف یہ الفاظ نکل سکے۔ "ماما۔ پھر آنا"

"خوش رہو۔ خدا تمھیں عافیت دے اور چین سے زندگی گزارو" ماں نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ایک لمحہ کے بعد وہ موجود نہ تھی۔

(ماخوذ از بنگلہ)

پربھت کمار مکرجی

ظہیر الدین حیدر، تنویر آروی

اندھی

(۱)

شری کمرہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی ایک قمیص سی رہی ہے
چہروں کی لکیروں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ قمیص سینے کے
واسطے جبراً بیٹھ گئی ہے۔ ڈیوٹ پر چراغ ٹمٹما رہا ہے۔

کنتی: ارے رات میں یہ کیا کرنے بیٹھ گئیں۔

شری: یہ گونتھنا وہ گونتھنا ہر وقت یہی لگا رہتا ہے جیں نے ابھی تک کپڑے نہ سئے ہوں اس کا دیدہ کپڑے سینے میں کیسے لگے؟

کنتی: درزی کو کیوں نہیں دے دیں یہ قمیصیں؟

شری: گھر میں بہو کیا منہ دیکھنے کو ہوتی ہے اس سے درزی رسویا۔ نوکر۔ کہاری۔ سب ہی کا تو کام لیا جاتا ہے۔

کنتی: تو اس وقت؟

شری: اسی وقت تو ذرا فرصت ملتی ہے۔ سارا دن تو کام کرنے میں گزر جاتا ہے۔ میں تو کام کرتے کرتے تھک گئی ماتا پتا کے یہاں تو ایک بھی کپڑا نہ سیا۔ یہاں سب کچھ اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔

(شری کی انگلی میں سوئی چبھ جاتی ہے)

اوہ کیا آفت۔

کنتی: کپڑے کو دیکھ کر سیو نہیں تو انگلیاں گھائل ہو جائیں گی۔

شری: ایک تو کپڑے سیو اور اس کے اوپر سوئیوں سے اپنی انگلیاں گھائل کرو کیسی آفت ہے پڑا تماشہ۔ اگر میں اپنی خون سے تر انگلی ان کو دکھاؤں تو کیا وہ میری فکر کریں گے۔ لاپروا ہی سے کہدیں گے۔ کپڑا بھگو کر انگلی سے باندھ لو۔

(سوئی پھر اٹھاتی ہے اور سینے لگتی ہے)

کنتی: پانی سے بھگو کر کپڑا لاؤں؟

شری: رہنے دو! میں یونہی سیئے جاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں جب کوئی گھر کا کام کرتی ہوں۔ یا کسی بات کی تنگی ہوتی ہے تو ایک دم ماں باپ یاد آ جاتے ہیں۔ کیسے پیار سے رکھتے تھے۔ گھر کا کام مجھ سے کبھی نہ لیتے تھے۔ ہمارے گھر تو کپڑے درزی کے ہاں سینے جاتے ہیں۔ روپیہ کی بات ہے۔ یہاں کیسے ممکن ہے۔ کھانے کو تو ملتا نہیں۔ درزی کیا مفت سی دیگا۔

(چراغ کی روشنی خود بخود کم ہو جاتی ہے)

او ہو۔ دیوا بھی مجھے کچھ کام نہ کرنے دے گا۔ دن بھر تو کام کرتے کرتے دم لینے کی فرصت نہیں ملتی، رات کو قمیص سینے بیٹھی تو چراغ شریف اپنے گھر روانہ ہو رہے ہیں ذرا اور ٹھہر جا۔ اتنا نہ خفا ہو۔ تھوڑا اور رک جا۔ میں نے تجھے بہت دیر سے جلا رکھا ہے تھوڑا اور پھر کر مجھے اپنا کام ختم کر لینے دے۔

(چراغ کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے)

ارے ابھی تو قمیص آدھی بھی نہیں ہوئی اور دیوے صاحب چلے۔ کیا کروں۔

کنتی: تیل تو اس میں ہے نہیں، وہ کیا جلے گا خاک۔

شری: جا ذرا کوٹھری سے تیل کی ہنڈیا تو لے آ۔ ابھی تو آدھی قمیص پڑی ہے۔

کنتی: تو اس کے بعد میری کہانی سنو گی؟ سچ کہتی ہوں تم سنکر ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاؤ گی۔ سنو گی نا؟

شری: تیری اوٹ پٹانگ بے سر پیر کی باتیں روز ہی سنتی ہوں آج کیوں نہ سنوں گی۔ آج تو دل اور اُچاٹ ہو رہا ہے!

کنتی: اُچاٹ؟

شری: ہاں۔

کنتی: اسی لئے شاید اس دیوے کا دل بھی اُچاٹ ہو رہا ہے۔ اسے بھی آرام کر لینے دو۔

شری: اری بات سے بات نکالے ہی جاوے گی۔ تیل لا جلدی سے۔

(کنتی جاتی ہے، چراغ کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔

شری چراغ کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی اور جب روشنی کم ہوتی ہے تو اس کی بتی اور اکسا دیتی ہے کنتی ایک ہنڈیا لئے داخل ہوتی ہے۔ وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی بلکہ ہنڈیا کو الٹا کر کے شری کو دکھا دیتی ہے کہ تیل ذرا بھی نہیں ہے)

شری: اے اس گھر میں اس دیوے کے لئے ایک بوند تیل بھی نہیں۔ اس دیوے کا منہ کیسے پھونکوں۔

کنتی: لاؤ پیسے دو۔ ابھی دوڑ کے بھر کے لے آتی ہوں۔

شری: ان کو تو کچھ سوجھتا نہیں۔ وہ تو اپنے کاغذوں میں لگے رہتے ہیں ان کو میری تو کچھ بھی فکر نہیں۔ میری فکر نہ سہی گھر کی فکر تو کرتے۔ گھر گھر کو بھی انھوں نے ایسا چھوڑ دیا ہے جیسے کوئی تعلق ہی نہیں ۔۔۔ رات دن الگ کوٹھری میں بیٹھے رہتے ہیں اور کاغذوں کو سیاہی سے رنگا کرتے ہیں۔ صبح کے لئے آٹا نہیں۔ دال نہیں۔ لکڑی نہیں۔ کوئی کھانے کا سامان نہیں۔ اور دیکھ اس پلنگ پر۔ نہ معلوم کتنے دنوں کے میلے کپڑے پڑے ہیں! ۔ اگر ان کپڑوں کو کوئی دیکھے تو ہمیں کیا سمجھے۔ کوئی؟ ۔ چار؟ اور کیا! ۔ دھوبی روز آ کر لوٹ جاتا ہے مگر ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ دو تین قمیصیں درزی سے سلوا لو۔ مگر کہہ دیتے ہیں۔ کہیں ہے روپیہ تو آنے دو۔ "آنے دو" "آنے دو" ہمیشہ ان کے موتھ سے سُن لو مگر کہیں سے ایک کوڑی بھی آتی دکھائی نہیں دیتی۔ جب تک کوئی کام لگ کر نہیں کریں گے۔ روپیہ کیسے آوے گا۔ ان کاغذوں کو رنگ کر تو آنے سے رہا۔ سچ کہتی ہوں کنتی۔ میں اب کی مرتبہ جب گھر سے آئی تھی تو ماں سے سو روپیہ لائی تھی سب کے سب اس گھر کے خرچ میں صرف کر دئے۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں میں تو کل ہی صبح اپنی ماں کے پاس چلی جاؤں گی۔ پھر چاہے اس گھر کا کچھ بھی ہو۔ ماں کے گھر کا سا سکھ مجھے یہاں نہیں ملتا ہے۔ ہاتھ میں پیسہ رہنے سے سب سکھ آ جاتے ہیں۔ یہاں تو مہینہ مہینہ بھر ہو جاتا ہے اور پیسہ کی شکل نہیں دکھائی دیتی۔ کاش میں اس گھر میں نہ آتی۔

کنتی: (چونک کر) بہوجی ایسا کیسے کہہ سکتی ہو۔

شری: کہہ سکتی ہوں۔ کاش میں اس گھر میں نہ آتی۔

کنتی :- یہ تمھارے منھ سے اچھا نہیں لگتا بھوجی! اس طرح سے کہیں بدشگونی کے الفاظ منھ سے نکالا کرتے ہیں۔

(دیوے کی لَو اور کم ہو جاتی ہے۔ کنتی اور بتی کِھسکا دیتی ہے)

شری :- کیسے نہ کہوں کنتی۔ اگر تو میری جگہ ہوتی تو ساری حقیقت معلوم ہوتی۔ اگر تو میری ماں کی گود میں پلی ہوتی۔ ایسے عیش و آرام میں پرورش پاتی جیسے کہ میں نے، تو تجھے معلوم ہوتا کہ دولت کے گھر کو چھوڑ کر مفلس گھر میں رہنا کیسا ہوتا ہے! یہ میں ہی ہوں کہ اتنے دنوں آج تک نہیں گئی۔ کوئی اور ہوتی تو کبھی کی چلی جاتی۔

کنتی :- بھوجی! - (دیوے کی روشنی پھر کم ہو رہی ہے)

شری :- ہاں، ٹھیک کہتی ہوں۔ دوسری ہوتی تو اس گھر میں لات مار کر چلی گئی ہوتی۔

کنتی :- اسے اپنے پتی کا کچھ خیال نہ ہوتا؟

شری :- خیال کیا ہوتا جب اس کا پتی اس کا کچھ خیال نہ کرتا تو وہ اس کا کیوں خیال کرتی؟

کنتی :- اور اگر اس کا پتی اس کا بہت خیال کرتا تو بھی اسے چھوڑ کر چلی جاتی؟

شری :- شاید۔ ورنہ یہاں رہنا اس کے لئے مرنے ہی کے مانند ہوتا۔

کنتی :- تو کل تم سچ مچ اپنی ماں کے گھر جا رہی ہو؟ -

شری :- ہاں، سچ نہیں تو کیا جھوٹ؟

کنتی :- اور اگر سرن بابو تمھیں روکیں؟

شری :- تو بھی نہ رکوں گی۔

کنتی :- رُک جانا۔

شری :- نہیں۔

کنتی :- کوئی اپنے پتی سے ناراض ہو کر بھی جاتا ہے، بھوجی اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ وہ تمھاری بڑی فکر کرتے ہیں بھوجی۔ تم سے بہت پریم کرتے ہیں۔

شری :- ہاں، دیکھ رہی ہوں۔ مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں دیکھ رہی ہوں جیسا وہ مجھ سے پریم کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ خیال کر یہ سب ان کے پریم کا ہی نتیجہ ہے گھر میں چراغ تک نہیں۔ ابھی تک گھر میں نہیں آئے۔ کچھ فکر نہیں کہ گھر کے واسطے کچھ سامان آوے گا کہ نہیں۔ چولھے پر کھچڑی پکی رکھی ہے۔ چولھے کا ایک ایک کوئلہ بجھ گیا ہے۔ کھچڑی ٹھنڈی ہو گئی — یہ بھی خیال نہیں کیا ان کی وجہ سے کوئی اور بھی بھوکا بیٹھا ہوگا۔ ایسا ہی پریم وہ مجھ سے کرتے ہیں۔ میں تو کل اپنی ماں کے پاس جاؤں گی، تو مجھے پہونچا آوے گی۔

کنتی :- (دیوے کی طرف دیکھ کر۔ اچھا رہنے دو۔ تیل کے لئے مجھے پیسے دیدو تیل لے آؤں۔

شری :- پیسے ہیں تو سہی۔ مگر نہیں۔ آج گھر میں اندھیرا ہی رہنے دے۔ میں پیسے نہ دوں گی۔ کہاں تک دوں۔ جب خود آکر دیکھیں گے کہ گھر میں اندھیرا ہے تو خود فکر ہوگی۔ آج گھر میں اندھیرا ہی رہنے دے۔

کنتی :- اندھیرا گھر میں نہیں رہنا چاہئے۔ اندھیرا اچھا نہیں ہوتا۔

شری :- اپنے اچھے برے کو اپنے پاس ہی رکھ کنتی۔ آج مجھے اچھا برا کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔ کل مجھے ماں کے پاس پہونچا آوے گی نا؟

کنتی :- بھوجی پھر کبھی ماں کے پاس چلی جانا۔ انھوں نے تمھیں بلایا تو نہیں ہے۔

شری :- بلایا نہیں تو کیا ہوا۔

کنتی :- بغیر بلائے کوئی ماں کے گھر جاتا ہے؟ ایسا کرنے میں سسرال کی ناک کٹتی ہے!

شری :- سسرال کی ناک کٹتی ہے تو کٹنے دے۔ میں کس سسرال کی فکر کروں۔ اس کی۔ اونھ۔ میں تو کبھی فکر نہ کروں گی۔ یہ سسرال تو میرے گھر کی دھول بھی نہیں ہے۔ کنتی۔ میں تجھ سے کہے دیتی ہوں کسی سے مت کہیو۔ ماں میرے نام ساری زمینداری کر دیگی! - (گھمنڈ سے فرش میں لات مارتی ہے) مجھے یہاں کی کیا فکر میرے پاس زمینداری ہے کنتی؟ - میں اکیلی بھی رہ سکتی ہوں! -

کنتی :- بھوجی — !! (دیا بجھ گیا۔ گھر میں اندھیرا ہو گیا) کتنا برا لگتا ہے یہ اندھیرا بھوجی — بھوجی اپنا ارادہ بدل دو!

شری :- (لاپرواہی سے) اونھ۔

(دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دیتی ہے)

کنتی :- سرن بابو آ گئے ہیں بھوجی۔ اچھا میں صبح آؤں گی۔

شری :- میں تیرے ساتھ چلوں گی!

(کنتی چلی جاتی ہے اور شری کا شوہر سرن آتا ہے)

سرن :- گھر میں چراغ نہ جلایا۔ کیوں۔ آخ! یہ اندھیرا کیسا ہے شری۔ شری۔ شری کہاں گئی؟ - شری! - ارے گھر میں کوئی بھی نہیں - شری! - کنتی! - او کنتی! - کیا کوئی بھی نہیں گھر میں؟

کنتی :- آکر — کیا ہے بابوجی -

سرن :- ارے، شری کہاں گئی؟ - اور اندھیرا کیوں ہے؟ اپنا چراغ لاؤ ذرا۔ اندھیرے میں بیٹھنے سے جی گھٹتا ہے۔

(کنتی چراغ لاتی ہے اور شری چارپائی پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔ کنتی اور سرن دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ کنتی دیا رکھ کر چلی جاتی ہے)

سرن :- تم یہاں پڑی ہو۔ میں نے اتنی آوازیں دیں اور تم نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ سادھنے میں تو بڑی مہارت حاصل کر لی ہے!

(شری پلنگ پر کروٹ سے پڑی ہے۔ سرن اس کے قریب جاتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے "اوہو! مسٹر شری ٹس سے مس نہیں ہوتی ہے۔ سرن چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور شری کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے)

شری :- اوہو گویا اب بولو گی ہی نا!

سرن :- ہاں، اب نہ بولوں گی!

شری :- پکا ارادہ کر لیا ہے؟ (ہاتھ جھٹک دیتی ہے)

سرن :- اوپری دل سے کہہ رہی ہو یا سچے دل سے؟

شری :- اوپری دل سے۔ میں اوپری دل سے کوئی بات نہیں کہتی میرے دل میں جو بات ہوتی ہے وہی کہتی ہوں!

سرن :- مجھے اس طرح ستانے میں تمھیں خاص مزہ آتا ہے۔

شری :- تمھیں بھی مجھے ستانے میں خاص مزہ آتا ہے۔

(خود کو سرن سے چھڑا لیتی ہے)

سرن :- شری۔ شری۔ کہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ کہو میں یہ سب دل سے نہیں کہہ رہی تھی ورنہ!

شری :- میں کیسے اپنے آپ سے جھوٹ بولوں۔

سرن :- تو کیا یہ سب حقیقت ہے؟ تم در اصل ایسا ہی کہہ رہی ہو سچ بتاؤ شری۔ تم نے کبھی مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی آج یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اپنے دل کی بات؟ سچ بتاؤ۔

تمھارے ایسا کہنے سے نہ معلوم کیا کیا خیال میرے دل میں آرہے ہیں۔ تم جانتی ہو۔ میں — ؟

شری :۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ صرف یہی جانتی ہوں کہ تم نے بہت پریشان کر رکھا ہے میں اب اس گھر میں رہ چکی!

سرن :۔ تم جانتی ہو کہ تم سے میں کتنا پریم کرتا ہوں!

شری :۔ (جل بھن کر) ہاں جانتی ہوں۔ خوب اچھی طرح سے یہ سب آپ کا پریم ہو رہا ہے!

سرن :۔ اور کیسے پریم ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتیں، میرا دل تو جانتا ہے کہ ۔

شری :۔ بس بس!

سرن :۔ ایک دفعہ اپنے منھ سے کہہ دو کہ یہ باتیں تم نے اپنے دل سے نہیں کہی تھیں۔ کہہ دو ایک بار کہ یہ الفاظ میرے دل کے نہ تھے کہہ دو ایک مرتبہ ورنہ ۔

شری :۔ (چڑھ کر) ورنہ کیا؟

سرن :۔ ورنہ کیا؟ تم نہیں جانتیں۔ اگر ایک شخص کسی سے بہت محبت کرتا ہو اور دوسرا اس کی محبت کو جھوٹی بتائے۔ تو کیا ہو؟ ۔ یہ تم نہیں جانتیں؟

شری :۔ مجھے جاننے کی ضرورت نہیں۔

سرن :۔ کیونکہ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ اگر تم مجھ سے ایسی ہی محبت کرتیں جیسے کہ میں تم سے کرتا ہوں تو تمھیں معلوم ہو جاتا! میں جانتی ہوں تمھاری خفگی کا باعث۔ مگر تم کو اس طرح کی زندگی میں آنند مل سکتا ہو؟

شری :۔ کس طرح کی زندگی میں!!

سرن :۔ تم سمجھتی ہو کہ دولت ہی پریم ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ اگر کوئی خاوند اپنی استری کو دولت و ثروت کی زندگی نہ دے سکا تو وہ اس سے پریم نہیں کرتا! ایسا خیال تم کرتی ہو!

شری :۔ مجھے کسی خاوند کی دولت کی ضرورت نہیں!

سرن :۔ یہ کیا؟

شری :۔ بس یہی۔

سرن :۔ تمھیں کسی خاوند کی دولت کی ضرورت نہیں!

شری :۔ پتا میرے نام اپنی زمینداری کر دیں گے!

سرن :۔ تو تمھیں اپنے خاوند کے پریم کی بھی ضرورت نہیں؟ (شری خاموش ہے) بولو اگر دولت کی ضرورت نہیں تو میری بھی ضرورت نہیں!

شری :۔ میں کل گھر جاؤں گی۔

سرن :۔ گھر کیوں جاؤ گی وہاں سے چٹھی آئی ہے؟

شری :۔ نہیں۔

سرن :۔ تو کیوں جاؤ گی۔ وہاں کوئی تقریب وغیرہ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے بلایا بھی نہیں ہے اور یہاں آجکل میرے پاس کوئی ہے بھی نہیں۔ نیلم نہ معلوم کب تک واپس آویگا! تم چلی جاؤ گی تو یہاں میں اکیلا رہ جاؤں گا۔

شری :۔ میں نے کنتی سے کہہ دیا ہے کہ وہ کل مجھے گھر پہنچا آوے کل ہی میں جاؤں گی!

سرن :۔ کیوں جاتی ہو۔ کوئی سبب بھی ہوتا؟

شری :۔ بس یونہی کہ وہاں جانے کو طبیعت چاہتی ہے ۔ اور کوئی سبب نہیں۔

سرن :۔ تو کل ہی کیوں؟ ۔ دو تین روز بعد اچھی طرح سے انتظام کر کے بھیج دوں گا۔ ایسے حال سے جاؤ گی تو تمھاری ماں۔ تمھارے باپ۔ تمھارے اور رشتہ دار

کیا کہیں گے! دو تین روز بعد میں ہی پہنچا آؤں گا!

شری :۔ میں کنتی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اور انتظام کس بات کا کرنا ہے۔ کسی قسم کی طیاری کرنے کی ضرورت نہیں ایسے ہی حال سے چلی جاؤں گی!

سرن :۔ کیوں؟

شری :۔ وہاں میرے لئے سب کچھ ہو جاوے گا۔

سرن :۔ یہاں کچھ نہیں ہو سکتا؟

شری :۔ اب تک کیا ہو گیا یہاں؟

سرن :۔ ذرا صبر سے کام لو۔ یہاں بھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور ہو جاوے گا۔ دو تین روز کا صبر کرو!

شری :۔ صبر کرنے کی کیا ضرورت ہے! (کنتی تیل لیکر آتی ہے)

سرن :۔ (کنتی سے) تیل لے آئی ایک دیا رسوئی گھر میں بھی جلا کر رکھ دے۔ پہلے اس دیئے کو جلا جا اور پھر وہ دیا جلا کر واپس آ جیو! (کنتی جاتی ہے) غصہ نہ کرو شری۔

شری :۔ کل صبح ہی مجھے یہاں سے چلی جانے دیجئے۔

سرن :۔ تم اپنے دل کا حال مجھ سے چھپائے ہوئے جا رہی ہو، اچھا تو پھر کب آؤ گی۔

شری :۔ آ جاؤں گی!

سرن :۔ اگر نہ آئیں۔

شری :۔ نہیں!

(شری سرن کے منھ کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ چونک سی جاتی ہے مگر خاموش رہتی ہے)

جب میں مرنے لگوں تو آخری وقت تو ضرور آ جانا۔

(شری وہاں سے جانے لگتی ہے) ذرا اور بیٹھو ——

آج تو اور میرے پاس بیٹھی رہو۔

شری :۔ آپ کے واسطے کھانا لینے جا رہی ہوں!

سرن :۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لے آنا۔ ہاں۔ ہاں اگر تم جانتی ہو میرا تمھارے اوپر کتنا حق ہے؟

شری :۔ تو؟

سرن :۔ اگر اپنے حق کو استعمال میں لاؤں!

شری :۔ اس سے کیا مطلب!

سرن :۔ اگر میں تمھیں زبردستی روک لوں۔ نہ جانے دوں۔

شری :۔ تو خواہ مخواہ کو آپ کی بات نیچی ہوگی۔

سرن :۔ تو نہ مانو گی،

شری :۔ نہیں!

سرن :۔ میں تمھیں نہ جانے دوں گا۔

شری :۔ میں یہاں اب نہ رک سکوں گی!

سرن :۔ میرا حق کہاں گیا۔ میں تمھارا پتی ہوں۔ تمھیں بُرے راستے سے بچانا میرا فرض ہے! میں تم کو بُرے راستہ پر نہ جانے دوں گا۔ تم گھر نہ جاؤ گی۔

شری :۔ اور کب تک میرے دل کو اس طرح دُکھاؤ گے، مجھے جانے دو!

سرن :۔ اور جب تم جانے کی بات کہتی ہو تو تمھیں معلوم نہیں کہ میرے دل پر کیا بیتتی ہے۔

شری :۔ تمھارے دل کو سکون ہوگا!

سرن :۔ میرے دل کی دُنیا اُجڑی جا رہی ہے کوئی شے جس کو میں حفاظت سے تاحیات اپنے ہی قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا نکل جا رہی ہے!

شری :۔ آپ اور زیادہ بات نہ کیجئے۔

(شری کے کانوں میں آواز ضرور آتی ہے۔ مگر سرت چادر سے منہ ڈھکنے کے علاوہ دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھتی بھی نہیں ہے! وہ اپنے کان دروازہ کی طرف لگائے رہتی ہے)

"شری - دروازہ تو کھولو - شری شری !!

کل تو تم نے یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے۔

کل صبح تو تم جانے بغیر مانوگی نہیں"۔

"شری ــــــ شری !!

آج آخری دفعہ تو کواڑ نہ بند کرو۔ آج ایکبار تو اور کواڑ کھول دو۔"

"شری!

آخری مرتبہ تو میرے دل کو نہ توڑو"۔

"اگر جانا ہے تو ڈر کر کیوں جا رہی ہو۔ ہنسی خوشی جاؤ۔

"شری!

کھولو کواڑ"

کب تک اپنے گھر دار رہوں۔ کواڑ کھلنے کا انتظار کرتا رہوں۔

"شری! شری !!

"شری !!!

"شری مجھے تم سے ابھی بہت کچھ کہنا ہے!"

شری :- بہت کچھ سن چکی ہوں!

سرن :- اچھا تو کچھ نہ سننا۔ میں تم سے کچھ کہوں گا بھی نہیں کواڑ تو کھول دو! اندر مجھے آجانے دو۔ رات بھر تو آرام سے سو لینے دو۔ پھر تو ساری زندگی راتیں تارے ہی گن کر کٹے گی! - پھر تو زندگی بے چینی و بیقراری میں گزرے گی۔ آج تو آخری رات آرام سے سو لینے دو!۔

شری :- جب میں یہاں سے چلی جاؤں تو گھر میں جگہ ہی جگہ ہو جاوے گی۔ خوب آرام سے سونا۔

سرن :- ہاں شری۔ جب تم یہاں سے چلی جاؤگی تو خوب آرام سے سوؤں گا!

(۴)

(کنتی اور سیوا کی جھونپڑی۔ جھونپڑی میں اندھیرا ہو گیا ہے کنتی دیا ہاتھ میں لے جھونپڑی میں گھستی ہے کہ اسکی ٹھوکر اسکے خاوند سیوا سے لگ جاتی ہے)

کنتی :- بیچ میں پڑگئے ہو۔ دروازہ ہی پر! یہ نہ سوچا کہ باہر سے میں آؤں گی، دروازہ پر کیسے پڑ جاؤں۔

سیوا :- ہاتھ میں دیا ہے۔ اتنی بڑی بڑی پر ماتمانے آنکھیں دی ہیں۔ تب بھی تمھیں سوجھائی نہیں دیتا آج تم نے بڑا پاپ کیا۔

کنتی :- پاپ؟

سیوا :- ہاں!

کنتی :- کیسے؟

سیوا :- تم اندھی ہوتیں تو تمھیں ایشور بھی معاف کر دیتا اب جب کہ تمھارے دو بڑی بڑی ہنستی آنکھیں ہیں۔ تب تو نہ وہ معاف کر سکتا ہے اور نہ میں!!

کنتی :- کیا ہوا تو!

سیوا :- تم نے اپنے پتی کے ٹھوکر ماری!

کنتی :- بڑا پاپ کیا؟

سیوا :- تم اپنے پاپ کو مذاق میں اڑا رہی ہو! پاپ کے اوپر پاپ۔ گناہ کے اوپر گناہ!!

تم اپنے گناہ کو مانو ــــ ورنہ ــــ ورنہ

کنتی :- ورنہ کیا۔

سیوا :- ورنہ۔ ایشور خیر کرے!

کنتی :- کیا خیر کرے!

سیوا :- ہماری اور تمھاری زندگی۔

کنتی :- اونھ۔

سیوا :- برباد ہو جاوے گی!

کنتی :- تم اپنی سنجیدگی کو اپنے پاس ہی رکھا کرو۔

سیوا :- میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم تم علٰحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔

کنتی :- ہو ہی رہے ہیں! کل میں صبح شری بی بی جی کے ساتھ جاؤں گی۔

سیوا :- کہاں؟

کنتی :- ان کے گھر۔

سیوا :- گھر کیوں جا رہی ہیں!

کنتی :- سرن بابو سے ناراض ہو کر!

سیوا :- اوہ۔ زمانہ کیسا خراب ہے۔ آجکل سب عورتیں ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ تم میں بھی کچھ ایسی ہی عادت آ گئی ہے۔ تو تم کیوں ان کے ساتھ جا رہی ہو!

کنتی :- ان کو پہونچانے؟

سیوا :- یعنی تمھیں ان دونوں کی زندگی برباد کرنے والی بنوگی۔ تمھیں ان دونوں کو علٰحدہ کرنے جا رہی ہو!

کنتی :- میں نے تو ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر انھوں نے اپنا ارادہ بدلا ہی نہیں۔ وہ تو اپنی بات پر جمی ہیں!

سیوا :- جا کیوں رہی ہیں؟

کنتی :- اس لئے کہ ان کے ماں باپ ان کے نام اپنی زمینداری کر دیں گے!

سیوا :- ناراضگی کا زمینداری سے کیا تعلق! اور زمیندار[illegible] جانے سے کیا تعلق؟ عجیب معمہ ہے میں تو بالکل [illegible]

کنتی :- ناراض وہ اس لئے ہیں کہ یہاں غریبی میں زندگی کا[illegible] پڑتی ہے۔ وہاں ان کے واسطے سب کچھ ہونے[illegible] امید ہے۔ وہ اکیلی رہ سکتی ہیں

سیوا :- اکیلی!!

کنتی :- انھیں کے منہ کے یہ لفظ ہیں!

سیوا :- یعنی سرن بابو سے بالکل الگ!

کنتی :- اور کیا۔

سیوا :- اور تو ان کو بالکل الگ کرنے جا رہی ہے۔

کنتی :- اب تو وہ غصہ و غرور میں اندھی ہو رہی! جب ا[illegible] غصہ ٹھنڈا ہوگا تو ان کو واپس لانے کی کوشش [illegible]

سیوا :- تو جب تک وہ وہاں رہیں گی تب تک تم بھی مجھے [illegible] شکل نہ دکھاؤگی۔ اگر تم اس وقت ان کے ساتھ نہ [illegible] تو وہ کس کے ساتھ جاویں گی۔

کنتی :- تم اس وقت ان کی حالت دیکھو جا کر۔ ان کو اب [illegible] نہیں روک سکتا۔ اگر میں ان کے ساتھ نہ جاؤں تو [illegible] وہ جائے بغیر نہ مانیں گی!

سیوا :- اگر تم ان کو واپس نہ لائیں۔

کنتی :- ضرور لاؤں گی!

سیوا :- مجھے ڈر ہے کہ تم بھی کہیں اکیلی ہی رہنے کا ارادہ نہ [illegible] سب چاہتے ہیں کہ ہمارا جیسا ہر ایک ہو جاوے۔ ویسے بھی یہ تو چھوت کی بیماری ہے!

کنتی :- تو کیا مجھے بھی وہی بیماری لگ جائے گی۔

سیوا :- مجھے ڈر ہے! تم نے آج اپنے پتی کے ٹھوکر مار ہی دی۔

(۵)

(شری چادر اوڑھے پڑی ہے۔ گھنٹے کی آواز آتی ہے۔ بارہ بج گئے۔ شری نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ پھر آنکھ بند کر کے لیٹ جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کہتی ہے۔ "کاش میں اس گھر میں نہ آتی!"

"اوہ" کہکر وہ پھر کروٹ بدل لیتی ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کے لبوں سے آواز آتی ہے "جب میرے پاس سب کچھ ہے — مجھے کسی کی دولت کی ضرورت نہیں!۔ مگر ان کا پریم!" وہ ایکدم پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے حیرانی سے چاروں طرف دیکھتی ہے، پھر لیٹ جاتی ہے۔

دو کا گھنٹہ سنائی دیا۔ وہ ایک دم پلنگ سے اچھل پڑی، وہ چاروں طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگتی ہے۔ "کیسی آواز" — وہ پلنگ پر سے اٹھ جاتی ہے اور فرش پر ٹہلنے لگتی ہے۔ کرہ کی ایک کھڑکی بند کر دیتی ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے! پھر جدا سا باتیں سا ئیں کر رہی ہے! اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! وہ پھر پلنگ پر لیٹ جاتی ہے، نیند کا جھونکا اس کے آتا ہے۔ آنکھ جھپکتی ہے کہ اسے خیال آتا ہے "میں برے راستے پر جا رہی ہوں" دفعتہً اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ وہ ایکدم پلنگ سے کھڑی ہو جاتی ہے لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ اس کا خیال ہی خیال تھا وہ کرہ میں چاروں طرف گھومنے لگتی ہے۔ دروازے کے کواڑوں کو چھوتی ہے۔ اس کی کنڈی دیکھتی ہے اور بیٹھ جاتی ہے وہ بار بار اپنے سر کو ہلاتی ہے۔ جیسے کہ کسی کے سر کے چاروں طرف گھنٹیاں جھنجھناتی ہوں اور وہ ان کو اپنے سے دور رکھنے کے لئے سر ہلاتا ہو! — وہ دروازہ کی طرف جا لگتی ہے۔ کواڑوں کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگتی ہے۔ ایک دم وہ چونک پڑتی ہے۔ ہوش میں آتی ہے۔ گھڑی چار کا گھنٹہ بجاتی ہے۔ شری کمرہ کی کھڑکی کو کھول کر دیکھتی ہے۔ مشرق کی طرف ذرا ذرا سفیدی معلوم ہوتی ہے۔ وہ برابر کھڑکی کے باہر ہی دیکھتی رہتی ہے!)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(صبح کا وقت۔ ابھی پوری طور پر آفتاب طلوع نہیں ہوا ہے۔ شری اپنے کرہ میں جانے کا سامان ٹھیک کر رہی ہے۔ کنتی آتی ہے)

کنتی :- ارے بی بی جی آپ جاگ رہی ہیں!

شری :- آج میں سوئی ہی کب ہوں۔ تو سیوا سے پوچھ آئی۔

کنتی :- کیا؟

شری :- میرے ساتھ جانے کو۔

کنتی :- تو کیا ابھی تک تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔

شری :- نہیں۔

کنتی :- اب بھی بی بی جی وقت ہے!

شری :- کیسا وقت؟

کنتی :- سوچنے کا۔ سمجھنے کا۔ آگا پیچھا دیکھنے کا۔

شری :- بہت کچھ سوچ لیا۔ رات بھر تو اسی سوچ وچار میں گزار دی۔ رات بھر نہیں خیالوں نے چین نہ لینے دیا۔ لیکن اب یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے!

کنتی :- مگر اس کا انجام تو سوچ لو۔

شری :- اب کچھ نہیں سوچتی کنتی! مجھ میں اب سوچنے کی طاقت بالکل نہیں رہی — آج رات تو دروازہ پیٹنے کے علاوہ مجھ سے اور کچھ نہ بنا۔ اگر اسوقت دروازہ کھل جاتا تو معلوم اب تک کہاں پہونچ گئی ہوتی۔ اب میں زیادہ نہ ٹھہروں گی اب میں یہاں نہ رکوں گی۔ تو جلدی سے طیار ہو جا۔

کنتی :- سرن بابو کہاں ہیں!

شری :- اپنے پڑھنے لکھنے کے کرہ میں سو رہے ہوں گے۔

کنتی :- تم ان سے مل آئیں!

شری :- ان کے پاس اب نہ جاؤں گی! میں کیسے جاؤں! پاؤں نہیں اٹھتے (آواز بھرانے لگتی ہے) منھ نہیں پڑتا! — اور اب میں ان کے پاس جاؤں گی بھی نہیں پھر ان کے سامنے جا کر ان باتوں کا خیال آوے گا۔ ان کے حق تلفی کا خیال مجھے ستائے گا

کنتی :- (جاتی ہوئی) بہتر ہے۔

دوسرا سین

(ایک کرہ جس کے ایک کونہ میں ٹوٹی پھوٹی میز کرسی ہے۔ میز کے اوپر کاغذوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ بہت سے کاغذ بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں۔ میز کے دو طرف الماریاں ہیں جن میں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

سرن ان کتابوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ان کتابوں پر سے نظر ہٹا کر وہ ان کاغذوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے ان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے پھر بے چین ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سیوا کمرہ کے اندر داخل ہوتا ہے — سرن کا سلسلہ خیال ٹوٹ جاتا ہے ایک نظر سیوا پر ڈال کر وہ میز کی طرف جاتا ہے اور بے ترتیبی سے سامنے کاغذوں کی گڈی سی بناتا ہے گڈی بناتے ہوئے اس نے سیوا سے پوچھا)

سرن :- کیا ہے سیوا۔

سیوا :- چلا آیا بابو جی آپ کو دیکھنے۔ آپ کو کسی کام کی ضرورت تو مجھ سے ......؟

سرن :- کسی کام کی ضرورت نہ پڑے گی۔ (کاغذوں کی گڈی ... ہوا) اگر پڑے گی تو۔

سیوا :- میں ہر وقت حاضر ہوں۔

سرن :- ہاں ویسے تو کنتی ہی سارا کام کر جاتی ہے! تمہیں دو مہینہ سے ایک بھی پیسہ نہ ملا؟

سیوا :- میں اس کے لئے نہیں آیا ہوں بابو جی۔ آپ اس بات کی ذرا بھی فکر نہ کیجئے۔ جب آپ کے پاس ہوں گے آپ دے دیں گے ہمیں تو آپ کی تکلیف کی فکر ہے۔

سرن :- تم۔ (درد بھری ہنسی ہنستا ہے) جس کے اوپر میرا کوئی حق نہیں وہ میری فکر کرے! اور جس کے اوپر میرا سب کچھ حق ہے اپنے مطلب کے سوا اور کچھ نہ سوچے۔ اچھا تمہارا کیسے شکریہ ادا کروں! سیوا مجھے کوئی تکلیف نہیں!

سیوا :- آپ اکیلے نہ رہا کیجئے بابو جی۔ اکیلے میں برے برے خیالات دماغ میں آتے ہیں۔

سرن :- ہاں بھی اور کیا ہے! آج ساری رات —

سیوا :- آپ سوئے نہیں؟ — آپ کی آنکھیں — !

سرن :- کچھ نہیں سیوا! دل کی باتوں کو لبوں پر لانا [illegible] پھر کیا ہے!

(بہت سے کاغذ وہ انگیٹھی میں ڈالتا ہے اور اس میں سے آگ لگا دیتا ہے۔ کاغذ ایکدم جل اٹھتے ہیں)

سیوا :- آگ کیا کریں گے بابو جی؟

(سرن کاغذ کی گڈی کو آگ میں ڈالتے جاتا ہے)

کیا کرنے جا رہے ہیں آپ۔

سرن :- ایک دُنیا کو جلا کر دوسری دُنیا آباد کرنے!

سیوا :- آپ ان کو نہ جلائیے۔

سرن :- بغیر جلائے اب کام نہ چلے گا۔ بہت رہ لیا اس دُنیا میں۔ اب دوسری دُنیا میں رہنا چاہتا ہوں، وہ دُنیا جہاں کہ ہم تم شری سب رہتے ہیں۔ اُجڑی ہوئی ہے اس دُنیا کی خوشی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ میں ان کی ذرا بھی فکر نہیں کرتا ان سے ذرا بھی پریم نہیں کرتا۔ وہ نہیں جانتیں کہ میں ان سے کتنا پریم کرتا ہوں وہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ جب وہ مجھ سے جدا ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو میرے دل پر کیا گزر جاتی ہے! — اب میں ان کاغذوں کو جلا کر اپنی اصلی دنیا میں رہنے لگوں گا۔

سیوا :- آپ ان کاغذوں کو بہت سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے!

سرن :- ہاں، ان کو دل سے لگا کر رکھتا تھا۔ ان کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ مگر اب ان کو اپنے پاس رکھنے کی کوئی امید نہیں۔ اب میں رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ جتنی جلد یہ میری آنکھوں کے سامنے خاک ہو جائیں اچھا ہے! — تم دیکھتے تھے سیوا میں زیادہ تر اسی کمرہ میں بیٹھا رہتا تھا یہیں، اسی کرسی پر، اسی میز کے سہارے، یہیں دیواروں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ مجھ سے گفتگو کرتی ہوئی معلوم دیتی تھیں! —

سیوا :- یہ وہی کاغذ ہیں جن میں آپ کے ----

سرن :- ہاں میرے افسانے قلمبند ہیں!

سیوا :- تو آپ ان کو نیست و نابود کرنے کیوں جا رہے ہیں۔ آپ تو ان کو دل سے لگا کر رکھنا چاہتے تھا۔

سرن :- چاہتا تھا کہ ان کو دل سے لگا کر رکھوں۔

سیوا :- تو آپ ان کو جلائیے ؟ — میں ان کو جلانے نہ دوں گا!

سرن :- نہیں بھائی ان افسانوں کو اب آگ ہی میں ڈالنا ہے۔ اور آج ہی۔ ورنہ زندگی اور تلخ ہو جاویگی!

سیوا :- زندگی اور تلخ ہو جاویگی! یہ کیسے ؟

سرن :- ہاں، ان سے اب اور زیادہ زندگی تلخ ہو جائے گی پہلے میں سمجھتا تھا کہ دل کے بہلانے کا یہ اچھا مشغلہ ہے! شاید ان کو جلا کر میں شری کو خوش کر سکوں گا، ان میں محو رہکر میں شری سے محبت نہیں کر سکتا!

سیوا :- بی بی جی سے ؟

سرن :- میں ان کے لئے کچھ نہیں سکتا!

سیوا :- کیا۔

سرن :- میں نے شری کو اکیلا رہنے کے لئے چھوڑ دیا ہے!

سیوا :- کیوں ؟

سرن :- ان کو کسی کی دولت کی ضرورت نہیں!

سیوا :- کیا سچ ہے ؟

سرن :- ان کے پاس ماں باپ کی زمینداری ہے!

سیوا :- کیا وہ ایسا خیال کرتی ہیں!

سرن :- ان کے اوپر میرا کوئی حق نہ رہا!

سیوا :- ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا!

سرن :- ان کو میری ضرورت ہی نہیں رہی!

سیوا :- !!

سرن :- شری ایسا ہی خیال کرتی ہے۔ ان کے دل میں کل ایسے ہی خیال بھرے تھے۔ ایسا ان کو کبھی نہ سوچنا چاہئے تھا۔ ایسا سوچنا کے

لئے پاپ ہے! گناہ ہے۔ ہائے زمانہ۔ زمانہ ہی کا کھوٹ ہے بابو جی۔ ایسی ہی ہوا ساری دُنیا میں چلی ہے۔ وہ شاید غرور و غصہ میں اندھی ہو رہی ہیں۔

سرن :- اندھی! — ہاں ہوں گی مجھے کیا معلوم۔

سیوا :- اندھے کو اگر ایک بار ٹھوکر لگتی ہے تو وہ گرتا ہی چلا جاتا ہے!

سرن :- (کچھ دیر سوچ کر) مگر وہ گرنے سے بچ سکتی ہیں!

سیوا :- بچ سکتی ہیں ؟

سرن :- مجھے یقین ہے میں ان کو بچا سکتا ہوں! — ان کو راہ پر لا سکتا ہوں! — میں سمجھتا ہوں وہ آجکل اپنے بس میں نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا نہ کرتیں۔ — تم یہیں رہنا سیوا۔

(دروازہ پر جاتا ہے)

سیوا :- آپ کہاں جا رہے ہیں۔

سرن :- (دروازہ پر سے) تم یہیں رہنا۔

سیوا :- آپ کہاں جا رہے ہیں!

سرن :- شری کے پاس جا رہا ہوں۔

سیوا :- وہ آپ کو نہ ملیں گی!

سرن :- کیا ابھی تک ان کے کمرہ کے دروازہ کے کواڑ بند ہیں۔

سیوا :- آپ کس کے پاس جا رہے ہیں۔ شری بی بی تو کبھی کی یہاں سے گئیں۔

سرن :- (کمرہ کے اندر آ کر) شری گئی! شری اس طرح نہیں جا سکتی

سیوا :- وہ کشتی کے ساتھ گئیں۔ کشتی اور وہ دونوں کبھی کی چلی گئیں۔

سرن :- شری گئی!

سیوا :- سوچ نہ کرئے۔

سرن :- مجھ سے مل کر بھی نہیں گئی! شری شری تجھے کیا ہو گیا

(سرن کرسی میں نڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چاروں طر[ف] سکوت کا عالم ہے۔ باہر کمرہ کے کسی کے جوتوں کی آواز آ[تی] ہے۔ "سرن بابو ہیں")

سرن :- کون ہے ؟

سیوا :- ایک شخص آپ کو پوچھتا ہے!

سرن :- آنے دو۔

(دیال اندر آتا ہے)

دیال :- آداب عرض ہے سرن بابو۔

سرن :- آداب عرض۔ تشریف لائیے، میری کتاب کا کیا ہوا اگر نہ چھپی ہو۔

دیال :- ہاں ؟

سرن :- تو اسے جلا ڈالئے!

دیال :- جلا ڈالئے کیوں ؟ — ایسی کتاب کیا روز روز لکھی جاتی [ہے] وہ تو چھاپے خانے میں پہونچ چکی ہے اور غالباً دو چار د[ن] میں شایع ہو جائے گی — اس کتاب کا میں روپیہ دینے آیا ہوں!

سرن :- اب کچھ ضرورت نہیں۔

سیوا :- لے لیجئے بابو جی۔

سرن :- کس کے لئے لوں ؟

سیوا :- شاید شری بی بی واپس آ جائیں۔

سرن :- ان کو واپس لانے کی امید ہے ؟

(روپیہ لیتا ہے اور رسید لکھ کر دیتا ہے)

کتنی دیر ہوئی ان دونوں کو یہاں سے گئے۔

سیوا : سمجھا کوئی تیس چالیس منٹ ہوئے ہوں گے۔

سرن :- تو کیا اسٹیشن پر میں ان کو پکڑ سکتا ہوں ؟ — اچھا معاف فرمائیے دیال بابو — اس وقت نہایت اہم کام سے اسٹیشن جا رہا ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔

(سرن جلدی سے کوٹ پہنتا ہے اور ننگے سر گھر سے باہر نکل جاتا ہے)

دیال :- کہاں گئے۔ آج ان کی عجیب حالت ہے۔

سیوا :- ہاں۔ کل رات سے بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔

(مکان کے اندر سے آواز آتی ہے "شری ! شری !" یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں ؟ گھر میں کوئی جواب نہیں)

دیال :- کاغذ کی گڈی کو دیکھ کر — یہ کیا ہے۔

سیوا :- سرن بابو آج اسے آگ میں جھونکنے جا رہے تھے۔

دیال :- اس کو میں لئے جاتا ہوں۔ ان سے کہہ دینا۔

تیسرا سین

(مکان کا صحن جس میں کئی عورتیں کھڑی ہیں)

ایک بڑھیا :- بھلا ایک عورت کا اپنے خاوند سے ایسا برتاؤ ہونا چاہئے روپیہ پیسہ آدمی کا جنم بھر ساتھ تھوڑے ہی دیتا ہے، اپنے آدمی کی مرتے وقت تک ضرورت پڑتی ہے، دولت کے گھمنڈ میں اپنے مالک کو چھوڑ کر جانا بڑی بدنصیبی ہے۔ اس کا آدمی تو بالکل گئو ہے !

دوسری :- میں بھی جب اپنے خاوند سے تنگ آجاتی ہوں تو ان سے کہتی ہوں کہ تمھیں ایک تنکا اٹھا کر نہ دوں گی۔ مگر بعد میں افسوس کرتی ہوں کہ میں نے کیوں ان کا دل دکھایا — مگر شری کا بیٹی تو بڑا ٹھیک ہے۔

بڑھیا :- وہ شری سے ہمیشہ پریم سے بولتا تھا مگر شری کا مزاج ہی بگڑا رہتا تھا۔

دوسری عورت :- آج سرن کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔

سیوا :- رات بھر ذرا نہیں سوئے۔ صبح میں ان کے کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ سر پر ہاتھ دھرے کھڑکی کی طرف تاک رہے ہیں جب انھوں نے میری طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر روتے رہے ہیں۔

بڑھیا :- سرن کو اب اکیلا نہ چھوڑنا۔ نہ جانے کیا دل میں آجائے۔

سیوا :- نا ماجی۔ میں ان کو اکیلا نہ چھوڑوں گا !

(دروازہ سے دو آدمی اندر آتے ہیں، ان کے پیچھے معلوم ہوتا ہے کہ تین چار آدمی اور ہیں جو کسی چیز کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالے لا رہے ہیں)

ایک آدمی :- ذرا دھیرے دھیرے لانا۔ چوکھٹ سے کسی کو ٹھوکر نہ لگ جاوے۔

(سب کی نگاہ ان آدمیوں کی طرف جاتی ہے وہ چارپائی پکڑے ہوئے سرن کو اندر لاتے ہیں اور صحن میں لٹا دیتے ہیں سیوا کے منہ سے نکل جاتا ہے "یہ تو سرن ہیں !" ارے یہ کیا ہوا۔ سرن بالکل بے ہوش پڑا ہے اس کے سر سے خون جاری ہے اور سارا بدن لہو سے رنگا ہوا ہے)

ایک آدمی :- تم ان کے کون ہو ؟

سیوا :- ہاں۔

آدمی :- ان کا یہاں کوئی اور نہیں ہے۔

سیوا :- ان کی پتنی شری آج ہی اسی گاڑی سے اپنے گھر چلی گئی ہیں۔

آدمی :- تو ان کے پاس اب کوئی نہیں !

بڑھیا :- ہم سب ہیں تو سرن کی دیکھ بھال کریں گے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ ہوا کیا۔

آدمی :- یہ اسٹیشن پر ریل میں کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ ریل نے پہلی سیٹی دی تو ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ان کی نگاہ یکایک ایک ڈبہ پر جا پڑی۔ یہ اس کی طرف دوڑے انھوں نے ایک عورت کو کاغذ دیا اور کچھ جلدی سے کہا "صرف پڑھ دو اتنا سنا کر جلدی کرو۔ گاڑی چھوٹنے والی ہے۔ اب تو سب کچھ ہو جاوے گا۔ تمھیں اسی کی فکر تھی۔ مگر اس عورت نے اس کاغذ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا میں نے دیکھا تو کسی بنک کا چک تھا۔

سیوا :- پھر ؟

آدمی :- یہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے، ٹھیائی ہوئی نگاہوں سے ریل کو دیکھ رہے تھے۔ ریل پلیٹ فارم سے نکلنے لگی جیسے ہی آخری ڈبہ نکلا انھوں نے اس کو پکڑ لیا۔ ریل تیز ہو چکی تھی۔ اس لئے گر پڑے اور یہ حال ہو گیا !

سیوا :- (بڑھیا سے) آپ ان کے بھائی کا تو پتہ جانتی ہیں !

بڑھیا :- ہاں۔ میں ابھی اسے بلواتی ہوں ! — تو شری کے پاس دوسری گاڑی سے جا اور اس اندھی سے کہہ کر اپنے پتی کی حالت آکر دیکھ لے۔

تیسرا ایکٹ

(پہلا سین)

(شیورانی، شری کی ماں جس کے سفید بال بتا رہے ہیں کہ دنیا میں وہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ ختم کر چکی ہے، بیٹھی ہوئی سوت کات رہی ہے اور کنکھیوں سے سب عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتی جاتی ہے۔ اس کی سنجیدہ نظر بتا رہی تھی کہ وہ لڑکیوں کے بچپنے کو سوں دور نکل گئی ہے)

لڑکیوں کی آواز :- کھی کھی کھی !

(بڑھیا نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتی ہے پھر اوڑھنی ٹھیک کر کے ہوتی ہے کہ اپنی دیورانی موتی کو آتی ہوئی دیکھتی ہے۔ عمر چالیس برس کے قریب ہوگی)

شیورانی :- کیا شرارت مچا رکھی ہے انھوں نے ؟

موتی :- اس بچاری کو تنگ کر رکھا ہے وہ تو اس مرتبہ بڑی سیدھی بن کر آئی ہے۔ کچھ بول ہی نہیں رہی ہے۔

شیورانی :- ابھی ابھی آئی ہے ! شرماتی ہوگی۔

(شری آتی ہے اور چپ چاپ اپنی ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

شیورانی :- تو وہاں سے کیوں چلی آئی ؟

شری :- یونہی، طبیعت نہیں لگی۔

(دو عورتیں اور آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں شری ان کی طرف دیکھتی ہے اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کنتی آتی ہے)

کنتی :- میں تلاش کر رہی تھی تمھیں !

عورت :- سرن بابو تو اچھے ہیں ؟

(شری کا منہ فق ہو جاتا ہے)

کنتی :- اچھے ہی ہیں !

دوسری :- شری تو آ ہی گئی۔ کیسے آنا ہوا۔

شری :- ویسے ہی چلی آئی۔

موتی :- سیوں کو دیکھنے کو دل چاہا ہوگا۔ آ گئی !

دوسری :- سرن بابو ساتھ نہیں آئے !

کنتی :- نہیں۔

(شری، کانتی کا ہاتھ پکڑ کر چلی جاتی ہے۔ سیل بھی ان کے

پیچھے ہو جاتی ہے)

دوسری :۔ کیوں نہیں آئے۔

کنتی :۔ نہیں۔ شری بی بی نے ایکدم یہاں آنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ نہ آسکے۔

شیورانی :۔ ان کو آنا چاہئے تھا ساتھ۔

کنتی :۔ شری بی بی مانی ہی نہیں۔

شیورانی :۔ شری مانی نہیں ؟ تو صاف صاف نہیں بتا رہی ہے۔

شری :۔ نہیں بی بی جی صاف تو کہہ رہی ہے۔

(شیورانی کنتی کو لیکر چلی جاتی ہے)

ایک :۔ کچھ دال میں کالا ضرور ہے! کنتی کہتے کہتے رک گئی!

دوسری :۔ معلوم کیا بھید ہے۔ شری کا اس طرح آنا اور سرجن کا ساتھ نہ آنا۔

ایک :۔ بڑی حیرت کی بات ہے، میں سنتی ہوں کہ شری کی سرجن سے نہیں بنتی!

دوسری :۔ تو نہ بننے پر سرجن سے الگ ہو آئی۔ ایسا کرنا تو ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ دنیا اسے کیا کہے گی ؟

ایک :۔ ارے آج کل تو ہر ناممکن ممکن ہو گیا ہے۔ دنیا کے کہنے کی کسے پروا ہے!

دوسری :۔ اس کی شکل ہی سے مجھے شک ہو گیا تھا۔ جب سرجن کا نام آیا تو اس نے منھ پھیر لیا۔

ایک :۔ شک تو مجھے بھی ہوتا ہے۔

(شیورانی اور کنتی آتی ہیں)

شیورانی :۔ (کنتی سے) تو نے تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکال دی۔ شری نے بہت برا کیا۔ دنیا کیا کہے گی۔

کنتی :۔ ان کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیجئے میں بھی ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔

(شری آتی ہے)

شری :۔ کیا ہے ماں۔

شیورانی :۔ میرے ساتھ آ۔

(شری اور شیورانی چلی جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد کنتی اور شری باتوں میں مصروف نظر آتی ہیں)

کنتی :۔ آج تنہائی کیوں پسند آرہی ہے!

شری :۔ سب اپنی اپنی باتوں میں لگی ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ تھی تو میں!

کنتی :۔ ان کے ساتھ تھیں ضرور مگر ان سبھوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

شری :۔ تجھے وہم ہے!

کنتی :۔ وہم نہیں بی بی جی مجھے۔ میں تمھارے دل کی بات جان جاتی ہوں۔ میں تمھیں اس طرح نہ رہنے دوں گی!

شری :۔ کیوں اکیلے رہنے میں کیا حرج ہے

کنتی :۔ اکیلے رہنے میں آپ اور اداس ہوں گی!

شری :۔ اداس کیوں۔ اداس ہونا ہوتا تو یہاں آتی کیوں۔

کنتی :۔ پھر منھ پر پھیکا پن کیوں ہے، ہونٹ کیوں بند ہیں۔ ضرور تم سوچتی رہتی ہو۔ میں بھانپ جاتی ہوں!

شری :۔ پھر وہی — کیا بھانپ لیا تو نے ؟

کنتی :۔ "تمھارے چہرہ کے رنگ کا آتار چڑھاؤ بتا رہا ہے کہ تم —"

شری :۔ کیا ؟

کنتی :۔ کہ تم کسی الجھن میں پھنسی ہوئی — کیوں ہے نا یہ بات۔

شری :۔ نہیں! —

کنتی :۔ میں مان نہیں سکتی — کیا سوچ رہی ہو۔

شری :۔ کچھ نہیں! — وہی!

کنتی :۔ کیا ؟

شری :۔ جب گاڑی چلدی تھی تو تو نے کھڑکی میں سے سر نکالکر دیکھا تھا۔

کنتی :۔ میں نے نہیں دیکھا۔ میں تو اسوقت تمھیں دیکھ رہی تھی!

شری :۔ مجھے کیوں دیکھ رہی تھی!

کنتی :۔ جب تم نے ان کا کاغذ پھینک دیا تو میں تکتی کی تکتی رہ گئی

شری :۔ اس وقت مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میرے دل میں تو ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ لیکن میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا تھا۔

کنتی :۔ "پھر ؟"

شری :۔ ایک آدمی کو بڑی جلدی سے ریل پر سوار ہوتے دیکھا اور وہ ایکدم گر پڑا۔

کنتی :۔ تو کیا تم یہ شک کر رہی ہو کہ وہ سرجن بابو تھے۔

شری :۔ نہیں نہیں یہ شک نہیں! — مگر۔

(آہٹ سنائی دیتی ہے اور پھر شمبھوناتھ شری کے والد کی آواز آتی ہے)

آواز :۔ راضی سے نہیں تو زبردستی!

(شری سٹپٹاتی ہوئی وہاں سے جاتی ہے کنتی بھی اسکے پیچھے ہو لیتی ہے اور دونوں درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو جاتے ہیں)

شمبھوناتھ :۔ ایسا تو کرنا ہی پڑیگا۔ اس کو یہاں سے فوراً واپس بھیجنا پڑیگا۔ اس کو واپس جانا ہی چاہئے!

شیورانی :۔ بلا کر اس سے کیا کہوں۔ وہ بیچاری پڑھی —

شمبھوناتھ :۔ اسے بلا کر کہو کہ یہاں سے کنتی کے ساتھ واپس چلی —

اللہ کیا کہوگی ایسے وقت کچھ اور خیال نہ کرنا چا —

اگر ذرا بھی اسے عقل ہے تو اتنا کہے پر وہ یہاں —

بھی نہ رکے گی!

(ملازم آتا ہے)

ملازم :۔ بابو جی! ایک آدمی آیا ہے ؟

شمبھوناتھ :۔ کون ہے!

ملازم :۔ وہ دروازہ پر کھڑا ہے!

شمبھوناتھ :۔ کہدو اس سے تھوڑی دیر میں آتے ہیں!

ملازم :۔ میں نے اس سے کہا۔ یہی مگر وہ بڑی جلدی میں معلـ —

ہوتا ہے۔ بڑی گھبراہٹ میں دو تین دفعہ تو اس —

اپنے ہاتھ سے خط اگر دیا جو اس کے پاس ہے! کہتا —

کہ اسوقت آپ سے ملاقات کرنی ہے۔ اسی وقت —

وموت کا سوال بتاتا ہے!

(شمبھوناتھ ملازم کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے —

شمبھوناتھ گھبرائے ہوئے آتے ہیں)

شمبھوناتھ :۔ ذرا اس خط کو تو سنو،

"سرجن بابو ریل سے گر پڑے ہیں۔ تمھیں کو واپس پہنچے

کے لئے وہ چلتی ہوئی ریل پر سوار ہو رہے تھے۔ اب

ان کی حالت اچھی نہیں ہے اگر کرم سے کم ان کی حالت

تو دیکھ لو۔

تمھاری پڑوسن —

مرلی"

شری اب کیا کرتا ہے ؟

(سب متعجب ہو کر شرتی کی طرف دیکھتے ہیں)

سرن بابو کا ملازم شیو آیا ہے — جاؤ شرتی!

(شرتی کچھ نہیں بولتی ہے اس کا رنگ ایکدم کافور ہو گیا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے پیر ڈگمگاتے ہیں۔ کنتی اس کو سنبھال لیتی ہے)

کنتی:- بی بی شرتی!

کانتی:- ارے یہ تو بیہوش ہوئی جاتی ہے!

(سب دوڑ کر اسے سنبھال لیتے ہیں)

ایکٹ چہارم

سین اول

(سرن کا کمرہ — سرن ایک چارپائی پر پڑا ہوا ہے اس کے سر اور جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ کبھی آنکھیں کھول لیتا ہے اور کبھی بند کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر سرن کے پاس کھڑا ہوا بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ نیلم بھی متفکرانہ انداز سے سرن کی طرف دیکھ رہا ہے)

نیلم:- ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر:- کچھ فکر کی بات نہیں!

دوسرا:- اگر تیس منٹ اور اسی طرح گزر جائیں تو خطرہ نہ رہیگا سرن بابو کو اس وقت اپنے دماغ پر ذرا بھی زور نہ دینا چاہئے۔

نیلم:- ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر:- سرن بابو کے کان میں تمہاری آواز نہ جانی چاہئے ورنہ وہ تمہاری آواز سنکر تم سے ضرور بولنے لگیں گے اور اس وقت ان کو ذرا بھی بولنا نہ چاہئے!

(دروازہ پر دستک کی آواز آتی ہے)

ڈاکٹر:- کمرہ میں کسی کو نہ آنا چاہئے!

نیلم:- کون ہے!

(نیلم جاتا ہے اور چند آدمی نظر آتے ہیں)

ایک:- کہو!

نیلم:- کیا کہوں، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر تیس منٹ ایسے ہی گزر جاویں تو شاید امید بندھے۔

پہلا:- مگر شرتی ایسی چوٹ دے گئی ہے!

دوسرا:- سرن کی شکل تو دیکھو!

تیسرا:- معلوم ہوتا ہے خیالات اب بھی پریشان کئے ہوئے ہیں۔

(نیلم اندر داخل ہوتا ہے)

ایک:- کون تھا۔

نیلم:- ایک پبلشر تھا۔

"کیوں آیا ہے"

نیلم:- کچھ روپیہ ادا کرنے آیا ہے۔

"روپئے!"

(سرن حرکت کرتا ہے)

سرن:- سرن سے نہ ملایا۔ تم نے لو روپیہ بعد میں ان کو دیدینا۔ نہیں! روپیہ اب مت لینا۔ اب کیا کروں گا، روپیہ کا ——— میں تو

"آپ بات نہ کیجئے، بولنا مہلک ہے"

سرن:- مت لینا روپیہ۔ کیا ہوگا۔ میں تو یہاں سے جا ہی رہا ہوں اور شرتی کو اب روپیہ کی ضرورت نہیں۔ اسے کسی کے روپیہ کی اب ضرورت نہیں اس کی زمینداری ہے، اس کے پاس دولت ہے۔ اس لئے

اسے اب میری دولت کی کیا ضرورت!

نیلم:- بھائی صاحب! — بمشکل تمام تو آپ کو ہوش آیا ہے پھر آپ اس قدر بولنے لگے!

سرن:- چپ رہا ہی نہیں جاتا۔ تم میرے پاس ہو تو جی چاہتا ہے اپنے دل کا حال تم سے کہوں۔ یہاں اور کون ہے جس سے کہوں تم سے بول لیتا ہوں۔ شرتی تو چلی ہی گئی!

نیلم:- جانے دیجئے، خواہ مخواہ آپ ان کو یاد کر کے اپنی پریشانی بڑھا رہے ہیں!

سرن:- اس کا خیال کیسے نہ آئے بھائی۔

نیلم:- جب آپ اچھے ہو جائیں تو مجھ سے جی بھر کر باتیں کیجئےگا

سرن:- مجھے شک ہے میں اچھا نہ ہو سکوں گا اور پھر مجھ کو تم سے جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔

نیلم:- اچھا کسی اور وقت آپ سے بات کروں گا۔

سرن:- جاتے کہاں ہو!

نیلم:- باہر۔

سرن:- روپیہ نہ لینا۔ کیا ہوگا اب۔ میں جا ہی رہا ہوں۔ شرتی چلی ہی گئی ہے۔ اس کو کسی کی دولت کی ضرورت نہیں اس کو تو میری بھی ضرورت نہیں، اگر ٹھہرو۔ روپیہ لیلو۔ آہ — شاید بعد میں شرتی کے کام آوے! دولت گھٹتا کی طرح آتی جاتی رہتی ہے! — شاید اس کے کام آجائے

نیلم:- خدا کے لئے شرتی کا ذکر نہ کیجئے۔

سرن:- مگر آج تو شرتی کی یاد اور زیادہ آرہی ہے۔ شرتی! اب آخری وقت ہے نیلم! جب کوئی دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو دنیا کی تمام چیزوں کی طرف حسرت سے نگاہ

سے دیکھتا ہے۔

نیلم:- تو کیا ہوا۔

سرن:- تو پھر شرتی کی یاد کیوں نہ ستائے۔ اس کو تو میں بچپن سے پیار کرتا آیا ہوں۔ اس کو میں کس طرح سے بھول جاؤں، اگر وہ تو میرے پاس سے چلی گئی ہے اب کیا

نیلم:- ان کو بلانے بھیجا ہے۔

سرن:- ان کو بلانے بھیجا ہے! کیوں؟ کیا ان کو بھی میرے کی خبر کر دی۔

نیلم:- ہاں! — حرج کیا ہے!

سرن:- مرنے کے بعد اگر خبر ہوتی تو اچھا ہوتا! ہاں، اور کیا شاید میں شرتی کو نہ دیکھ سکوں گا!

نیلم:- آپ دیکھ سکیں گے — آپ تو اچھے ہو رہے ہیں!

ڈاکٹر:- یہ کیا ہو رہا ہے، ان کو خاموش رہنا چاہئے، بالکل ورنہ سارے ٹانکے ٹوٹ جائیں گے۔

سرن:- اگر شرتی میرے بعد۔

نیلم:- چپ رہئے بھائی۔

سرن:- کیسے چپ رہوں۔ مرنے والے انسان کو اپنی خواہش تو ظاہر کر لینے دو۔

نیلم:- آپ چپ رہئے۔ آپ تو اچھے ہو رہے ہیں۔

سرن:- اگر شرتی۔

نیلم:- پھر شرتی! آپ شرتی سے ملنا چاہتے ہیں؟

سرن:- کہاں ہے وہ؟

نیلم:- آپ خاموش رہئے۔

سرن:- اگر شرتی میرے بعد میں آئے تو اس کو یہ روپیہ اور ہوٹل کا چیک بھی دیدینا۔ شاید خوش ہو کر وہ مجھے

اس جنم میں ملنے کی خواہش کرسکے میرے بغیر کیا وہ رہ سکے گی
(دروازہ پر دستک کی آواز) کیا وہ اکیلی رہ سکے گی؟

(نیلم جاتا ہے)

باہر سے آواز:۔ شری بی بی آگئیں!

سرن :۔ شری! شری آگئی۔ شری آگئی! شری۔
(سب ایک دوسرے کی منھ کی طرف تکتے ہیں)

سرن :۔ شری کو آنے دو! شری!
(دروازہ کھلتا ہے۔ نیلم داخل ہوتا ہے اور اس کے
پیچھے شری۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہے)

ڈاکٹر :۔ (نیلم سے شری کی طرف اشارہ کرتا ہوا) ان کو ابھی سرن بابو
کے پاس نہ آنے دیجئے۔

سرن :۔ وہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی!
(شری آگے بڑھتی ہے مگر نیلم اس کو روک لیتا ہے)

سرن :۔ کہاں رک گئی۔ شری کو آنے دو!

نیلم :۔ شری کہاں ہے؟ شری آتی ہوں گی۔ آپ خاموش
لیٹے رہیں۔

شری آگئی؟ میرے کان دھوکا نہیں دیسکتے میں نے
صاف سنا کہ شری آگئی!

(اٹھنے کی کوشش کرتا ہے ڈاکٹر اور نیلم اسکو پکڑ لیتے ہیں)

نیلم :۔ کس کے پاس جاتے ہو۔ کوئی ہو بھی!

سرن :۔ مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ مگر میرا دل کبھی دھوکا
نہیں دے سکتا۔ اٹھنے دو مجھے! وہ ہے۔
(سرن اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

نیلم :۔ ہاں ہے مگر وہ ابھی نہیں آسکتیں!

سرن :۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی!

نیلم :۔ ہاں ہاں۔ مگر تم نہ اٹھو۔ ان کو تمھارے پاس ابھی
نہ آنا چاہئے۔

سرن :۔ مجھے اس کے پاس جانے دو۔ شاید آخری وقت ہی
مجھے خوش ہو سکے!

(شری گہری سانس لیتی ہے)

نیلم :۔ وہ یہیں آتی ہیں!

سرن :۔ وہ یہاں کیسے آئے گی!

نیلم :۔ کیوں۔

سرن :۔ اس کو میری ضرورت نہیں!
(شری سر دیوار سے ٹکراتی ہے)

سرن :۔ یہ تو شری کی آواز ہے۔ میرے کان کبھی دھوکا نہیں
دے سکتے۔

شری :۔ ہاں۔ تمھارا دل، تمھارے کان کبھی تمھیں دھوکا
نہیں دیتے۔ میرے کانوں نے میرے دل نے مجھے
دھوکا دیا!

سرن :۔ شری۔

(شری چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے)

سرن :۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اب کبھی نہ آؤ گی۔
(کنتی بھی آجاتی ہے)

کنتی :۔ سرن بابو یہ آپ نے کیا کیا۔

سرن :۔ کیا کرتا۔ جب دنیا بگڑتی ہوئی دیکھی تو خیال ہوا کہ
اس کو پھر بسانے کی کوشش کروں۔ مگر مجھے کیا
معلوم تھا کہ شری کو میری ضرورت نہیں تھی۔

کنتی :۔ آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ اگر یہ پسل جاوے گا تو کیا
حال ہوگا۔

سرن :۔ کنتی، میں کس کے لئے جینے کی فکر کرتا۔ کس کے لئے زندہ
رہنے کی تمنا ہوتی۔ میں اس وقت زندگی سے بالکل
بے پروا تھا۔

(کنتی شری کی طرف دیکھتی ہے۔ شری دوسری طرف
دیکھ رہی ہے)

سرن :۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ شری اپنے بس میں نہیں ہے،
اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اسکی آنکھوں
پر سے پٹی کھولنے کے لئے ریل پر سوار ہوا تھا۔۔۔۔
آخری وقت دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

(شری بت کی طرح بیٹھی ہوئی دوسری طرف دیکھ رہی
ہے۔ ماتھے پر شکنیں ہیں۔ کوئی مصمم ارادہ چہرے سے ظاہر
ہوتا ہے اور فوراً اٹھ کر چلی جاتی ہے)

ایکٹ چہارم

سین دوم

(شری تیزی سے اپنے کمرہ میں داخل ہوتی ہے جیسے کہ
ایک جہاز زمین میں دھنسنے کو جا رہا ہو وہ چاروں طرف
گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے وہی چراغ اب بھی
طاق میں رکھا ہوا ہے۔ وہ پلنگ پر جاکر بیٹھ جاتی ہے۔
"شری آگئی؟" شری حیرانی سے دروازہ کی طرف دیکھتی
ہے۔ اور کواڑ بند کر دیتی ہے)

عورت کی آواز :۔ کب آئی۔

کنتی کی آواز :۔ تھوڑی دیر ہوئی۔

(شری کان لگا کر سنتی ہے)

عورت :۔ شری اندھی تھی، اندھی۔

(شری اپنے کان دروازہ سے ہٹا لیتی ہے اور
تھوڑی خوشی کے بعد خود ہی بولتی ہے۔ بے شک میں
اندھی تھی۔

کنتی باہر سے شری کے کمرے کے دروازہ کو دونوں
کھٹکھٹاتی ہے)

"شری، شری!!"

(شری اندر ایک جگہ کھڑی ہوئی ہے)

"شری، شری!!"

(کنتی نے کواڑوں کو اور زور سے پیٹا۔ چٹخنی کھل گئی
اور کواڑ ایکدم کھل گئے۔ کنتی چلاتی ہوئی آئی۔

"شری، شری۔ سرن گئے!!"

شری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ شری کی
آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"شری، شری"۔ کنتی نے جھنجھوڑا۔

(شری ویسے ہی بت کی مانند کھڑی رہی گویا کوئی مصمم
ارادہ اس نے ابھی کر لیا ہے)

آخری سین

(سرن کا کتب خانہ۔ شری کے کمرہ میں چاروں طرف
بیقرارانہ ٹہل رہی ہے)

شری :۔ (آپ ہی آپ) میں نے سمجھا تھا تم یہاں ہو گے۔
مگر۔ مگر۔۔۔ تم تو آرام کی نیند سو گئے ہو۔

(دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز) شری! شری!!

آواز :۔ کواڑ کھولو۔

شری اپنا منھ دکھانے کو۔۔۔۔ آئیں!

(دروازہ پیٹنے کی آواز)

(دیشتی کا سین شری کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے)

سرن :- شری - شری !! — لو !

(شری سرن کو کراہت سے دیکھتی ہے)

سرن :- یہ لو - جس کو تم چاہ رہی تھیں وہ یہ لو (شری کی طرف چیک بڑھاتا ہوا) اب تو شاید تم سمجھو گی کہ میں تم سے پریم کرتا ہوں - اگر دولت ہی پریم کی کسوٹی ہو ؟

(شری کھڑکی میں سے چیک پھینک دیتی ہے اور دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے - گاڑی چلنے لگتی ہے)

سرن :- شری ! شری ! - تم غلطی پر ہو - تم بھول رہی ہو !

(شری کے سامنے سے وہ سین غائب ہو جاتا ہے)

شری :- (آپ ہی آپ) اس وقت تو مجھے سب کچھ سوجھ رہا تھا اس وقت میں اپنی بھول محسوس کر رہی تھی - مگر ! ا -

(شری، سرن کو چلتی گاڑی پر چڑھتا دیکھتی ہے - دوسرے لوگ اسے روکتے ہیں، مگر سرن نہیں مانتا - شری کھڑکی سے سر نکال کر دیکھتی ہے ! - اس کی گردن کھڑکی میں سے پار نکل آتی ہے اور سرن گرتا دکھائی دیتا ہے)

شری :- کھڑکی سے میں کیوں نہ کود پڑی - اندھی !

(وہی سین اس کی آنکھوں کے سامنے ہے)

کود پڑو کھڑکی سے کود پڑو - میں تمھارے پاس آتی ہوں (دروازہ پیٹنے کی زور سے آواز) میں تمھارے پاس آتی ہوں - شری بے خودی کی حالت میں کھڑکی میں سے کود پڑتی ہے - دروازہ ٹوٹ جاتا ہے کنتی، شیورانی وغیرہ کمرے کے اندر گھس آتی ہیں -

شیورانی :- شری - شری !

کنتی :- کہاں گئیں !

(کنتی کھڑکی میں سے جھانکتی ہے اور دیکھتے ہی ایک چیخ مارتی ہے)

کنتی :- دیکھو یہاں !

شمبھو :- کیا ہے ؟

(سب کھڑکی میں سے دیکھتے ہیں کہ شری زمین پر مردہ پڑی ہوئی ہے)

شنکر سروپ بھٹناگر

"نگار" کے پُرانے پرچے

۲۹ء جنوری ۱۲ر — ۳۰ء مئی ۱۰ر — ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸ر — اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر — ۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ر — مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ر — ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ر — ۳۳ء فروری، مارچ مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ ایک روپیہ — ۳۶ء دسمبر ۸ر — ۳۷ء مارچ تا جولائی فی پرچہ ۸ر — ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸ر — ۴۱ء مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) — ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر — اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر فی پرچہ ۸ر — ۴۳ء مئی ۱۲ر — ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر — ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ر فی پرچہ — ۴۵ء اپریل ۸ر — مئی ۱۰ر — جون، جولائی فی پرچہ ۸ر — اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر — ستمبر، اکتوبر، نومبر و دسمبر فی پرچہ ۱۲ر — (مکمل فائل ۴۶ء ...) — منیجر نگار، لکھنؤ

نانا میاں کی موٹریا

رات میں دو بجے جو پانی پینے کے لئے اٹھا تو دیکھا کہ ہمارے داروغہ جی روشنی جلائے بیٹھے ہیں - میں نے پوچھا "داروغہ جی کس فکر میں ہو ؟" کہنے لگے "میاں کھٹملوں نے سارا خون چوس لیا - انتظار میں ہوں کہ وہ دکھائی دیں تو میں بھی اپنا دستِ شفقت پھیروں" اس کے بعد کہنے لگے "تمھارے نانا میاں کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ یہی ہوا تھا ان کو جب معلوم ہوا کہ گھر میں کھٹمل ہو گئے ہیں انھوں نے راتوں رات گھر کو آگ لگوا دی - اللہ بخشے بڑے مزے کے آدمی تھے - میاں دُنیا تو ایک سگریٹ پیتی ہے" سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہنے لگے "ادھر گرمیاں آئیں اور انھوں نے ولایت سے سگریٹوں کا ایک ویگن منگوایا - دو چار پٹیاں سگریٹ ہم بھی اُڑا دیتے تھے - اگر گرمیوں کے گزرنے سے پہلے سگریٹ ختم نہ ہوئے تو بچے ہوئے سگریٹ لاٹ صاحب کی کوٹھی بھیج دئے اور برسات کے موسم والے سگریٹوں کا ویگن منگوا لیا" مجھے سوتا ہوا محسوس کر کے داروغہ جی کہنے لگے "اے میاں تم سو رہے ہو ؟" میں نے ذرا دبی ہوئی آواز میں کہا :-

"نہیں جاگ رہا ہوں"

"ہاں سو نا مت آج میں تم کو تمھاری چھوٹی نانی کا قصہ سُنانے والا ہوں"

"چھوٹی نانی کون ؟"

"تم ہوں ہوں کئے جاؤ میں ساری باتیں بتاتا ہوں" حلق سے ایک گولی اُتارتے ہوئے پھر اپنی بکواس شروع کی :-

"تمھارے نانا — خدا ان کو جنت میں جگہ دے — بڑے بھولے بھالے حاتم صفت اور نیک انسان تھے — قسم ہے وحدہٗ لا شریک کی اس نے نانا میاں جیسے لوگ اب تک دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے - ان کے پاس ایک موٹریا تھی"

"موٹریا کیسی ؟"

"یہی چھوٹی موٹر - میاں کیا تعریف کروں اس کی - جب کبھی اس کا خیال کرتا ہوں تو بس اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے خاص طور پر ولایت سے بنوا کر منگوائی تھی - تین چار ہزار روپیہ ماہانہ تو فقط تیل پر خرچ ہو جاتا تھا"

"تین چار ہزار روپیہ اور چھوٹی سی موٹر کا خرچ !! کیا چوبیس گھنٹے پھرا کرتے تھے ؟"

"نہیں جی ہفتہ میں مشکل سے دو ایک مرتبہ بیٹھتے ہوں گے"

"تو پھر اتنا روپیہ کیسے خرچ ہوتا تھا پٹرول مہنگا تھا ؟"

"ارے وہ پٹرول سے کب چلتی تھی - پٹرول کی ٹنکی میں "پیرس" کا سینٹ اور تیل کی ٹنکی اسٹرلی، محمد علی کے کارخانہ کا نہایت

ی طوان عطر پڑتا تھا۔"

"داروغہ جی تم یہ کیا کہہ رہے ہو"

"اے میاں واللہ جھوٹ نہیں بالکل واقعہ ہے۔"

"تعجب ہے"

"ابھی ابھی اور سنو — اس کے ٹائر جو ہوتے تھے نا وہ گاڑھے میدے کے ہوتے تھے۔ میدہ کے ٹائروں میں کھوئے کے ب اور ان میں جنگلی گلاب میں بسی ہوئی ہوا بھری جاتی۔ جو کبھی اس میں "پم چر" ہو جاتا تو سارے شہر میں خوشبو پھیل جاتی اور لوگ جھ جاتے کہ تمھارے نانا میاں کی موٹریا کا پہیہ پھٹ گیا ہے۔"

"داروغہ جی تم کچھ مذاق کر رہے ہو"

"تمھیں تو ہر بات مذاق ہی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا جانتے ہو اُس کی گدیاں کاہے کی تھیں؟ — صابن کا جو کٹ ہوتا ہے نا اس کو انمدی میں سُکھا کر گدیاں بنائی تھیں اور ان پر ولایت کے پھول ٹانک دئے تھے۔ ماشاءاللہ میاں پھول بھی عجیب قسم کے تھے۔ یب جاؤ اور بیٹھنے لگو تو خود بخود سکڑ کر دب جاتے اور دور ہو جاؤ تو ایسا معلوم ہو کہ ایک گلدستہ ہے۔ اچھا اس کے چلانے کی کنجی بھی اص وضع کی تھی کنجی لگانے پر وہ اُس وقت تک چالو نہ ہوتی جب تک نانا میاں انگریزی میں اس سے کچھ گٹ پٹ نہ کر لیتے۔ ہماری جھ میں تو خاک بھی نہ آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ موٹر جب چالو ہو جاتی تو کہتے "چل ری موٹر بسم اللہ اپ" اور اس کے بعد وہ آگے ڑھنے لگتی۔"

انھوں نے دوسری گولی حلق سے اُتاری اور میں نے کہا "داروغہ جی تم اب آسمان پر پہنچ گئے ہو مجھے بھی سونے دو اور خود بھی لمبی تانو۔"

"بڑے میاں تمھارے نانا میری عزت کرتے تھے تم میری گودی کے کھلائے ہوئے ہو مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔"

"نہیں داروغہ جی میرا مطلب یہ ہے کہ رات بہت ہو گئی ہے، تم کو بھی نیند آ رہی ہوگی بس اب سو جاؤ۔"

"نہیں میں نہیں سوؤں گا۔ ایک مرتبہ اسی طرح رات میں سونے پر تمھارے نانا میاں سے جھگڑا ہو گیا۔ انھوں نے جب اپنی ار مان لی تو اُسی وقت سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ آج کی رات اٹھارہ گھنٹے کی ہوگی نانا میاں شہر کے کوتوال تھے، حکم چلتا تھا رات اٹھارہ گھنٹے کی ہو کر رہی۔ ہاں تو میاں تم کو اس موٹریا کا حال سنا رہا تھا۔ اس کی رفتار کا کیا کہنا۔ چاہو تو جوں کی طرح ینگے اور اگر چاہو تو بندوق کی گولی سے بڑھ جائے ایک دن آن میں اور لاٹ صاحب میں اسی پر شرط بند گئی۔ قسم ہے گولی اور موٹر میں بیس اُنیس کا فرق رہا ہوگا۔"

"داروغہ جی اُس میں روشنی کیسی ہوتی تھی؟"

"روشنی کہاں ہوتی تھی۔ اندھیرا ہی اندھیرا رہتا مگر میاں اندھیرا بھی ایسا ولایتی کہ سوئی میں تاگہ پرو لو۔"

"اچھا اس کا ہارن کیسا تھا؟"

"ہارن کیا ہوتا ہے؟"

"ارے وہ ہوتا ہے نا 'پوں پوں' کرتا ہے۔"

"اچھا وہ پونگا؟"

"ہاں، ہاں پونگا"

"ارے وہ تو سب سے عجیب و غریب چیز تھی۔ اس کا راز تو تمھارے نانا میاں کو بھی معلوم نہ تھا۔ چوک سے گزر جاتے تو جانوروں کی بولیاں شروع ہو جاتیں۔ باغوں میں جاتے تو پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دیتی اور اگر کسی اصطبل میں جانا ہوتا تو معلوم ہوتا گھوڑے ہنہنا رہے ہیں —— موٹر جب گھر کے قریب پہنچ جاتی تو "سرکار آ رہے ہیں" کی آواز نکلتی۔"

"داروغہ جی، نانا میاں اس موٹر کو رکھتے کہاں تھے؟"

"بس یہ نہ پوچھو"

"تمھیں میری قسم بتا دو"

"تم بچے ہو ابھی ان جھنجھٹوں میں نہ پڑو۔ یہی تو تمھاری چھوٹی ناک کا راز ہے۔"

"تمھیں نانا میاں کی جوتیوں کی قسم بتا دو"

"تم نے نانا میاں کی قسم دے کر غضب کر دیا۔ دیکھو معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔"

"ارے بتا بھی دو میں کسی سے کہوں گا نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ تمھارے نانا میاں کو ایک فرنگن سے محبت ہو گئی تھی۔ عورت تھی چھیل چھبیلی میاں جی ایسے لٹو ہوئے کہ تن من سب ہی وار دیا۔ یہ موٹر در اصل اسی کی فرمائش پر ولایت سے منگوائی تھی اور اسی کے پاس رکھا کرتے تھے۔ نانا میاں کا جب انتقال ہوا تو ہم قلق گیا جاگیر کے دھندوں میں اور وہ فرنگن موٹر لیکر ولایت فرار ہو گئی۔ اس کے مرنے کے کوئی دس سال بعد خبر لگی کہ اُسکی نواسی اسی شہر میں رہتی ہے۔ سنتا ہے وہ بھی بڑی رنگیلی ہے —— اتنی شریر رسید کہ گال پر اگر محبت بھرا طمانچہ لگاؤ تو توتوں دوڑا ہوا کھالی دے" — "داروغہ جی کیا اس بڑھاپے میں تمھاری نیت ڈانوا ڈول ہو رہی ہے۔"

"نانا میاں ان فرنگنوں سے دل نہ لگاتا۔ دین و دنیا دونوں خراب۔ میں تو ان سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ پتہ چلا ہے کہ اس کی ماں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ موٹر کی رسید میرے پاس ہے اگر وہ کسی طرح اُڑا لی جائے تو ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی۔ یہ بھی علم ہوا ہے کہ کوئی جرمن شہزادہ اس موٹر کے لئے اپنا پاؤ ملک دینے کو طیار ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں، ہاں اور نہیں تو کیا، یہ آج کل جرمن اور انگریز ایک دوسرے کو لڑائی کی جو دھمکیاں دے رہے ہیں اسکی اصل وجہ

بس نانا میاں کی وہ موٹر یا ہے۔" اس کے بعد دارو غہ جی کہنے لگے: "میاں دیکھو کہیں رسید تمھیں دے دیتا مگر ڈر ہے کہ کہیں
اس لونڈیا کے جال میں پھنس جاؤ، بابا جواؤ کا خون ہے اگر کہیں جوش میں آکر رسید اُسے دے دی اور یہ معاملہ طشت از بام ہوگیا
تو قسم ہے جرمن اور انگریز ہندوستان ہی میں لڑ پڑیں گے ——— اور پھر پھر کے سارے مصیبت ہم غریب ہندوستانیوں پر آجائیگی۔"

"نہیں دارو غہ جی میں تو رسید بتا کر اُسی کو پھانسنا چاہتا ہوں۔"

"ارے بابا چھوڑو ان فرنگنوں کو۔"

"دارو غہ جی معاف کرنا تم نے زمانہ تو دیکھا ہے مگر ان مورتیوں کی پوجا نہیں کی ہے۔"

"معوذ باللہ میں کیوں پوجا کرنے چلا تھا۔ خدا اس دن کے لئے زندہ نہ رکھے۔ تمہارے نانا میاں سے ملنے کے لئے بڑی
بڑی ہستیاں تڑپتی تھیں اور وہ بھی اُسی طرح جان فدا کرتے تھے مگر قسم ہے میں نے تو کسی کو نظر بھر کے دیکھا تک نہیں یہ میدہ
کی مورتیاں جائیں چولھے میں ہمیں تو اپنی چندی کی گڑیا ہی پسند ہے۔ اُسی سے کھیلا کریں گے۔"

"اچھا تو دارو غہ جی بتاؤ وہ رسید کہاں ہے؟"

"کہہ تو دیا کہ میرے پاس ہے جب وقت آئے گا تو دے دوں گا۔"

"بوڑھے ہونے کے بعد دی تو کیا فایدہ - اب دو"

"میاں تم رسید دکھا دو گے اور جرمن اور انگریز میں لڑائی کرا دو گے"

"نہیں جی میں تو اس چھوٹی نانی کی نواسی کو پھانسوں گا۔"

"وہ اور بھی برا ہو گا" ——— "ارے اُسے تو لونڈی بنا کر رکھوں گا اور نانا میاں کا بدلہ لوں گا۔"

"یاد رکھو وہ تمھیں تباہ کر دے گی، اُس موٹر یا کے واپس ملنے کی جو یہی سہی امید ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔"

"تمھیں میری جان کی قسم دیدو" ——— "اچھا اب رات بہت ہو گئی ہے سو جاؤ، صبح باتیں کریں گے۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ رسید دو گے" ——— "وعدہ بھی جب ہی کریں گے۔"

"مگر اس وقت ہاں کہہ دو" ——— "اچھا بھئی دیں گے مگر دیکھنا بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دینا۔"

صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے دارو غہ جی کو آواز دی - میں نے جو بار بار پکارنا شروع کیا تو شیخ محبوب خوف سے کانپنے لگا
اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "سرکار، دارو غہ جی کو مرے ہوئے تو ایک سال ہو چکا ہے آج ان کی برسی ہے۔"

"میں نے وہسکی کا ناتمام شیشہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے دوسرا شیشہ لانے کا اشارہ کیا - اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا -
تو لگا دیوار پر چسپاں کئے ہوئے پوسٹر کو دیکھنے ——— پوسٹر پر لکھا تھا "آج سے نشہ کی ممانعت — قانون نافذ ہو گیا"
میں نے اپنے ہی لگائے ہوئے پوسٹر کو خود بھی ایک مرتبہ دیکھا اور اپنا سر لحاف میں چھپا لیا -

مرزا ظفر الحسن بی - اے (عثمانیہ)

؟

فلسفی — یا — پاگل — ؟ — مگر نہ اسے فلسفی کہہ سکتے تھے نہ پاگل — زیادہ سے زیادہ آپ اسے اس سلسلہ کی
درمیانی کڑی تصور کر لیجئے - کچھ خبطی وہ ضرور تھا ورنہ اس زمانہ میں چار سو روپیہ ماہوار کی پروفیسری چھوڑ کر بیکار گھر پر نہ بیٹھ رہتا
وہ کچھ فلسفی بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت بے انتہا خشک تھی - مگر با وجود ان سب باتوں کے وہ ان میں سے کچھ بھی نہ تھا
بلکہ درمیانی نقطہ بھی نہ تھا اس لئے کہ بعض اوقات نہ وہ پاگل ہی معلوم ہوتا نہ فلسفی یوں سمجھئے کہ لفظ 'عجیب' کا اگر صحیح اطلاق کسی پر ہو سکتا
تو وہ یہی شخص تھا - زندگی کا ایک طنز، بلکہ زندگی پر ایک طنز جو بہتر سمجھئے کہہ لیجئے — اتنے بڑے شہر میں تنہا نہ کوئی دوست نہ کوئی عزیز! ایسی
ہولناک زندگی گزارنا اسی کے بس کی بات تھی - لوگ اسے علاوہ خبطی، پاگل اور سڑی کے مغرور بھی کہتے تھے اور حق بجانب بھی تھے کیونکہ
بہت کم لوگوں سے حضرت سیدھے منہ بات کرتے — میرا مکان اس کے پاس ہی تھا میں البتہ کبھی کبھی وہاں چلا جایا کرتا تھا - مجھے دیکھتے
ہی ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا "کیوں جناب دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ایک مرتبہ یوں ہی پوچھ لیا تھا کہ "کیا آپ
اخبار بھی نہیں پڑھتے؟" - چنانچہ اسکا جواب بھی انھوں نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں دیا، جب سے پروفیسری چھوڑی اس
شخص نے نہ کوئی اخبار منگایا نہ لوگوں سے حالات سننے کی کوشش کی - کتابوں سے اسے نفرت تھی - کہا کرتا تھا "انسان اپنی ذہنی تنہائی
کی اذیت سے بچنے کے لئے کتابیں لکھتا ہے" کتابیں اس کے یہاں بہت تھیں جن میں زیادہ تر ادبیات سے تعلق رکھتی تھیں لیکن سب
کی سب الماری اور گرد کا 'جزو لاینفک' بن کر رہ گئی تھیں -

مجھے ادبیات — خصوصاً شعریات، سے فطری دلچسپی تھی اسی لئے پروفیسر صاحب سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ ان کی
زندگی پر کبھی کبھی ایک تلخ شعر کا گمان ہو جاتا تھا - جب کبھی میں ان سے کسی شاعر کا تذکرہ کرتا وہ نہایت خشک لہجہ میں فرمایا کرتے -
"بعض شاعروں کی بات چھوڑو شاعر، اخبار اور کتابیں یہ تین چیزیں تو ایسی ہیں جو دُنیا کو خراب کرتی ہیں" میں اگر زیادہ اصرار کرتا تو وہ
صاف کہہ دیتے "جناب جا کر کوئی کام کیجئے اور دوسروں کو کام کرنے دیجئے" گویا انھیں بڑا کام ہی رہتا ہے — دن بھر بیٹھے رہنا -
سگریٹ پینا اور شام کو کسی ویرانہ میں نکل جانا — یہ تھا ان کا کام!

ان کی کوئی ایسی زیادہ عمر بھی نہ تھی کہ کہا جا سکتا کہ شاعری سے اب انھیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے - صرف چالیس برس کے تھے
اور سچ پوچھئے تو چالیس برس میں لوگ مکمل شاعر بنتے ہیں - بہر حال میں بھی موقع کا منتظر رہتا - باوجود ان کی گھڑکیوں اور طنزیہ جملوں
کے ایک آدھ شعر ضرور سنا دیتا اور وہ چپ، نہ ہوں نہ ہاں، منہ بنائے بیٹھے رہتے -

انھیں دنوں مجھے ایک نوجوان شاعر جمال کے کلام سے دلچسپی ہو گئی تھی - جمال کا رنگ یکسر عاشقانہ تھا - اس کی شگفتگی اور

دردمند خوددارانہ پہلوؤں کے مجھے بہت پسند تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے اشعار پروفیسر صاحب کے جمود اور بے حسی کو توڑ دیں گے مگر وہ شخص کبھی نہ پسیجا ۔۔۔ کبھی کبھی سن لیتے یہی غنیمت تھا۔ جب زیادہ تنگ آجاتے تو ٹہلنے لگتے۔ اسی درمیان میں میں نے جمال سے بھی دوستی پیدا کرلی تھی۔ ہم عمر اور ہم خیال ہونے کی وجہ سے دوستی شربت کا جامہ پہنتی جا رہی تھی۔ ایک دن جمال کو لیکر پروفیسر صاحب کے یہاں پہونچا۔ نو بجے رات کا وقت تھا پروفیسر صاحب کے اتنے بڑے مکان میں تمام اندھیرا تھا۔ صرف دو کمروں میں روشنی تھی ایک تو وہ جہاں خود تشریف فرما تھے۔ دوسرے جہاں کھانا پک رہا تھا۔ پروفیسر صاحب آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے نظریں چھت پر جمائے سگریٹ پی رہے تھے ۔۔ سامنے گول میز پر لیمپ ہلکا ہلکا جل رہا تھا۔ کمرہ میں خاموشی طاری تھی اور کچھ وحشت سی برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں آدمی رہتے ہی نہیں۔ ہم لوگ بیٹھ گئے مگر وہ جب چاپ جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ جمال کی صورت مایوسی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ میرا ہاتھ دبا کر چل نکلو ۔۔ اسے اس بے توجہی سے صدمہ پہونچا تھا مگر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ ذرا ٹھیرو۔ دو تین منٹ کے بعد پروفیسر صاحب اپنے آپ میں آگئے۔

"کہئے دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا: "ہر شخص خوش و خرم ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مسرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

کہنے لگے: "کیوں جناب یہ کوشش کیوں کر رہا ہے؟" ——— "یہ تو فطری خواہش ہے۔"

"اور یہی فطری خواہش — یہی بے قراری کبھی مسرت نہ حاصل کرنے دے گی۔ انسانی زندگی سے یہ نامکمل کا احساس، کبھی نہ مٹے گا۔" ——— "خیر ہوگا" ——— "آپ کو جمال سے ملاؤں۔"

"وہی آپ کے شاعر صاحب؟" ——— "ہاں"

وہ اپنی جگہ سے اٹھے نہ جمال۔ میں دل ہی دل میں بے انتہا شرمندہ ہو رہا تھا۔ گو یہ جانتا تھا کہ پروفیسر صاحب کم سخن وحشی طبیعت اور بد دماغ ہیں لیکن اس حد تک ان کو گیا گزرا نہ سمجھتا تھا۔ آج بے حد مایوسی ہوئی۔ میں جمال سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا لاکھ چاہتا تھا کہ پروفیسر صاحب کی اس بدتمیزی اور بے رخی کو کسی طرح جمال کے سامنے ہلکا کرکے پیش کروں مگر کوئی تاویل ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی ۔۔۔ آخر کار میں نے کہا "اچھا تو آپ اجازت دیجئے" "بصد شوق" انھوں نے کہا اور پھر چھت پر نظریں جما دیں۔ گویا اوپر کڑی کے جالوں میں کوئی خاص دلکشی تھی ۔۔۔ میں خاموشی سے اٹھا اور جمال کو لیکر باہر چلا آیا یہاں آکر میں نے گویا ہوا میں فراغت کی سانس لی۔ جمال چپ تھا ۔۔۔ میں نے کہا: "بھئی معاف کرنا۔ بہرحال زندگی کی ایک تصویر تم نے یہ بھی دیکھ لی۔" اس کے بعد میں دو ہفتے تک پروفیسر صاحب کے یہاں نہیں گیا۔ اس دن وہاں سے نکلنے کے بعد میں نے عزم کرلیا تھا کہ اب ان کے ہاں کبھی نہ جاؤں گا مگر جیوں جیوں دن گزرتے گئے میرا عزم متزلزل ہوتا گیا ۔۔۔ جمال سے مجھے بے انتہا محبت تھی اور اس سے زیادہ اس کے اشعار سے مگر پھر بھی پروفیسر صاحب کی محبت اور ان کی بہکی بہکی باتوں میں زیادہ لطف ملتا تھا ۔۔۔ تیسرا ہفتہ قریب ختم تھا کہ پروفیسر صاحب میرے عزم پر غالب آگئے اور میں ان کے یہاں پہونچ گیا۔ وہ برآمدے

میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے پہونچتے ہی کہا: "دنیا بدستور ہے۔"

مسکرا کر بولے: ۔۔ "آج تمھارے منہ سے کس قدر صحیح جملہ نکل گیا۔"

میں نے کہا: "پروفیسر صاحب اس دن جمال کے ساتھ آپ کا برتاؤ کچھ زیادہ مستحسن نہیں رہا۔"

"میرا برتاؤ؟" انھیں بڑا تعجب ہوا گویا ان کے خیال میں تمام باتوں کا ذمہ دار صرف میں ہی تھا ان کی آنکھوں میں چمک اور زیادہ بڑھ گئی۔ کہنے لگے: "انسان اگر دوسرے انسان سے پہلے ہی سے کوئی توقع نہ قائم کرے تو بدمزگی اور بداخلاقی کا وجود ہی

میں نے کہا: "تو دنیا کا کام کیسے چلے؟"

"نہ چلے!" نہایت فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا اور ان کے شکن آلود ماتھے پر ایک شکن کا اور اضافہ ہوگیا۔

"جمال کی زندگی سے آپ واقف نہیں، اس کی شاعری اور اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔" میں نے پھر چھیڑا۔

"تو بیوقوف ہے!" یہ کہکر وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گئے۔ میں بھی گھر چلا آیا۔ میں نے اپنے ضمیر کو بہت برا بھلا کہا۔ احساس خودداری دلایا مگر پروفیسر صاحب کی شخصیت کے سامنے ایک نہ پیش کی گئی۔ میں روز بروز ان کے یہاں "جمالیات" زیادہ جانے لگا۔ کسی نہ کسی طرح کچھ اشعار سنا ہی دیتا۔ بعض اوقات وہ بے حس بیٹھے رہتے بعض دفعہ گھبرا کر چلے جاتے مگر میں باز نہ آتا۔ جمال کی زندگی اور اس کے اشعار بھی دو باتیں میں انھیں سنایا کرتا۔ آخر وہ دن بھی آ ہی پہونچا جب انھوں نے نہایت نرم مگر مستحکم لہجہ میں کہہ دیا "آج سے میں نے عزم کرلیا ہے کہ کسی سے نہ ملوں گا۔"

پروفیسر صاحب کے عزم کے معنی میں جانتا تھا "موت اور میرا عزم" وہ کہا کرتے تھے "دو چیزیں کبھی نہیں ٹل سکتیں" اب تک وہ میری جسارت کو برداشت کئے گئے مجھے تو یہی خوشی تھی ورنہ میری جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو نہ معلوم کیا کر بیٹھتے۔ بہرحال مجھے رنج ضرور ہوا اور میں نے دوبارہ ارادہ کرلیا کہ اب کبھی نہ جاؤں گا۔

ادھر خوش قسمتی سے میرا تبادلہ بھی دوسری جگہ ہوگیا۔ رفتہ رفتہ پروفیسر صاحب ذہن سے اترتے چلے گئے۔ ہاں جمال سے البتہ تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ وہ میرے یہاں کبھی کبھی آبھی جاتا تھا۔ جمال میں ادھر ایک عجیب تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ اب افسردہ رہتا۔ اس کی گفتگو اور لہجہ سے شگفتگی زائل ہو چلی تھی مگر اشعار میں درد اور بڑھ گیا تھا۔ میں اس تغیر کی وجہ بخوبی جانتا تھا لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی قریب ہوگئے تھے۔

تین سال کے بعد مجھے ایک کام سے پھر وہیں جانا پڑا۔ ریل میں سوار ہوتے ہی مجھے پہلی بار پروفیسر صاحب کی یاد آئی۔ گاڑی جتنی قریب ہوتی گئی، جمال سے زیادہ پروفیسر صاحب میرے دل و دماغ پر چھاتے گئے۔ میں نے عجیب کھینچ اور کشش سی محسوس کی۔ گاڑی سے اترنے کے ساتھ ہی میں سیدھے ان کے بنگلہ پر پہونچا۔ مگر وہاں وہ نہ تھے ۔۔۔ بنگلہ خالی تھا۔ میرا دل دھک سے ہوگیا۔ دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے مگر پروفیسر صاحب جنبش کرنے والے نہیں تھے ۔۔۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دوسری جگہ چلے گئے ہیں تلاش کرنے پر ان کا مکان ملا مکان دیکھتے ہی ایک نامعلوم خوف جس میں کچھ غم بھی شامل تھا میرے تمام بدن میں سرایت کر گیا۔ مکان

نہایت چھوٹا اور تاریک تھا جس سے خلسی کی بو آتی تھی۔ میں اندر گیا۔ تین کمرے تھے جن میں سے صرف ایک میں روشنی تھی۔ "اور یاور بھی کہاں آ گیا؟" میں نے دل میں سوچا اور پھر نہ معلوم کیوں اپنے خیال پر خود ہی پریشان سا ہو گیا۔ میں کمرے کے سامنے پہونچ گیا۔ پروفیسر صاحب کرسی پر پاؤں پھیلائے حسب دستور لیٹے ہوئے تھے اور سگریٹ کا دھواں کمرہ میں چکر کھا رہا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑے۔ شاید مدت سے وہ انسانی قدموں کی چاپ سے نا آشنا تھے — مجھے دیکھا۔ میں ان کی آنکھوں کا سامنا نہ کر سکا۔ ایک عجیب مسکراہٹ جس میں پہلی سی بیچارگی کا عکس تھا ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ بولے "کہئے آپ کی دنیا کا کیا حال ہے؟"

میں ان کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ لیمپ کی روشنی میں ان کا چہرہ اچھی طرح دکھائی پڑ رہا تھا۔ شدت، تاثر اور ہجوم خیالات سے میں ان کے سوال کا جواب دینا بالکل ہی بھول گیا۔ ان کے خشک چہرہ پر جھریاں زیادہ پڑ گئی تھیں سر کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی آنکھوں میں چمک ضرور تھی مگر بجھتے ہوئے چراغ کی سی۔ کمرہ بالکل خالی تھا معلوم ہوتا تھا کہ اسباب اور فرنیچر بہت کم ہو گیا ہے کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

"بچے کیسے ہیں؟"

میرے اس سوال سے غالباً انھیں اذیت ہوئی کہنے لگے: "اس سوال کو آپ میرے سوا دنیا میں سب سے پوچھ سکتے ہیں اور میرے سوا غالباً ہر شخص اس کا جواب دے سکتا ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"جمال کے کچھ شعر سناؤں"

میں نے سنانا شروع کیا۔ پروفیسر صاحب اسی محویت کے عالم میں بیٹھے رہے جس طرح پہلے بیٹھا کرتے تھے۔

"پسند آئے؟"

"وہ زندہ ہے ابھی تک؟"

یہ سوال انھوں نے کسی دوسرے کے بارے میں اب تک شاید نہ پوچھا تھا!

میں نے کہا: "اس کی زندگی ہی کیا اسے محبت نے تباہ کر ڈالا"

"محبت؟" انھوں نے طنزیہ لہجہ میں دہرایا اور پھر خلاف معمول خوب ہنسے۔ خوب ہنسے۔ اتنا ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔

مجتبیٰ حسین

بُت

منشی جاگل نے یہ کہتے ہوئے کہ ترکیب استعمال بکلانہ کاغذ میں درج ہے وہ دوا کا ڈبہ اکاؤنٹنٹ صاحب کی طرف بڑھایا تو انھوں نے اسے للچائی ہوئی نگاہوں سے گھورتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لیکر ایسا بھینچا جیسے ان کے ہاتھ پارس پتھر لگ گیا ہو۔

جب اکاؤنٹنٹ صاحب نے چابیوں کا گچھا اوشا کے خالی ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا "دیکھو یہ سب کچھ تمھارا ہی ہے۔ اب تم جانو تمھارا کام" تو وہ خوشی اور حیا سے ایسی لپک گئی جیسے ٹھنڈی ہوا کے ہلکے جھونکے سے پھولوں بھری شاخ۔ اور اس کی بڑی بڑی [illegible] آنکھوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جب اس کی مسکرائی ہوئی آنکھیں سب سے بڑی چابی پر جمی ہوئی تھیں تو وہ سوچ رہی تھی کہ رخصت کے وقت ماتا جی نے کس طرح رونے کا انداز اور لہجہ بدلتے ہوئے کہا تھا کہ "اوشا پرانا تجھ کو رانی بنا کر رکھے، نہ میرے ساس [illegible] دیکھ [illegible] کیسی سمجھ سے کام لیتی ہے" اس نے نادانستہ طور پر ایسا محسوس کیا جیسے وہ نہایت آزاد فضا میں گہرے گہرے سانس لے رہی ہے بغیر ہونٹوں میں ذرا سی جنبش پیدا کئے اس نے دل سے اپنی دور اندیش ماں کو دعائیں دیں۔ آخر اسی نے تو اس کا نصیب جگایا تھا!

اوشا دو چار ہی دن میں اپنے نئے گھر میں ایسے کام کاج کرنے لگی جیسے اس کی شادی کو عرصہ ہو گیا ہو۔ یہ تو خیر نوکر چاکر سب کچھ ہی تھے لیکن اگر وہ گھر بار نہ سنبھالتی تو سنبھالتا کون۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بظاہر اس کے دن ایسی خوشی میں گزر رہے تھے جس کی تمنا ہر دیکھنے والے کو چاہت ہوتی ہے۔ قیمتی زیور اور عمدہ کپڑے پہننے کو، رہنے کو عالیشان مکان اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ گھر کی رانی —

اکاؤنٹنٹ صاحب اس کی خوشی کو اپنی خوشی تصور کرتے یہی وجہ تھی کہ جب وہ پہلی مرتبہ اپنے میکے گئی اور اس کی ماں نے اس سے پوچھا۔ "اوشا سکھی تو رہی" تو وہ بغیر کچھ جواب دئے سر جھکا کر ماں سے لپٹ گئی اور جب اس کی ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر نہایت شکر گزاری کے لہجہ میں کہا "اے بھگوان میں تیرا کیسے شکر ادا کروں" تو اس کے دل میں ایسی گدگدی سی پیدا ہوئی جس نے اس کے سفید رنگ میں سرخی سی بھر دی۔ ماں سے علیحدہ ہو کر وہ اپنی بہنوں سے چمٹ چمٹ کر ملی یہاں تک کہ اس کی لمبی لمبی چٹیاں اس میں گھری گھاس کی تتی ہوئی [illegible] کی طرح نرم اور دلفریب ہو گئیں۔ صحن میں محلہ کی بہت عورتیں جمع تھیں جن میں سے کچھ [illegible] کبھی اس کی صورت اور کبھی بیش قیمت زیور دیکھ رہی تھیں اور کچھ ایک دوسرے کو کہنی کے ٹہوکے دے کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھا رہی تھیں۔ اس کی ہمجولیاں بھی مصنوعی ہنسی ہنس ہنس کر [illegible] شوہر میں [illegible] کر رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے تیور [illegible] باوجود اس کے زیور اور قیمتی کپڑوں کے اوشا کی نئی شادی ان کی نظروں میں کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔

"ارے بھئی ایسا بھی کیا [illegible] اکاؤنٹنٹ صاحب کی بیوی ہونا" ایک نے مصنوعی ہنسی سے طنز کے لہجہ کو دباتے ہوئے کہا۔ اوشا کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے اپنی باہیں کہنے والی کی گردن میں حمائل کر دیں اور اپنی نازک گردن کو اس کے شانے پر بالکل

ڈھیلا ڈال دیا۔ اُس کی سہیلی نے بھی حد درجہ خلوص کے ساتھ اپنی گداز باہوں کو اس کی کمر میں ڈال دیا۔ مگر وہ اُس کے سونے کے دست بند کی لڑیوں کی آواز پر غور کئے بغیر نہ رہ سکی اور پہلے احساس نے تو اسے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کرنے پر مجبور سا کر دیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ اوشا کے گلے سے علیحدہ ہو وہ اس کے شوہر کے متعلق بہت کچھ سوچ چکی تھی۔ یہ اُس کی کتنی آمدنی ہے۔ جائیداد کتنی ہے۔ شہر کے بڑے لوگوں میں ان کا شمار ہے وغیرہ وغیرہ۔ اوشا کی گرفت رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑتی گئی اور اس کی سہیلی کا خیال بھی اس طرف منتقل ہو گیا۔

"اوشا سکھی تو ہے" اُس نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اوشا نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو خفیف سی گردش دے کر اپنی سہیلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بہن بھگوان کی دیا ہے" یہ الفاظ گویا اس کے من کی گہرائیوں سے نکلے تھے اور پھر اُس نے دانستہ اس موضوع کو بدل دیا۔

اوشا کی شادی ہوئے دس سال ہو گئے۔ پیسہ کی افراط اور اکاؤنٹنٹ صاحب کی روز افزوں مہربانیوں نے اوشا کے چہرے کو کندن سا بنا دیا تھا وہ ہنستی تو معلوم ہوتا کہ صبح کی پھیلتی سپیدی میں کنول کی کلی کھل رہی ہے۔ قیمتی لباس اور بیش بہا زیورات اس کی خوبصورتی کے ممنون نظر آتے اور دیکھنے والیوں کی آنکھیں اُن سے ہٹ کر اُس کے شگفتہ چہرہ پر جم کر رہ جاتیں اور لاشعوری طور پر اُس کی سرگیں آنکھوں میں ایک دلکش چمک اور ہلکی سی نمی پیدا کر دیتیں۔ دیکھنے والی بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی "بھوانی کیسی سندر معلوم ہوتی ہو تم۔ پرماتما تمہاری عمر لگائے" اس عرصہ میں اوشا بہت دفعہ اپنے میکے جا چکی تھی مگر کچھ تو گھرداری کے خیال کے تحت اور کچھ اکاؤنٹنٹ صاحب کی خاطر وہ کبھی زیادہ دن اپنے گھر نہ ٹھیری تھی۔ اُسے اپنی سہیلیوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی اور گھر واپس آکر وہ اپنے شوہر اور ہمسایوں سے ان کی تعریفیں کرتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ جب تک میکے میں رہتی اور گھر لوٹنے کے دو ایک دن بعد تک بھی وہ ایسا محسوس کرتی جیسے اس کی بعض شادی شدہ سہیلیاں اُسے غرور سے کچھ نیچا تصور کرتی ہیں۔ اس خیال سے اس کی طبیعت پر ہلکا سا بوجھ سا ہو جاتا جو گھر بار کی دیکھ بھال میں از خود مٹتے مٹتے ختم ہو جاتا اور زندگی پھر پہلی سی خوشرنگی اختیار کر لیتی۔

اوشا کو میکے آئے پانچ دن ہو چکے تھے اور اس دوران میں نوکر دو مرتبہ آکر واپس ہو چکا تھا تیسری مرتبہ اوشا نے اُسے یہ کہکر واپس کر دیا کہ وہ اپنی سہیلی پشپا کے جھولے میں شریک ہو کر تیسرے دن واپس آئے گی۔ اگلے دن صبح ہی اوشا پہن اوڑھ کر [illegible] کے باغ میں جا پہنچی۔ برسات کا موسم تھا اور چاروں طرف کی ہریالی جھولے کے ارد گرد کی رنگا رنگ ساریوں کی دلفریبیوں میں عجیب اضافہ کر رہی تھی۔ اوشا سُرخ ساری میں ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سبزے پر بیربہوٹی اور اس کی ساری کی گوٹ پر کلابتوں کا نازک کام ایسا نظر آتا تھا جیسے آسمان پر پھیلی ہوئی سُرخی کے نیچے آجانے والے سنہرے بادل کا کنارہ۔ اوشا کے پہونچتے ہی پشپا نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "آ گئیں اوشا بہن" اس کے بعد ایک لمحے کے لئے ایسا سکوت ہو گیا جیسے چلتے چلتے ہوا رُک جائے۔ ایکدم سب کی نگاہیں اٹھیں اور اوشا کے چہرہ کی طرف اس طرح ہو گئیں جیسے سورج مکھی سورج کی طرف۔

"ایشور جانے یہ تو پھول ہے" منورما نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اری رہنے بھی دے ان تعریفوں کو" ریوتی تنک کر بولی "سونے پر سہاگہ سے یونہی روپ آتا ہے"

"اوشا بہن یہ چادر اُتار دو، کیا جھنجھٹ ہے" پشپا نے بچوں کی طرح خلوص کے ساتھ کہا اور جھٹ ریوتی نے ہلکی دھانی ریشمی چادر اوشا کے گلے سے اُتار کر قریب کے پیڑ پر ڈال دی۔ گردن کی ہلکی سی جنبش سے اس کا کرن پھول ایسا چمکا جیسے کالی گھٹا میں بجلی کوند جائے۔

"اوشا بھگوان جانے منہ دیکھی بات نہیں کرتی میں تو تجھے اتنا پیار کرتی ہوں کہ کیا بتاؤں۔ جی میں آتا ہے ہر وقت تیرے ساتھ رہوں" منورما نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"جبھی تو میرے پاس ایک مرتبہ بھی نہ آئیں" اوشا نے آنکھوں کے گوشہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تبسم آمیز لہجہ میں کہا۔

"منورما ذرا دیکھنا یہ بھونرا تمہاری کلی کا منہ نہ چوم لے۔ ہاں بہن اس کا تو پھولوں ہی سے میل ہے" ریوتی نے منورما کو ٹہوکا دیتے ہوئے بھونرے کی طرف اشارہ کیا۔ غرضکہ صبح سے شام تک یہی رونق رہی مگر چلتے چلتے ریوتی نے آنکھیں ملا کر کہا

"اوشا کہو تو ایک بات کہدوں، بُرا مت ماننا"

"میں بُرا کیوں ماننے لگی" اوشا نے سادگی سے جواب دیا۔

"سچ تو یہ ہے تو اکاؤنٹنٹ صاحب کے لائق نہیں"

"کیوں"

"اگر میں تیری جگہ ہوتی" ریوتی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تو بتاؤں میں کیا کرتی۔ بتاؤں۔ میں تو کبھی بھی بڈھے شوہر کے ساتھ نہ رہتی"

"اسے یہ تو بھگوان کی دین ہے" اوشا نے بمشکل جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے محسوس کیا جیسے ساکت پانی میں زور سے بڑا سا پتھر گر پڑا ہو اور اس کی لہریں پہلے بلند ہو کر کناروں تک پہونچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے اُس کے سارے جسم کا خون اُس کے سر اور چہرہ میں آ گیا اور اُس کے دل کی رفتار یکدم سے بند ہو جانے کے لئے تیز ہو گئی۔

"بھگوان دگوان کیسا۔ کیا بھگوان نے بس انھیں ہی بنایا ہے۔ اوشا ناراض مت ہونا۔ میں نے یونہی ایک بات کہدی تھی" نوکر تین مرتبہ آیا مگر اوشا گھر واپس نہ آئی۔ بظاہر کوئی وجہ بھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی ماں نے سوچا شاید سہیلیوں میں دل لگ گیا ہے جب گھر کا خیال آئے گا خود چلی جائے گی۔ دن گزرتے گئے اور ایک نامعلوم خیال اُس کے دل میں بیٹھتا رہا۔ وہ اکثر خاموش بیٹھی رہتی، بظاہر کسی چیز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے لیکن حقیقتاً بغیر کسی چیز کو دیکھے۔ وہ خیال کرتی کہ وہ سوچتی تو ضرور کچھ ہے مگر جیسے اُسے پتہ نہیں کیا۔ پندرہ دن بعد اکاؤنٹنٹ صاحب آئے اور اوشا خوشی خوشی ان کے ہمراہ چلی گئی۔ کچھ دن تک وہ انہی نامعلوم خیالات میں پھنسی رہی مگر قبل اس کے کہ اس کے تخیلات کوئی واضح شکل اختیار کریں گھریلو زندگی اور اُس کی سطحی دلچسپیاں اُس کے سوچ بچار پر غالب آ چکی تھیں اور پھر وہی زیور، کپڑے، روپیہ پیسہ اور نہ سوچنے والی زندگی تھی —— مگر اس کے باوجود ایک مدت تک

...ہ ایسا محسوس کرتی رہی گویا اس نے کوئی عجیب سی بات کی ہے۔ منورما اس عرصہ میں دو مرتبہ اُس کے پاس آئی پہلی مرتبہ جب اوشا ...ے شرماتے ہوئے ریوتی کی بات دُہرائی تو اُس نے محبت بھرے لہجہ میں کہا "اوشا، اس بندھن کے بعد سوامی کی خدمت ہی پتنی کا ...ب سے بڑا فرض ہے اور تیرے پاس پرماتما کا دیا سب کچھ ہے۔ ریوتی کی بات پر غور مت کیجو" اس کے بعد وہ خوش رہی اور ہمیشہ ...ہ لذت محسوس کرتی رہی جو کسی فرض کی ادائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اُس کی زندگی خود ایک اہم فرض بن گئی اور اس کی تمام حرکتیں اس ...ہم فرض کے تکمیل کی مُتمنی رہیں۔ اُس نے کبھی بھول کر بھی اس بات پر غور نہ کیا کہ اکاؤنٹینٹ صاحب کے بال پکے اور سفیدی مائل ...تے جا رہے تھے اور اس کے بالوں کی چمک اور سیاہی بدستور قائم تھی ان کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور خود اُس کا چہرہ پھول کی ...پنکھڑی کی مانند شاداب تھا۔ اُن کی آنکھیں موٹے چشمے کی رہین منت ہو چلی تھیں اور اس کی آنکھوں کی مسحور کن چمک اپنی تمام دلکشی ...کے ساتھ موجود تھی۔ اُن کے ہونٹ خشک اور بے جان سے ہو گئے تھے اور اس کے ہونٹوں میں ہنوز نمی اور شگفتگی باقی تھی۔ یہ سب فرق موجود تھے اور بغیر سوچے یا آئینے میں دیکھے اس کے محسوسات میں آسکتے تھے مگر اوشا کی مدت العمر خود فریبیوں یا یوں کہئے کہ فریب کن تسلیوں نے اس کے احساسات فطری کو ایسا بے جان کر دیا تھا جیسے بڑے اور گھنے درخت اپنے گہرے گہرے اور اندھیارے سایوں میں چھوٹے چھوٹے پودوں کو پیلا اور بے جان کر دیتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ اکاؤنٹینٹ صاحب بھی اوشا کو اپنی تھوڑی سی باقی ماندہ زندگی سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایشور کا دیا روپیہ پیسہ تھا اور اوشا اس کی کلیتہً مالک۔ اکاؤنٹینٹ صاحب کی عمر کے ساتھ ساتھ اوشا کے زیورات بھی بڑھتے جاتے اس قلیل مدت میں وہ ہردوار۔ کاشی جی۔ بندرا بن اور پوری بھی ہو آئی تھی۔ غرض کہ بقول اُسکی ماں کے "اوشا کو کس چیز کی کمی تھی"۔

وقت گزرتا گیا اور دیکھنے والوں کی نظروں میں عمروں اور صورتوں کا فرق بھی اتنا ہی قدرتی نظر آنے لگا تھا جتنا ایک امیر ساہوکار کے ساتھ ایک نوکر کا رہنا یا حاکم اور محکوم کا وجود۔ کبھی کبھی کسی سن رسیدہ کا خیال فطرت کی گہرائیوں میں پہونچنے کی کوشش بھی کرتا تو سونے چاندی کی ملمع سازی ضروریات زندگی کو ایسے سنہرے اور روپہلے انداز میں پیش کرتی کہ پہلی چیز آخری اور آخری پہلی معلوم ہونے لگتی خود اوشا کو جب سسرال والے دلکشی سے تعبیر کرتے تو اُسے گمان ہوتا کہ وہ کرشن مراری کی بنسری کی میٹھی تانیں سن رہی ہے اور اُن کے سریلے الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتے چلے جاتے اور اس کے جسم میں چھوتے ہوئے ایسی گدگدی پیدا کرتے جس کا اثر آنکھوں کی جگمگاہٹ اور چہرہ پر دوڑ جانے والی سرخی کی لہر سے نمایاں ہو جاتا۔ محلے والیاں اُس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرتیں اور اس کی خوش قسمتی کے بھی چرچے ہوتے۔ بڑی بوڑھیاں، اُسے سہاگ کی دعائیں بھی دیتیں مگر نہ جانے کیوں یہاں پہونچکر فوراً موضوع بدل دیا جاتا اور کبھی کبھی تو ایک لمحے کے لئے ایسا سرد سناٹا چھا جاتا جس میں ہر ایک خود کو خجل محسوس کرنے لگتی۔ جلد ہی ذاتی اوصاف۔ روپیہ پیسہ اور عزت و شہرت کی باتیں خاموشی کو خوش آیند گفتگو میں تبدیل کر دیتیں اور اوشا تنہائی میں جھجکر دوران گفتگو میں بھی یہ نہ سوچتی کہ اُس نے زندگی بھی حاصل کی یا نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک آدھ بار ہنستے ہنستے اکاؤنٹینٹ صاحب نے یہ کہا کہ بیوی ہماری زندگی تو ختم ہو گئی تو اوشا نے بجائے "ایشور نہ کرے" کہنے کے ایک ایسا تبسم اختیار کیا جو یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ کیا زندگی کے متعلق سوچنا بھی ہمارا حق ہے۔

اکتوبر کا مہینہ تھا اور گو موسم معتدل تھا مگر نہایت ناقابل اعتبار۔ سردی بادل کی چھاؤں کی طرح آتی اور چلی جاتی اور پھر خاصی گرمی ہو جاتی۔ اکاؤنٹنٹ صاحب حفظان صحت کے معاملہ میں بہت محتاط تھے مگر پھر بھی نزلہ زکام میں مبتلا تھے۔ اُس پر طرہ یہ کہ شام کو دورہ میں جانا ضروری تھا اور سامان صبح ہی سے طیار رکھا تھا۔ چنانچہ سوئیٹر اور گرم کوٹ پہن کر ہنستے ہوئے بھاری آواز میں بولے:۔ "اچھا بیوی ہم جاتے ہیں"

کوئی دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ دروازہ کے سامنے گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ اوشا اپنی جارجٹ کی فالسی ساری کے کونے پر نشانی ڈال رہی تھی اور باریک جارجٹ کے نیچے اس کے چھوٹے اور نازک ہاتھ ایسے نظر آرہے تھے جیسے نیلی زمین پر ہلکے گلابی بوٹے۔ گاڑی کی آواز سن کر اُس کا دل دھک سے ہو گیا اور اس کی توجہ دروازہ کی جانب ہو گئی۔ ذرا دیر بعد اکاؤنٹینٹ صاحب خفگی اور پیار کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے:

"بھئی میں نہیں جانتا اس کا فیصلہ تمھاری چاچی کریں گی"

"نمستے ۔ ارے رمیش تم کہاں" اوشا نے ایسی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا جس میں اس کی دلی خوشی بھری تھی۔

"چاچی آیا تو یہیں تھا مگر چاچا کو دیکھ کر واپس چلا جانا چاہتا تھا مگر انھوں نے جانے ہی نہ دیا" رمیش نے معصومانہ انداز سے گلے میں جھولتے ہوئے سبز ریشمی مفلر کے جھالرے کھینچتے ہوئے کہا۔

"تو آنے سے پہلے چل بھی دئے تھے ۔ واہ" اوشا نے سادگی کے ساتھ کچھ ایسے لہجہ میں کہا جس کے معنی یہ تھے کہ نہیں تمھیں ٹھہرنا چاہئے۔

اکاؤنٹینٹ صاحب دورہ پر چلے گئے اور رمیش ٹھہر گیا۔ رمیش اکاؤنٹینٹ صاحب کا رشتہ کا بھتیجہ تھا اور گو غیر معمولی حسین تو نہ تھا مگر خوبصورت ضرور تھا۔ اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے سنہرے بال اس کی بے پروا طبیعت کا پتہ دیتے تھے اور اسکی بھوری بھوری خوبصورت آنکھیں کچھ اس طرح گردش کرتیں جیسے چیزوں کی گہرائیاں ٹٹولتی ہوں۔ اُس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور بغرض تبدیل آب و ہوا کچھ دن کے لئے وہاں آیا تھا۔ رمیش کا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا اور سہ پہر کا ناشتہ تو عموماً باہر ہی کرتا۔ اُسے اوشا کے ساتھ رہتے رہتے نو دس دن گزر گئے۔ اس دوران میں اس نے کئی مرتبہ واپسی کی کوشش بھی کی مگر اوشا کے اصرار نے اسے رُکنے پر مجبور کر دیا۔ اکاؤنٹینٹ صاحب کا انتظار روز بروز بڑھتا جاتا مگر نہ تو وہ خود ہی آتے اور نہ ان کی خبر آتی۔

اُدھر رمیش کی طبیعت خراب ہو گئی۔ رات کو سینما سے واپس لوٹا تو معمولی حرارت تھی مگر صبح تک خوب تیز بخار ہو گیا۔ اوشا نے ڈاکٹر کو بلایا تو اُس نے ملیریا تجویز کیا اور پرہیز کی خاص ہدایت کی۔ تیسرے پہر کو بخار کا نہایت شدید غلبہ ہو گیا۔ اوشا اُس کے کمرہ میں پہونچی تو دیکھا کہ اُسے بالکل ہوش نہیں۔ وہ گھبرا سی گئی۔ نوکر سے لحاف منگا کر رمیش کو اُڑھایا اور مسہری کے قریب کرسی پر خود بیٹھ گئی۔ ایک آدھ مرتبہ رمیش کو آواز دی تو رمیش نے آنکھیں کھولیں مگر جلد ہی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اوشا نے ڈرتے ڈرتے اسکی نبض پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ جل رہا تھا۔ اوشا نے ایسا محسوس کیا جیسے بھڑکتا ہوا شعلہ اس کی انگلیوں سے گزر کر تمام جسم میں دوڑ گیا ہو

اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھانا چاہا تو اُسے ایسی کوشش کرنا پڑی جیسے کسی آہنی شے کو مقناطیس سے جدا کرنے میں۔ اس کے تن بدن میں ایک برقی لہر سی دوڑ گئی۔ اُس کی آنکھیں عجیب و غریب چمک کے ساتھ دیشی کے تمتماتے ہوئے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے کان اپنے دل کی دھڑکن پر لگے ہوئے تھے۔ اُس کے مرتعش ہونٹ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست ہو گئے تھے اور اُس کا چہرہ ایسا سُرخ ہو رہا تھا جیسے تیز ہوا میں دبی ہوئی آگ کرید دی گئی ہو۔ نامعلوم اور غیر واضح خیالات عنقریب ہی پھٹ والے آتش فشاں پہاڑ کے سوراخوں سے نکلنے والے دھوئیں کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھا رہے تھے اور اُسے یہ خیال ہو چلا تھا کہ اُس کا جسم دیشی سے زیادہ جل رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دیشی کے بکھرے سنہرے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور غیر ارادی طور پر اُس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور سارے جسم کا خون کھٹ سے اُس کے سر میں لگا جیسے بڑی سی لہر ساحل سے ٹکرا جائے۔ ایکدم سے اُسے ریوتی کا کہنا یاد آیا۔

"دوشا بڑا مست مانیو، تو اکا ڈسٹیٹ صاحب کے لائق نہیں۔ اگر میں تیری جگہ ہوتی تو کبھی بڈھے شوہر کے ساتھ نہ رہتی" اُس کی خشک زبان تالو سے لگ گئی اور اُس نے کوشش کر کے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"اوشا۔ اس جیون کے بعد عورت کا سب سے بڑا فرض پتی کی خدمت ہے۔ پرماتما کا دیا تیرے پاس سب کچھ ہے۔ دیکھ ریوتی کی بات پر خور مت کیجو" ستونما نے اس کے کان میں چلا کر کہا۔

"وہ گرا۔ وہ گرا۔ سنبھال۔ سنبھال۔ گر گیا۔ ٹوٹ گیا۔ بچ گیا۔ بچ گیا۔ سنبھال لیا" اور جیسے اوشا نے ایک بڑے بُت کو جس کی اُس نے مدتوں پوجا کی تھی گرتے گرتے سنبھال لیا۔

اُس کے دل میں ایک اُبلتا ہوا چشمہ پھوٹ پڑا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اُس کے سامنے کسی نے سفید چادر ڈال دی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر گر پڑے اور وہ کرہ سے کچھ اس طرح لرزتی ہوئی نکلی جیسے اُسے کوئی بڑا بھاری پاپ کیا ہو۔

سید مسعود زاہدی

شہوانیات کیا ہے؟

مجلد ہے۔ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:۔ فحاشی کی تعریف اور اسکی ابتدا۔ شادی، طلاق و خلع۔ مذہبی فحاشیاں۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔ استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالنفس۔ استلذاذ بالوحوش۔ فحاشی عہد قدیم میں۔ فحاشی قرون وسطیٰ میں۔ عہد جدید اور فحاشی۔ اخلاق جنسی۔ جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتم جامع تاریخی علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا۔ حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و تجسس کا نتیجہ ہے اور اردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے۔ حجم ۲۷۰ صفحات۔ کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول چار روپیہ۔

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام:۔ "مشکی قوام ہوڑہ"

ٹیلی فون:۔ "ہوڑہ ۵۵۴"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ